رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

HINDUSTANI ACADEMY
........ Section
Library No. ............
Date of Receipt ...... 8-1-30

جنوری ۱۹۳۰ء

مخصوص بہ بہادر شاہ ظفر

# نگار

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ علاوہ محصول

# قواعد رسالہ "نگار"

۱- رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے۔
۲- رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳- خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے۔ جسپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کر دئے جاتے ہیں۔
۴- جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
۵- مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں۔
۶- سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہندسات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

## نرخنامہ اجرت اشتہارات

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے اُن کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

| تعداد صفحہ | ایک صفحہ | نصف صفحہ | پاؤ صفحہ |
|---|---|---|---|
| بارہ مرتبہ | ۱۰۰ روپیہ | ۶۰ روپیہ | ۴۰ روپیہ |
| چھ مرتبہ | ۶۰ روپیہ | ۳۵ روپیہ | ۲۵ روپیہ |

| تعداد صفحہ | ایک صفحہ | نصف صفحہ | پاؤ صفحہ |
|---|---|---|---|
| تین مرتبہ | ۳۵ روپیہ | ۲۴ روپیہ | ۱۴ روپیہ |
| ایک صفحہ | ۱۲ روپیہ | ۹ روپیہ | ۶ روپیہ |


چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے

# نگار بک ایجنسی لکھنؤ

جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

### مولانا نذیر احمد

- نبات النعش ۹ر
- مراۃ العروس ۱۰ر
- توبۃ النصوح ۱۲ر
- موعظۂ حسنہ ؏
- رویائے صادقہ ؏
- ایامیٰ ؏
- فسانۂ مبتلا ؏
- ابن الوقت ؏
- مصائب غدر ۱۲ر

### مولانا شبلی

- سیرۃ النبی جلد اول ؏
- " دوم ؏
- " سوم ؏
- الفاروق عار
- سیرۃ النعمان ؏
- الغزالی ؏
- المامون ؏
- سوانح مولانا روم عار
- سفرنامہ مصر و شام عار
- علم الکلام عار
- الکلام عار
- رسائل شبلی ؏
- مقالات شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول ے
- " دوم ؏
- " سوم ؏
- " چہارم ے
- " پنجم عار
- موازنۂ انیس و دبیر ے
- مضامین عالمگیر ۸ر
- آغاز اسلام ۸ر
- کلیات فارسی عار
- کلام شبلی اردو ۸ر

### امیر مینائی

- صنم خانۂ عشق عار
- مراۃ الغیب ؏
- محامد خاتم النبیین ۸ر
- ضیائے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی عار

### رتن ناتھ سرشار

- سیر کہسار ؏
- خدائی فوجدار ؏
- جام سرشار عار
- الف لیلہ بطرز ناول صہ
- کامنی ؏
- سوانح عمرو عیار ؏

### منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس ۱۲ر

### جوالا پرشاد برق

- مرزا لٹی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۱۲ر

# حضرات!

یہ چند سطریں میں اسوقت لکھ رہا ہوں، جبکہ نگار کا اکثر حصہ چھپ چکا ہے، لیکن مکمل نہیں ہوا، چونکہ اس دوران میں زیادہ حصہ میرے وقت کا لکھنؤ سے باہر صرف ہوا، اس لئے کاپیوں کی صحت، طباعت کی نگرانی وغیرہ سب منیجر کے سپرد تھی اور مجھے اس وقت تک بالکل خبر نہیں کہ کہاں کہاں کیا غلطیاں رہ گئی ہیں۔ خدا کرے میرا یہ اندیشہ برداشت کی حدود سے آگے نہ بڑھے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ ظفر کی شاعری یا اس عہد کی شاعرانہ فضا پر کوئی قابل ذکر تنقید موصول نہیں ہوئی۔ اس لئے مجبوراً مجھے ایک مضمون ظفر کی شاعری پر لکھنا پڑا جو ہر چند سرسری، مختصر اور ناکافی ہے، لیکن تنقید کی حقیقی روح سے بیگانہ نہیں، اور بسیط ترین تنقید بھی ان خطوط سے علیحدہ نہیں ہو سکتی، جن کو میں نے متعین کر دیا ہے۔

جناب طاہرہ خاتون صاحبہ نے جو صوبۂ متوسط کی ایک نہایت معزز و بلند تعلیم یافتہ خاندان کی فرد ہیں، دو مضمون تحریر فرمائے، اور دونوں درج کر دیئے گئے، اس میں شک نہیں کہ دونوں مضمونوں میں تحریر و تنقید، استدلال و استنتاج تطویل و انحراف کے چند در چند نقایص موجود ہیں، لیکن ایک خاتون ہونے کی حیثیت سے میں ان کی اس سعی کو بھی نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور خوش ہوں کہ دور حاضر کی دوسری تعلیم یافتہ خاتونوں کی طرح وہ عشقیہ فسانہ نگاری و غزلسرائی کی طرف مایل نہیں ہیں۔

سیاسیات عہد ظفر پر ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالمالک آروی نے جس انداز سے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ انکے پر جوش قلب کا آئینہ ہے۔

ان کے علاوہ دو مضمون اور ہیں، جن کو اس اشاعت کی جان کہنا چاہئے۔ دہلی کے دو انشا پرداز جو اتفاق سے ایک ہی رنگ کے لکھنے والے ہیں، ایک ہی شگفتہ موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اور اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ میرے نزدیک اگر ظفر نمبر میں صرف یہی دو مضمون ہوتے تو بھی میں اس کو نگار کی بڑی کامیابی سمجھتا۔ اب رہا سوال تقسیم انعام کا، سو میرا مقصود یہ تھا کہ ظفر کی شاعری پر اگر کوئی بہتر مضمون ہوتا تو اس کا انتخاب کیا جاتا، لیکن چونکہ ایسا مضمون کوئی نہیں آیا، اس لئے ظاہر ہے کہ موجودہ مضامین ہی میں سے کسی کا انتخاب کرنا پڑے گا، اور اس کے لئے مناسب سمجھتا ہوں کہ خود فیصلہ کرنے کے بجائے ناظرین نگار کو حکم بناؤں۔ امید ہے کہ ۲۰ر جنوری تک ارباب ذوق اپنی اپنی رائیں اس باب میں میرے پاس بھیجدیں گے، تاکہ ۲۵ر جنوری تک انعام بھیجدیا جائے۔

دربارسعد

۴ر جنوری سنہ ۱۹۳۰ء

نیاز

بسم اللہ

# نگار

## فہرست مضامین ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء

| | | |
|---|---|---|
| ظفر کی شاعری | نیاز | ۲ |
| بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر | مرزا فرحت اللہ بیگ بی اے | ۱۷ |
| دہلی کا آخری دیدار | سید وزیر حسین دہلوی | ۴۲ |
| آہ ظفر! (نظم) | نظیر لودھیانوی | ۷۱ |
| عہد ظفر میں دہلی کی شاعری | طاہرہ خاتون | ۷۲ |
| عہد ظفر کے تاریخی و سیاسی حالات | عبد المالک آروی | ۱۰۷ |
| دربار ظفر اور عہد ظفر کے شعراء | طاہرہ خاتون | ۱۲۲ سے ۱۵۲ |

بسم اللہ

# نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

| شمار - ۱ | جنوری ۱۹۳۰ء | جلد - ۱۷ |
| --- | --- | --- |

## ظفر کی شاعری

کوئی غزل پر اپنی جو نازان آگے تیری غزل کے ہو
شعر سنادے اس کو ظفر اک اس مین کا اک اُس مین کا

---

میری رائے مین یہ بہترین سرسری تنقید ہے جو ظفر نے خود اپنی شاعری کے متعلق کی ہے اس مین کلام نہین کہ ظفر کے جستہ جستہ اشعار اگر کسی کے ناز کو خجل نہین کر سکتے تو کم از کم سننے سنانے کے قابل ضرور ہین اور اگر "کوئی شعر اس مین کا" اور "کوئی اس مین کا" لیکر گلدستہ مرتب کیا جائے تو یقیناً اہل ذوق کی میز کا زینت بن سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ظفر کے چار ضخیم دیوانون کا غایر مطالعہ کر کے اس خدمت کو کون انجام دے؟ میرا ارادہ تھا کہ ظفر کے کلام کا انتخاب مین خود کرون اور اس ماہ کے نگار مین اسے بھی شامل کر دون، لیکن اول تو دیگر ضروری مشاغل نے فرصت نہین دی اور دوسرے یہ بھی خیال ہوا کہ ممکن ہے بعض حضرات اس کو پسند نہ کرین (مومن کی اور بات تھی) تاہم "لایترک کلہ" کی حیثیت سے رواروی اور ماہ دسمبر کی انتہائی مصروفیت کے زمانہ مین جو مجھ سے ممکن ہوا اسے پیش کرتا ہون۔

شاعر بُرا ہو یا بھلا، پیدا ہوتا ہے اور اس لئے سب سے پہلے مین کسی شاعر کے کلام پر گفتگو کرنے سے قبل یہ دیکھتا ہون کہ

وہ فطرت کی طرف سے شاعر بنا کر بھیجا گیا ہے یا وہ اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے مین فطرت سے جنگ کرتا ہے - اس کا فیصلہ کرنے کے بعد مین یہ دیکھتا ہون کہ قدرت نے اس کے دماغ کو کس نوع کی شاعری کے لئے وضع کیا تھا اور ماحول نے کس حد تک اس کی فطری افتاد کی موافقت یا مخالفت کی اور آخر کار نتیجہ کے لحاظ سے وہ کامیاب ہوا یا ناکام - آسکر وائلڈ کا ایک تنقیدی لطیفہ ہے کہ "کسی تصنیف یا کتاب کے متعلق یہ بحث کرنا کہ وہ اخلاق کا درس دیتی ہے یا بد اخلاقی کا بالکل لایعنی سی بات ہے - اس کے متعلق صرف یہ بحث ہو سکتی ہے کہ وہ تصنیف ایک تصنیف کی حیثیت سے اچھی ہے یا بُری" - آسکر وائلڈ کی یہ رائے جملہ اصناف تصنیف و تالیف پر حاوی ہو یا نہ ہو، لیکن شاعری کے باب مین یقیناً قابل عمل ہے اور مین کبھی شاعری کے اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے سے بحث نہین کرتا بلکہ صرف یہ دیکھتا ہون کہ بُری یا بھلی جو ودیعت فطری ایک شاعر کو عطا ہوئی ہے اسکا استعمال اسنے درست کیا یا نہین؟

فرض کیجئے ایک شخص حد درجہ فاحش و عریان شاعری کا ذوق لیکر آیا ہے، تو مین صرف فن کے لحاظ سے یہ دیکھونگا کہ اسنے اسمین کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے، اور سنجیدگی کے تحت مین آکر اسنے اپنے ذوق کے منافی کوئی حرکت تو نہین کی - اسکے برعکس اسکی ایک مخالف مثال کو لیکر سمجھ لیجئے - لیکن اس کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ جب مراتب شاعری سے بحث کیجائیگی، اور منازل شعر پر گفتگو ہوگی تو اسوقت یہ بھی کہنا پڑیگا کہ فلان کا ذوق پست ہے اور فلان کا بلند - اور تنقید کی یہی ناگوار صورت پیش آجاتی ہے جب دہلی اور لکھنؤ کی شاعری سے کوئی شخص بحث کرتا ہے - ورنہ یون لکھنؤ کی شاعری، جب تک مدارج کا سوال نہ پیدا ہو، اپنی جگہ یقیناً مکمل چیز ہے

جس وقت ان اصول کو پیش نظر رکھ کر ظفر کی شاعری کو دیکھا جائیگا تو معلوم ہوگا کہ ایسے شخص کے فطری شاعر ہونے مین کس کو کلام ہو سکتا ہے، جو چار ضخیم دیوان اپنے بعد چھوڑ جائے اسی کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ انتخاب سے اسکے یہان اچھے شعر ملجاتے ہین لیکن انکی تعداد اسقدر کم ہے کہ اگر مین بھی اتنا ہی کلام چھوڑ جاؤن تو شاید میرے یہان بھی اتنے ہی اچھے شعر ڈھونڈھنے سے ملسکین

ظفر جس خاندان کی یادگار تھا اسکے افراد میں علم پروری، نکتہ رسی، بالغ نظری، قدر علم و فضل میراث کی حیثیت سے منتقل ہوتی چلی آرہی تھی اور ہرچند تیموری خاندان مین کوئی زبردست شاعر یا ادیب پیدا نہین ہوا - لیکن اسکی ادب نوازی اور شاعر آفرینی کے واقعات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہین - اس لئے اگر ظفر شاعر تھا تو حیرت کی بات نہین کیونکہ وہ اُس خاندان کا فرد تھا جو اپنے ذوق ادب کے لئے مشہور ہے اور اگر اسنے اتنا کلام چھوڑا تو بھی تعجب نہ کرنا چاہئے کیونکہ آغاز جوانی سے لیکر کہولت تک جو تقریباً تین رُبع صدی کا زمانہ ہوتا ہے اسکو سوائے اس "فکر فضول" کے اور کام ہی کیا تھا

یون تو سلطنت مغلیہ کا مفہوم محمد شاہ کے وقت ہی مین ختم ہو گیا تھا، لیکن اسکا ایک انعکاسی اثر جو کچھ قائم تھا وہ بھی اکبر شاہ ثانی (ظفر کے والد) کے زمانہ مین جاتا رہا اور جب بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوا تو اس کی حیثیت ایک شطرنج کے بادشاہ کی بھی نہین تھی بلکہ وہ صرف ایک وظیفہ یاب رئیس کی حیثیت رکھتا تھا جس کے حدود حکمرانی کے لئے قلعہ کے تنگ فضا بھی ضرورت

سے زیادہ وسیع سمجھی جاتی تھی۔

ولیعہدی کا زمانہ بھی ظفر کا خلش دیے چینی مین بسر ہوا کیونکہ اکبر شاہ ممتاز محل کے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولیعہد بنانا چاہتے تھے اور ان سے ناخوش رہتے تھے۔ ہر چند بعد کو حکومت برطانیہ نے قطعی فیصلہ بہادر شاہ ظفر کے حق مین کر دیا تھا، لیکن باپ کے جیتے جی ان کو کوئی آرام و سکون نصیب نہ ہوا اور جب پورے ۶۲ سال عمر کے اس کلفت مین بسر ہو گئے جب کہین جاکر ۱۸۳۷ء مین اکبر شاہ کا انتقال ہوا اور ظفر کو تخت نشینی کا موقعہ ملا۔ ہر چند اسکے بعد ظفر ۲۵ سال اور زندہ رہے لیکن وہ زندگی اس طرح کی تھی کہ دو سال تو غدر کے مصائب مین بسر ہوئے اور پانچ سال رنگون کے بلاخانہ مین۔ باقی اٹھارہ سال کا زمانہ جس مین ظفر نے سلطنت کی، وہ بھی اس انداز سے کہ جی کھول کر گناہ کرنا کیسا طاعت و بندگی کے بھی اسباب فراہم نہ ہو سکے۔ تیموری خاندان کا خون جو جذبہ داد و دہش کے پیدا کرنے مین تاریخی اہمیت حاصل کر چکا تھا، رگون مین دوڑ رہا تھا لیکن اس کی حالت اُس فوارہ کی سی تھی جس کا خزانہ خشک اور قوت جست و خیز مفقود ہو چکی ہو، ظفر چاہتا تھا اور یقیناً بیتابانہ طور پر چاہتا تھا کہ وہ اپنے دربار کو شعراء و اہل علم و کمال سے بھرے اور ہر اُس چیز کو فراہم کرے جو مٹی ہوئی تیموری عظمت و جلال کی یاد کو زندہ کرنے والی ہو، لیکن اسکی بیکسی و بیچارگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے استاد (ذوق) کو ایام ولیعہدی مین چار روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ دے سکا اور تخت نشین ہونے کے بعد پچیس روپیہ (یا بقول صاحب "تذکرۂ گل رعنا") زیادہ سے زیادہ سو روپیہ ماہوار سے زیادہ ہمت نہ کر سکا

الغرض ظفر کی ساری زندگی سخت "حوصلہ فرسا" ماحول مین بسر ہوئی اور جتنی تمنائین اسکے دل مین پیدا ہوئین ان مین سے ایک بھی تکمیل کو نہ پہونچ سکی، اسلئے وہ جس رنگ کی شاعری کے لئے پیدا ہوا تھا اگر اس کی بھی تکمیل نہ ہو سکی ہو تو جائے تعجب نہین

یہ ہم ظاہر کر چکے ہین کہ ظفر فطری شاعر پیدا ہوا تھا لیکن اس کا فطری رنگ کیا تھا؟۔ اس باب مین مجھے اکثر تذکرہ نویسون سے اختلاف ہے۔ عام طور پر ظفر کی شاعری کو سوز و گداز کی شاعری سمجھا جاتا ہے لیکن مین اس کو یکسر اس صفت سے خالی پاتا ہون

میرے نزدیک ظفر پیدا ہوا تھا صرف جرأت کے رنگ کی مادی شاعری کرنے کے لئے اور اگر زمانہ مخالفت نہ کرتا تو وہ اس رنگ کا بہتین شاعر ہوتا، لیکن عسرت و افلاس کی مصیبت، زوال و ادبار کی نحوست، تاثرات غم و الم کی کلفت نے اس کو اسقدر مکدر بنا دیا تھا کہ اس کی زندگی کا لاعبانہ پہلو، جسپر اسکی شاعری کی بنیاد قائم ہوئی تھی، شگفتہ ہونے سے قبل ہی مضمحل ہو گیا اور اسکے کلام مین وہ رنگ پیدا ہو گیا جسے ہم سوز و گداز کے بجائے صرف افسردگی و سوگواری کہہ سکتے ہین۔ چنانچہ وہ خود ایک جگہ لکھتا ہے،

شعر افسردہ ظفر کے مت سناؤ بزم مین
عشق کے مارے ہوئے جتنے ہین افسردہ سے ہین

میرے نزدیک سوز و گداز، افسردگی سے بالکل علیحدہ چیز ہے۔ سوز و گداز کا تعلق تاثرات روحانی کی اُس بلند دنیا سے ہے

جسے مادیات سے کوئی واسطہ نہین ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو صرف اسقدر کہ اس کو ذریعۂ اظہار تاثر سمجھا جائے۔ سوز و گداز اور فسردگی دونون کے ارتقا کا لازمی نتیجہ سکون ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اُس مین سکون استغنا ہوتا ہے اور اِس مین سکون یاس، اُس مین روح و روحانیت کو ترقی ہوتی ہے اور یہ دماغ و اعضا مین تعطل پیدا کر دیتی ہے

اس مین شک نہین کہ ظفر جمالیاتی نقطۂ نظر سے کچھ نہ کچھ ذوق ضرور رکھتا تھا اور اس لئے فنون لطیفہ مین سے شاعری کے علاوہ موسیقی اور خطاطی سے بھی اُسے لگاؤ تھا، لیکن چونکہ اس کا یہ ذوق بلند قسم کا نہ تھا اس لئے نہ وہ موسیقی و خطاطی مین کوئی قابل ذکر یادگار چھوڑ گیا اور نہ شاعری مین لیکن کہ اگر حالات مساعد ہوتے تو ممکن تھا کہ اس کا فطری ذوق جیسا کچھ بھی تھا، پوری وسعت کے ساتھ ظاہر ہوتا اور تکمیل کی ایک صورت پیدا ہو جاتی

ظفر کی شاعری مین تھوڑا سا جو تشائم ( Pessimism ) رنگ پایا جاتا ہے اس کا سبب یہ نہ تھا کہ اسکی فطرت ایسی ہی تھی بلکہ وہ اثر تھا صرف اسباب و حالات کا، اسوقت کی فضا و ماحول کا۔ اگر یہ عارضی اسباب پیدا نہ ہو جاتے تو اس کے دیوان مین جو کہین کہین افسردہ و سوگوار قسم کے شعر مرثیہ کا رنگ لئے ہوئے نظر آجاتے ہین، بالکل مفقود ہوتے۔ پھر چونکہ سوز و گداز کا تعلق تشائم جذبات سے نہین بلکہ اُس عقلی و ذہنی ارتفاع ( Intellectual Sublimity ) سے ہے جسکی بنیاد بالکل جمالیات اخلاقی ( Ethical Aesthetics ) پر قائم ہے، اسلئے وہ صرف ایک غموض روحانی ( Spiritual profundity ) ہے اور جسکی تصوری منزل ( Utopia ) اسوقت تک حاصل نہین ہو سکتی جب تک انسان بیکوقت زبردست فلاسفر، بے مثال آرٹسٹ، اور روحانی قسم کا لطیف اخلاق نہ رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات ظفر مین موجود نہ تھے اور اس لئے ان کے یہان سوز و گداز کا پتہ نہین۔ اسکی مثالین درد کے یہان زیادہ اور میر کے یہان کم ملتی ہین

ظفر اسی مادی دنیا اور مادی جذبات کا شاعر تھا اس لئے ہمکو انھین حدود مین رہکر اس کی شاعری پر تبصرہ کرنا چاہئے اور اسطرح اس کی شاعری کی حقیقی قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے

ظفر کے عہد کا دور تاریخ شاعری کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اس دور کی ابتدا شاہ نصیر سے ہوتی ہے جنکو مین صرف ضلع جگت کا شاعر کہتا ہون۔ کیونکہ سوائے رعایات لفظی استعمال محاورات اور سنگلاخ زمینون مین چند شعر نکال لینے کے انھون نے کچھ نہین کیا۔ ممکن ہے کہ جب یہ لکھنؤ آئے ہون اور ناسخ کے رنگ کا زور دیکھا ہو، تو ان کے اُس فطری ذوق مین جو بیک وقت جرأت انشا اور ناسخ کی شاعری کا حامل تھا، زیادہ تحریک ہوئی ہو، لیکن یہ کہنا کہ ان کی شاعری ناسخ اور جرأت کا تتبع تھا، صحیح نہین۔ انکا جو رنگ تھا فطری تھا اور چونکہ تھے سرزمین دہلی کے شاعر اسلئے باوجود تصنع، آورد، اور تکلف کے کہین کہین واردات قلبی بھی کہجاتے تھے لیکن اسقدر کمی کے ساتھ کہ اگر ظفر کا مقابلہ اس باب مین شاہ نصیر سے کیا جائے تو ظفر کو بہتر شاعر ماننا پڑے گا

اس مین کلام نہین کہ زبان کی صفائی، ترکیبون کی حلاوت فارسی الفاظ کی دلکش آمیزش، بندش کی روانی، قدیم الفاظ سے احتراز، اس عہد کی خصوصیت رہی ہے اور شاہ نصیر نے بھی کافی حصہ اس اصلاح و تہذیب مین لیا ہے، لیکن

جہانتک حقیقی شاعری کا تعلق ہے سب سے پہلے مومن، غالب اور ذوق ہی پر نگاہ پڑیگی اور اس کے بعد ممنون، تسکین اور شیفتہ پر ظفر بھی اسی دور کا شاعر ہے، اور ہر چند اس کی شاعرانہ ہستی ایسی نہ تھی کہ اس کو اس دور کے برکات مین شمار کیا جائے۔ لیکن اُسے نظرانداز بھی نہین کیا جاسکتا، کیونکہ اگر ایک طرف سنگلاخ زمینون سے شعر نکالنے محاورات کے استعمال کرنے اور رعایات لفظی کا لحاظ رکھنے مین وہ شاہ نصیر سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہین تو دوسری طرف ان کے کلام کی کثرت مجموعی حیثیت سے اس عہد کے تمام شعراء سے ممتاز کردیتی ہے

ظفر اول اول شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے، لیکن جب وہ دکن چلے گئے اور ذوق کا درخور دربار مین ہوا تو باوجود ان کے کم عمر ہونے کے ظفر نے انھین کو اپنی استادی کے لئے انتخاب کیا۔ مومن دربار شاہی تک جانا اپنی توہین جانتا تھا، غالب اس تمنا مین تڑپتے رہے لیکن انھین اس کا موقعہ نہ ملا۔ ملا بھی تو اُس وقت جب شاید ظفر کے تمام دیوان مرتب ہو چکے تھے اور شاعری بھی ترک کی ہو گی۔ لیکن اگر مومن و غالب کی صحبت ظفر کو نصیب ہوتی، تو بھی مجھے اس مین کلام ہے کہ وہ پورا فائدہ ان لوگون سے اُٹھا سکتے کیونکہ اول تو انکا رنگ طبیعت بہت مختلف تھا اور دوسرے یہ کہ شاہ نصیر کی شاعری کا رنگ بربنائے ہم مذاق ہوتے کے ان مین استعداد پیدا کر چکا تھا کہ اگر وہ شاہ نصیر کے بعد کسی کا انتخاب کر سکتے تھے تو وہ ذوق ہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ان کے یہان بھی مضمون آفرینی جدت تخئیل، ندرت بیان مفقود تھی اور عام فہم ہونا اور محاورہ کا خوبی کے ساتھ نظم ہو جانا ان کی شاعری کا بھی ماحصل تھا جو ظفر کو محبوب ہونا چاہئے تھا۔ علاوہ اس کے چونکہ ذوق خود شاہ نصیر کے شاگرد تھے اس لئے یون بھی استاد بھائی ہونے کی حیثیت سے ظفر کو ذوق ہی کا انتخاب کرنا تھا۔ ذوق مین ایک چیز اور تھی جسے جوش و خروش کہتے ہین اور جس کا پورا اظہار انکے قصائد مین ہوتا ہے، ظفر کے کلام مین اس چیز کا پتہ نہین اور نہ یہ انکا فطری رنگ تھا اور اسی کو دیکھ کر آزاد کا یہ الزام کہ "ظفر کا اکثر کلام ذوق کی فکر کا نتیجہ ہے" بالکل اُٹھ جاتا ہے

یہانتک جو عمومی تبصرہ مین نے ظفر کے کلام پر کیا ہے اس کو ملخصاً یون ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ

(۱)۔ ظفر کی شاعری عام فہم، سلیس، محاورہ و زبان کی شاعری تھی

(۲)۔ ظفر کے کلام مین سوز و گداز نہین بلکہ حالات و واقعات کے لحاظ سے افسردگی و سوگواری ضرور پائی جاتی ہے

(۳)۔ ان کے کلام مین جرأت کی سی عریانی، یا ادنیٰ قسم کے معاملات عشق و محاکات محبت بہت نظر آتے ہین اور زیادہ دلکش طور پر

(۴)۔ سنگلاخ اور مشکل زمینین نکالنے مین وہ شاہ نصیر سے زیادہ کامیاب و قابل تعریف تھے

(۵)۔ رعایات لفظی کی وجہ سے جو آورد و صنعت شعر مین پیدا ہو جاتی ہے وہ بھی ان کے یہان کم نہین ہے

(۶)۔ فارسی ترکیبین کبھی استعمال نہ کرتے تھے اور نہ اس زبان کی حلاوت سے وہ آشنا تھے

(۷)۔ لیکن باوجود اس کے اگر ان کے مجموعۂ کلام کا استقصا کیا جائے تو ایسے شعر بھی نکلین گے جو واردات محبت کے بیان کے

نیاز سا قابل ... لفظ استعمال کرے!

لحاظ سے بہت دلکش ہین

اب مین ذرا تفصیل کے ساتھ ان خصوصیات پر روشنی ڈالتا ہون لیکن اس کو مین تکمیل نہین کہہ سکتا کیونکہ مجھے ظفر کے تمام دیوانون کے بالاستیعاب مطالعہ کا موقعہ نہین ملا

سب سے اخیر مین مینے واردات محبت کے بیان کا ذکر کیا ہے اور اس مین کلام نہین کہ ظفر کی کوئی غزل ایسی نہین ہے جسمین اس قسم کے ایک دو شعر نہ نظر آتے ہون، یہانتک کہ نہایت ہی مشکل زمینون اور سنگلاخ ردیف و قوافی کے ساتھ بھی وہ اس مین کامیاب ہو جاتے ہین

ظفر کی کوئی غزل پوری ایک رنگ کی نہین ہوتی بلکہ اسمین مختلف قسم کے اشعار پائے جاتے ہین۔ مثلاً ایک غزل کے دو شعر یہ ہین

کسی نے اسکو سمجھایا تو ہوتا — کوئی یان تک اسے لایا تو ہوتا
جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر — وہانتک مجھکو پہونچایا تو ہوتا

انداز بیان کی سادگی، اور جذبات کے لحاظ سے صحیح معنی مین غزل کے شعر کہلائے جاسکتے ہین لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے ہین کہ:-

نہ بھیجا تو نے لکھ کر ایک پرچہ — ہمارے دل کو پرچایا تو ہوتا
نہ بولا ہم نے کھڑکا یا بہت دیر — ذرا دربان کو کھڑکایا تو ہوتا

اس سے زیادہ کھلی ہوئی مثال لایعنی رعایت لفظی کی اور کیا ہو سکتی ہے

دوسری غزل کے یہ دو شعر کسقدر پاکیزہ ہین:-

مین اس کو دیکھ کے یہ محو ہون کہ حیران ہون — جو کچھ وہ پوچھیگا مجھ سے جواب کیا دونگا
نہ پوچھ مجھ سے ظفر میری تو حقیقت حال — اگر کہونگا ابھی تجھ کو مین رُلا دونگا

لیکن اس غزل مین اس رنگ کے شعر بھی موجود ہین:-

اگر تو آویگا تو جائے فرش پا انداز — مین اپنی آنکھین ترے زیر پا بچھا دونگا
کہے ہے مجھ سے وہ قاتل کہ میرے کوچہ مین — رکھا جو تو نے قدم سر ترا اڑا دونگا

ایک مشکل زمین مین کتنا اچھا شعر نکالا ہے:-

نہ پہونچا تو نہ پہونچا طالب دیدار تک بتے — ترے تکتے ہی تکتے راہ وقت واپسین پہونچا

لیکن اس غزل کے یہ شعر ملاحظہ ہون:-

زمین لرزی تڑپنے سے ترے بسمل کے یہ قاتل — کہ آخر اس کا اک صدمہ سر گاؤ زمین پہونچا
مجھے ڈر ہے نہ پہونچے پہونچون کے بوجھ سے صدمہ — کہ نازک ہے نہایت ہی ترا اے نازنین پہونچا

یہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہین کہ مشکل زمینون کے پیدا کرنے مین ظفر کو خاص ملکہ حاصل تھا اور اس باب مین انھین اسقدر شغف تھا کہ اگر چارون دیوانون سے اس قسم کی غزلون کو علیحدہ کر دیا جائے، تو شاید ہی پورا ایک دیوان معمولی اور آسان ردیف و قافیہ کا باقی رہجائے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ "اس کوہ کنی" کے بعد صرف "کاہ برآری" نہین ہوتی بلکہ اسقدر خوبی کے ساتھ وہ ردیف قافیہ کو نباہتے ہین کہ حیرت ہوجاتی ہے۔ ہر چند صنعت و آورد کا بیشتر حصہ ظفر کے کلام مین اسی میلان طبع سے پیدا ہوا، کیونکہ جب نہایت ہی اٹل، بے جوڑ ردیف و قوافی ہونگے تو مضامین مین شگفتگی و بیساختگی کا پیدا ہونا معلوم مثلاً انھون نے ایک غزل مین ردیف گلابی ہو گیا قرار دی ہے اور قافیہ اکثر، بستر وغیرہ، فرض کیجئے کہ ایک شخص محشر گلابی ہو گیا لکھنا چاہتا ہے تو وہ کیا کریگا۔ ظفر کا شعر ملاحظہ فرمایئے کہ یہی ایک صورت محشر کے گلابی ہونے کی ہوسکتی تھی۔ فرماتے ہین:۔

تیرے دامن سے جو ٹپکا خون شہید ناز کا — خوب گہرا دامن محشر گلابی ہو گیا

کہین کہین قافیہ جو آسان مل گیا ہے تو اس زمین مین بھی انھون نے ایک رنگ پیدا کر دیا۔ یہ دو شعر اسی زمین کے ملاحظہ کیجئے:۔

ہو چکی گرمی گلابی بادۂ گلگون سے بھر — ابتو جاڑا اے پری پیکر گلابی ہو گیا
منہ پہ تانا وقت خواب اُسنے دوپٹہ تو سفید — عکس روئے لالہ گون سے پر گلابی ہو گیا

ذیل مین بعض اشعار ان کے مشکل زمینون سے درج کرتے ہین جن سے یہ دونون پہلو نمایان ہونگے:۔

خدا نے جبکہ جمال بتان بنایا تھا — مژہ کو تیر بھوؤن کو کمان بنایا تھا
رہا نہ آکے وہ ایوان چشم مین میری — مژہ سے مین نے عبث سائبان بنایا تھا
م ہنسے ہے دیکھ کے محفل مین وہ بت بیدرد — الٰہی کیون مجھے گریہ کنان بنایا تھا

---

دندان کی تاب دیکھ کے انجم ہوئے خجل — وہ مہ جبین جو شب کو لب بام ہنس پڑا
م کیا بات یاد آگئی اس کو کہ اے ظفر — وہ یک بیک جو سن کے مرا نام ہنس پڑا

---

وصل ظاہر تو نہ ہوتا تھا نہین اسکا نصیب — خواب مین وہ چھپ کے آیا یون نہ تھا تو یون ہوا
م دیکھے اس بیدرد کو دل ہون ظفر مین دردمند — واہ دُکھ بیٹھے بٹھائے یون نہ تھا تو یون ہوا

---

تو نے کیون ڈورے سے پٹی باندھی لے صیاد واہ — باندھی بلبل کی تھی تار رگ گل سے کمر
کیون نہ اس مین سے روان دریائے اشک ضعف ہو — جبکہ ہو ہم شکل محراب در پل سے کمر
م روز و شب جو ان مہر و مہ پھرتے ہین بہر قرص نان — اہل دنیا کھول بیٹھے کب تحمل سے کمر

---

کبھی تو آؤ ہمارے گھر مین سنو ہماری بھی چار باتین  عجب ہے شکوہ رقیب کا یہان ہزار منہ مین ہزار باتین
چڑھا ہے کوٹھے یہ کون اپنے کہ دیکھنے کو اب آہ جس کے  بگولا بنکر یہان فلک سے کرے ہے اپنا غبار باتین
ص گئے ظفر کل جو اُسکے گھر ہم کھلا یہ شکوہ کا آگے دفتر  گزر گئی شب تمام تس پر نہو چکین زینہار باتین

---

ایک تو مہندی کی ہے تحریر دونون پانو مین  دوسرے ہے کفش بھی تصویر دونون پانو مین
ص وحشت گردی خاک کیجے بعد مجنون اے ظفر  مارے ہے خار بیابان تیر دونون پانو مین

---

لب کو مین تیرے مئے ناب کہے تو کہدون  چشم کو ساغر زہراب کہے تو کہدون
چشم پُر آب مین ہے میرے کہان لخت جگر  یعنی تالاب مین سُرخاب کہے تو کہدون
ص لیکے نام اُس کا بہت آہین بھرا کرتا ہون  کیون ابھی اے دل بیتاب کہے تو کہدون
ص یون تو افسانہ مرا وہ نہین سنتا اے دل  اُس سے یہ قصۂ دمِ خواب کہے تو کہدون

---

خون مرا کیون اُس بت کافر کے گیسو پی گئے  کچھ یہ گنگا جل نہ تھا جو اس کو ہندو پی گئے
ص ایک ُ وساغر سے کیا ہوتا ہے ہمتو خم کے خم  بیٹھکر ساقی کے سب زانو بہ زانو پی گئے

---

کی سحر ہم نے تڑپکر ہجر کی شب مہ جبین  رات بھر سویا کئے تم ماہتابی مین پڑے
گر نہ کھائے ساتھ اپنے وہ نہین کھانے کا لطف  ہے مزا جب ہات دونون کا رکابی مین پڑے
ص اے ظفر جانے وہ کیفیت نگاہ مست کی  آنکھ اُس میکش کی جس پر بیجابی مین پڑے

---

یون ہے طبیعت اپنی ہوس پر لگی ہوی  مکڑی کی جیسے تاک مگس پر لگی ہوئی
ص آزاد کب کرے ہمین صیاد دیکھئے  رہتی ہے آنکھ باب قفس پر لگی ہوئی

---

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ مشکل زمینون مین بھی ظفر اپنی کامیابی کو ہات سے جانے نہین دیتے جب تک اُنھین ایک قافیہ بھی کام کا ملجاتا ہے۔ البتہ ایسے ردیف و قوافی مین جہان کسی اچھے شعر کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہین ہے، وہ ضرور مجبور

ہو جاتے ہین مگر اپنے استاد شاہ نصیر کے تتبع مین اور کچھ قدرت شاعری کے اظہار کے لئے انھون نے ایسی ایسی مہمل ردیفین پیدا کی ہین اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسے ایسے مکروہ و لغو قافیے استعمال کئے ہین کہ شاید ہی کہین اور نظر آئین۔ مثلاً:۔

خلاف تنگ　،　شگاف تنگ ــــــ

موڑ کی ایک　،　ہنسوڑ کی ایک ــــــ

فولاد کی نوک　،　ناشاد کی نوک ــــــ

سنگ تڑ ق　،　رنگ تڑ ق ــــــ

قاتل کے چار پانچ　،　ساحل کے چار پانچ ــــــ

قلقل سے کم　،　بلبل سے کم ــــــ

گھر مین سلاخ　،　کمر مین سلاخ ــــــ وغیرہ

ظاہر ہے کہ ان زمینون مین کوئی شعر نہین نکل سکتا، لیکن ظفر نے کثرت سے اس طرح کی غزلین کہی ہین اور جہانتک صرف نظم کر دینے کا تعلق ہے، خوب ہین ورنہ غزل سے انھین کوئی واسطہ نہین، اور نہ ہو سکتا ہے

---

ظفر کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ واردات قلب کو نظم کرتے ہین تو سہل و آسان الفاظ مین خاص قسم کی تاثیر پیدا کر دیتے ہین اور اسی لئے ان کی مسلسل غزلین خوب ہوتی ہین۔ مثلاً ایک جگہ انھون نے کس مغنیہ کی حالت رقص و غنا کو مسلسل غزل کی صورت مین پیش کیا ہے اور اس مین شک نہین کہ خوب ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

تو جو مہتابی پہ کل رات کھڑا گاتا تھا　　دائرہ مہ بھی لئے ساتھ کئے جاتا تھا
بندھ گئی تھی وہ ہوا گانے کی تیری کہ مرا　　ساتھ ہر تان کے جی تھا کہ اُڑا جاتا تھا
کیا کہون رقص کا عالم عجب انداز کے ساتھ　　ساتھ ٹھوکر کے تری ٹھوکرین دل کھاتا تھا
ہاتھ کو ہاتھ پہ تو رکھ کے لگا جب چلنے　　ہاتھ ہم ملتے تھے دل تھا کہ ملا جاتا تھا

لکھتے لکھتے اخیر مین مقطع لکھتے ہین اور کس قیامت کا کہ:۔

آنکھ چاہت کی ظفر کوئی بھلا چھپتی ہے　　اُس سے شرماتے تھے ہم، ہم سے وہ شرماتا تھا

مسلسل غزلون مین اُن کی یہ غزل بہت مشہور ہے:۔

تا درِ جاناں ہمین اول تو جانا منع ہے　　اور گئے تو حلقۂ در کا ہلانا منع ہے
حلقۂ در گر ہلایا بھی تو بولے کون ہے　　اب بتائین کیا کہ نام اپنا بتانا منع ہے
نام بتلایا جو مین نے تو وہ سنکر چپ رہے　　پھر پکارین کس طرح سے غل مچانا منع ہے

غل مچا کر گر پکارا بھی تو جھنجھلا کے کہا — جاؤ کیون آئے تمھین گھر مین بلانا منع ہے
اور بلایا بھی تو پھر جائین وہان ہم کس طرح — وہ جہان ہین ہمکو وان تک بار پانا منع ہے
بار پا کر کچھ اگرچہ ہم گئے بھی وان تلک — آنکھ اُٹھا کر کیونکہ دیکھین آنکھ اُٹھانا منع ہے
سامنے بھی وہ کسی صورت سے گر آئے تو پھر — بولنا ہنسنا تو کیا وان مسکرانا منع ہے
مسکرائے بھی تو کچھ چپکے ہی چپکے غنچہ وار — دل مین کیا کہا مدعا اور لب ہلانا منع ہے
لب ہلائے بھی تو کی کچھ بات منھ سے اور ہی — پڑھنا ہر مطلب پہ شعر عاشقانہ منع ہے
عاشقانہ شعر بھی کوئی پڑھا تو پڑھ کے پھر — آہ بھرنا منع ہے آنسو بہانا منع ہے
آہ بھر کر کچھ اگر آنسو بہائے بھی تو پھر — وہ جو دل کی بات ہے اُس کا جتانا منع ہے

بات گر دل کی جتائی بھی تو پھر ہوتا ہے کیا
اے ظفر ایسی جگہ دل ہی لگانا منع ہے

کہین کہین دوران غزل مین قطعہ بھی وہ اسی رنگ کا لکھتے ہین مثلاً

خط جسے چاہو لکھو تم لیکن — اتنا بندہ پہ کرم کیجئے گا
وہ جو القاب لکھا ہے مجھے — وہ کسی کو نہ رقم کیجئے گا

---

اے ظفر دل کو وہ مین گر بقسم — ان کی باور نہ قسم کیجئے گا
یعنی دل بیکے نہ دینگے وہ تمھین — لاکھ گر چشم کو نم کیجئے گا
دل انھین دیکے تم اپنے دل پر — اپنے ہاتھون سے ستم کیجئے گا

مسلسل غزلون کے سلسلہ مین ظفر نے جو سراپا لکھے ہین، وہ کوئی خصوصیت نہین رکھتے کیونکہ ندرت تخئیل کے نہ ہونے کی وجہ سے تمام تشبیہات پامال و فرسودہ استعمال کی گئی ہین

چین جبین کو موج سمندر (عربی لفظ کی اضافت ہندی لفظ کے ساتھ ہے) ابرو کو باب سکندر، مانگ کو خط کہکشان، پیشانی کو ماہ انور، بالون کو شب یلدا، رُخ کو خورشید محشر، جوڑے کو مشک نافہ، عارض کو صبح صادق، قد کو قیامت، جس طرح اور شعرا اس سے قبل لکھ گئے تھے، ظفر نے بھی لکھا ہے، لیکن ایک بحر مستلحن مین اسمین ہر اُس بحر کو جو موسیقی کی کسی سمپورن راگنی مین پوری طرح آسکے، بحر مستلحن کہتا ہون) ہلکے ہلکے جذبات کے ساتھ ملا ہوا سراپا شاید کسی مغنیہ کا ظفر نے اچھا لکھا ہے

شمشیر برہنہ، مانگ غضب بالون کی مہک پھر ویسی ہے — جوڑے کی گندھاوٹ قہر خدا بالون کی مہک پھر ویسی ہے
ہر بات مین اُس کے گرمی ہے ہر ناز مین اس کے شوخی ہے — قامت ہے قیامت چال بری چلنے مین پھڑک پھر ویسی ہے

نوخیز کچین دو غنچہ ہین، ہے نرم شکن اک خرمن گل — باریک کمر جون شاخ گل رکھتی ہے لچک پھر ویسی ہے
محرم ہے حباب آب روان سورج کی کرن ہے اُسپہ لپٹ — جالی کی ہے کرتی اُسکی بلا گوٹے کی دھنک پھر ویسی ہے
وہ گائے تو آفت لائے ہے ہر تال مین لیوے جان نکال — ناچ اُس کا اُٹھائے سو فتنے گھنگرو کی جھنک پھر ویسی ہے

ہر بات پہ ہم سے وہ جو ظفر کرتا ہے رکاوٹ مدت سے
اور اُس کی چاہت رکھتے ہین ہم آج تلک پھر ویسی ہے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظفر کو اپنے جذبات و احساسات کے اظہار پر کافی قدرت تھی اور وہ کسی واقعہ یا تاثر کو کافی شرح و بسط اور جزئیات کا پورا احاطہ کرتے ہوے ظاہر کرسکتے تھے - اسی لئے طویل بحرون کی غزلین یا مستزاد انھون نے بہتر لکھی ہین اور تنگ بحرون مین وہ کامیاب نہ ہوتے تھے، کیونکہ فارسی تراکیب کا استعمال وہ کرتے نہ تھے اور وسیع مطالب کو مختصر الفاظ مین ظاہر کرنے کے لئے فارسی ترکیبون کا استعمال ناگزیر ہے - اگر کہین فارسی ترکیب انھون نے استعمال کی ہے تو ردیف و قافیہ سے مجبور ہو کر مثلاً یہ غزل

مانند شمع عشق مین گردن بریدہ ہون — پر بل ہے سرکشی کہ وہی سرکشیدہ ہون
مطلب نہ آشنا سے نہ دام و قفس سے کام — مین اس چمن مین طائر رنگ پریدہ ہون
بدلے زلال خضر نہ منہ کا مرے مزا — مین تلخ کام زہر محبت چشیدہ ہون
وحشت کے وہ ہی ڈہنگ ہین ہستی ہے تاقدم — مین وحشی رمیدہ کہان آرمیدہ ہون
نے شمع انجمن ہون نہ مین لالۂ چمن — پھر کیون جہان مین داغ بدل آفریدہ ہون

فارسی کا ذوق ظفر کا ناقص تھا جیسا کہ اُن کی بعض فارسی غزلون سے معلوم ہوتا ہے - ایک غزل کے بعض اشعار ملاحظہ ہون:-

اے بت طناز قربانت شوم — اے سراپا ناز قربانت شوم
حلقۂ زلف و کمندِ جان و دل — اے کمند انداز قربانت شوم
چون مسیحا در لب جان بخش تو — صد ہزار اعجاز قربانت شوم
مرغ جانم در ہوائے کوئے تو — میکند پرواز قربانت شوم
تا بہ قربان گاہ من یکرہ زناز — باز آتا باز قربانت شوم
تو بہر انداز بنما جلوۂ — من بہر انداز قربانت شوم

ہر دم آن ابرو کمان را از ظفر
میرسد آواز قربانت شوم

معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے کو فارسی زبان سے کوئی مس ہی نہین ہے

ظفر کے یہان اُس رنگ تصوف کے بھی اشعار کہین کہین پائے جاتے ہین جس کا لطف صاحب حال حضرات کے مطالعہ ہی سے

حاصل ہوسکتا ہے اور بعض بعض صوفیہ نے فارسی مین بے اختیارانہ طور پر اسکا اظہار بھی کر دیا ہے، ظفر نے بھی انھین کی تتبع مین چند غزلین اس رنگ کی لکھی ہین، لیکن چونکہ صرف قال ہی قال ہے اس لئے بے کیف ہین :-

صوفیون مین ہون نہ رندون مین نہ میخوارون مین ہون　　اے بتو بندہ خدا کا ہون گنہگارون مین ہون

میری ملت ہے محبت میرا مذہب عشق ہے　　خواہ مین ہون کافرون مین خواہ دینداروں مین ہون

اسی طرح وہ کہتے گئے ہین کہ نہ گلون مین ہون نہ خارون مین، نہ مدہوشون مین ہون، نہ ہوشیارون مین نہ آزادون مین ہون نہ گرفتارون مین، صرف ایک شعر انکا اس غزل مین اچھا ہے :-

جو مجھے لیتا ہے پھر وہ پھیر دیتا ہے مجھے　　مین عجب اک جنس ناکارو خریدارون مین ہون

ظفر ایک بزرگ شاہ فخرالدین کے مُرید تھے جن کا ذکر انھون نے متعدد جگہ اپنے کلیات مین کیا ہے۔ اس غزل کے مقطع مین بھی لکھتے ہین۔

اے ظفر مین کیا بتاؤن تجھ سے جو کچھ ہون سو ہون　　لیکن اپنے فخر دین کے کفش بردارون مین ہون

ظفر نے پنجابی زبان مین کہین کہین کاوش کی ہے اور مخمس، تضمین، رباعی، وغیرہ بھی ان کے کلیات مین پائی جاتی ہے، لیکن کوئی خصوصیت ان مین بھی نہین ہے

بہرحال ظفر شاعر تھا اور نہایت پُرگو قسم کا۔ اور باوجود اُس سخافت و دنائت کے جو رعایات لفظی، ادنیٰ تشبیہات، اور مشکل زمینون مین محض قدرت نظم ظاہر کرنے کے سلسلہ مین اُس سے ظاہر ہوئی ہے، ہمکو ماننا پڑیگا کہ ظفر کو قدرت نے شاعر پیدا کیا تھا، لیکن نہایت ہی سیدھا سادھا شاعر جو مادی عشق کے مادی جذبات کے نظم کرنے مین بغیر کسی جوش خروش اور بغیر کسی غیر معمولی بلندی کے پوری مہارت رکھتا تھا۔ زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی یہ دو باتیں ان کے کلام مین ایسی ہین جنکو تمام تذکرہ نویسون نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے۔

موجودہ چارون دیوان جنھین نولکشور پریس نے چھاپا ہے وہی ہین جو رنگون جانے سے قبل مرتب ہو چکے تھے۔ قیام رنگون کے زمانہ کا کلام دستیاب نہین ہوتا ممکن ہے انقلاب حالات کی وجہ سے اس مین کوئی اور کیفیت پیدا ہو گئی ہو

ظفر کی ولادت سنہ ۱۷۷۵ء مین ہوئی۔ سنہ ۱۸۳۷ء مین تخت نشین ہوئے۔ سنہ ۱۸۵۸ء مین معزول کر کے رنگون بھیجدیئے گئے اور سنہ ۱۸۶۲ء مین انتقال ہوا، وہ بہت منکسر مزاج، متواضع، رحمدل اور مخیر شخص تھا، اسنے کبھی کسی کو کوئی آزار نہین پہونچایا اور نہ عصبیت اس سے ظاہر ہوئی۔ عام تصوف کا ذوق رکھنے والون کی طرح اس مین تفضیلی رنگ غالب تھا اور اس لیے مجالس عزاداری وغیرہ کا بھی پابند تھا

ذیل مین اس کے کلام کا ایک سرسری و ناقص انتخاب پیش کیا جاتا ہے :-

کسی نے اُس کو سمجھایا تو ہوتا　　کوئی یان تک اسے لایا تو ہوتا

جو کچھ ہوتا سو ہوتا، تو نے تقدیر　　وہانتک مجھ کو پہونچایا تو ہوتا

مین اُس کو دیکھ کے یہ محو ہون کہ حیران ہون  جو کچھ وہ پوچھیگا مجھ سے جواب کیا دون گا
نہ پوچھ مجھ سے ظفر میری تو حقیقت حال  اگر کہونگا ابھی تجھ کو مین رُلا دون گا

---

وہ بیحجاب جو کل پی کے یان شراب آیا  اگرچہ مست تھا مین پر مجھے حجاب آیا

---

بیچ مین پردہ دوئی کا تھا جو حایل اُٹھ گیا  ایسا کچھ دیکھا کہ دنیا سے مرا دل اُٹھ گیا
اے ظفر کیا پوچھتا ہے بیگناہ و پُرگناہ  اُٹھ گیا اب تو جدھر کو دستِ قاتل اُٹھ گیا

---

یہ کراہا ترا بیمار الم درد کے ساتھ  کسی ہمسایہ کو بیمار نے سونے نہ دیا

---

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر مین نورِ جمال تھا  کھُلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا
مرے دل مین تھا کہ کہونگا مین جو یہ دل پہ رنج و ملال ہے  وہ جب آگیا مرے سامنے نہ تو رنج تھا نہ ملال تھا

---

بھید دل کا گریہ سے اے چشمِ نم کھُل جائے گا  وہ جو ہے پوشیدہ اپنا حالِ غم کھُل جائے گا
اُس کے رُکنے پر نہ جا پیتے ہی جامِ مے ظفر  دیکھنا باتون مین وہ کافرِ صنم کھُل جائے گا

---

نہ تھی حال کی جب ہمین اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر  پڑی اپنی بُرائیون پر جو نظر تو نگاہ مین کوئی بُرا نہ رہا
کئی روز مین آج وہ مہر لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما  مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا اُسے پاس حجاب و حیا نہ رہا

---

وہ بگڑے ایسے کہ پھر کچھ معاملہ نہ بنا  رہی نہ جائے سخن موقع گلہ نہ بنا
جو دل لیا ہے تو عہد وفا پہ قائم رہ  ظفر سے آپ کو تو بد معاملہ نہ بنا

---

دیدیا دل اور نہین اب یاد یہ کس کو دیا  عشق کو کھووے خدا جس نے جہان سے کھودیا
خواہ وہ داغ جنون ہو خواہ کوئی اشک خون  ہم تے سر آنکھون پہ رکھا عشق تونے جو دیا
چاہے دلداری کرے چاہے دل آزاری کرے  اے ظفر اُس دلربا کو ہم نے دل اب تو دیا

کیا کہوں کیونکہ ترے کوچہ مین ہوکر آیا
تجھ کو پایا جو نہین خوب مین رو کر آیا

ہے عشق کی منزل مین یہ حال اپنا کہ جیسے
لٹ جائے کہین راہ مین سامان کسی کا

گلی گلی تری خاطر پھرا بہ چشم پُرآب
لگا کے تجھ سے دل اپنا بہت خراب ہوا

قسم خدا کی تجھے قاصدا کہ یہ پیغام
کہا ہے یار نے یا تو نے اپنے جی سے کہا
ظفر وہ دشمن جان ہے اسے نہ جانیو دوست
ترے جتانے کو ہم نے یہ دوستی سے کہا

کیا بات یاد آگئی اُس کو کہ اے ظفر
وہ یک بیک جو سُنکے مرا نام ہنس پڑا

کوچہ مین ترے تنہا ہر شب مجھے ہو جانا
دو چار گھڑی اپنا دل کھول کے رو جانا
نیند آئے ظفر کیونکر یاد آئے جو شب مجھ کو
سر رکھ کے سر زانوا اُس یار کے سو جانا

وہ تو ہے نا آشنا مشہور عالم مین ظفر
پر خدا جانے وہ تم سے آشنا کیونکر ہوا

کچھ خبر قاصد نے دی ایسی کہ سنتے ہی جسے
دل سے مین مجھ سے مرا دل بیخبر ہونے لگا
ہم نے کہکر اپنا حالِ دل دیا سب کو رُلا
ہر طرف رومال پر رومال تر ہونے لگا
کوچۂ جانان مین جانا ہی پڑیگا ہو سو ہو
کیا کرون بیتاب دل پھر لے ظفر ہونے لگا

مجھ کو سمجھائین گے یا میرے دلِ دیوانہ کو
حضرت ناصح سے پوچھو کس کو سمجھائین گے آپ
آپ کی خاطر سے ہم کرتے تھے ضبطِ اضطراب
دیکھ کر بیتاب ہمکو اور گھبرائین گے آپ

وقت غفلت اور ہے ہنگام ہشیاری ہے اور
خواب کی سیر اور ہے اور سیر بیداری ہے اور

درد مندان محبت کا طبیبوں سے علاج — کس طرح سے، ہو سکے یارو، یہ بیماری ہے اور
میکدہ مین عشق کے جو لوگ ہین کافر تو ہین — لیکن ان کے کفر مین انداز دینداری ہے اور

---

کبھی تو آؤ ہمارے گھر مین سنو ہماری بھی چار باتین — عجب ہے شکوہ رقیب کا یان ہزار منہ ہین ہزار باتین
گئے ظفر کل جو اس کے گھر ہم کھلا یہ شکوہ کا آگے دفتر — گزر گئی شب تمام تسپر نہو چکین زینہار باتین

---

یار دل مانگے نہ دون کیونکر کہو تو کیا کرون — اور جب دیدون تو لون کیونکر کہو تو کیا کرون
جبکہ پوچھے یار مجھ سے شیفتہ ہے کسپہ تو — منہ سے مین اپنے کہون کیونکر کہو تو کیا کرون
اپنا احوال محبت سامنے اُس کے ظفر — آپ مین لکھ کر پڑھون کیونکر کہو تو کیا کرون

---

یار ہو پیش نظر یہ کبھی ہونے کا نہین — ہو تو دیکھون نہ اُدھر یہ کبھی ہونے کا نہین
صبر مشکل ہے نکر صبر کا دعوی ہرگز — عشق مین تجھ سے ظفر یہ کبھی ہونے کا نہین

---

تم نظر آجاؤ شاید اس ہوس مین آج ہم — صبح سے تا شام سوئے رہگزر دیکھا کئے
گر نہین ہے ربط کچھ باہم تو پھر محفل مین شب — تم انھین اور وہ تمھین کیون اے ظفر دیکھا کئے

---

نہین ہے طاقت پرواز آہ اے صیاد — خدا کرے کہ تو اب وا درِ قفس نہ کرے
جو اُس کی جان پہ گزرے ہے وہ ہی جانے ہے — خدا کسی کو جہان مین کسی کے بس نہ کرے

---

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی — جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار — بیقراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

---

نیاز

# بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر

سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے :-

رعیت چو بیخ است و سلطان درخت درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

یہ جڑوں ہی کی مضبوطی تھی کہ دلی کا سرسبز و شاداب چمن اگرچہ حوادث زمانہ کے ہاتھوں پامال ہو چکا تھا اور فلاکت کی جھکڑ اور باد مخالف کے جھونکوں سے سلطنت مغلیہ کی شوکت و اقتدار کے بڑے بڑے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے پھر بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس برائے نام بادشاہ کو تخت سے اتار کر دلی کو اپنی سلطنت میں شریک کرلے۔ مرہٹوں کا زور رہا۔ پٹھانوں کا زور ہوا۔ جاٹوں کا زور ہوا۔ انگریزوں کا زور ہوا، مگر دلی کا بادشاہ دلی کا بادشاہ ہی رہا۔ اور جبتک دلی بالکل تباہ نہ ہولی، اسوقت تک کوئی نہ کوئی تخت پر بیٹھنے والا نکلتا ہی رہا۔ دلی کے ریذیڈنٹ نے بہت کچھ چاہا کہ بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کمی کرنے۔ گورنر جنرل نے بڑی کوشش کی کہ شاہی خاندان کو قطب میں منتقل کر کے قلعہ پر قبضہ کرے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بہت زور مارا کہ دلی کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا جائے مگر بورڈ والے اسپر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ دلی کا بادشاہ کیا ہے اور اس کے اثرات کہاں کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے مباحثے ہوئے۔ نوجوانوں نے بہت کچھ جوش و خروش دکھایا، مگر انگلستان کے جہاندیدہ بڈھوں کے سامنے کچھ نہ چلی۔ جب بورڈ میں مسٹر ٹکر نے کھڑے ہو کر کہا "عزیزو! میں ۵۰ سال ہندوستان میں رہا ہوں۔ میں وہاں کے رنگ سے اچھی طرح واقف ہوں، میں جانتا ہوں کہ دلی کا قلعہ کیا ہے۔ اسکی بنیاد اگر ایک طرف کابل تک گئی ہے تو دوسری طرف راس کماری تک۔ ایک جانب سام تک ہے تو دوسری جانب کاٹھیاواڑ تک۔ ذرا قلعہ کو ہاتھ لگایا تو وہ زلزلہ آئے گا کہ سارا ہندوستان ہل جائے گا۔ یہ برائے نام بادشاہت جس طرح چل رہی ہے اسی طرح چلنے دو" آخر بورڈ میں بڈھے جیتے اور نوجوان ہارے۔ دلی کے بادشاہ کا اقتدار ضرور کم ہو گیا۔ مگر جو عقیدت رعایا کو بادشاہ سے تھی اسمیں ذرہ برابر فرق نہ آیا اور جو محبت بادشاہ کو رعایا سے تھی وہ جیسی تھی ویسی رہی۔ رعایا کی وہ کونسی خوشی تھی جس میں بادشاہ حصہ نہ لیتے ہوں اور بادشاہ کا وہ کونسا رنج تھا جس میں رعایا شریک ہوتی ہو۔ بات یہ تھی کہ دونوں جانتے اور سمجھتے تھے کہ جو ہم ہیں وہ یہ ہیں اور جو یہ ہیں وہ ہم ہیں۔

شاہ عالمگیر ثانی کے قتل کے واقعہ ہی پر نظر ڈال لو۔ دیکھو کہ ہندو مرد تو مرد عورتوں کو بادشاہ سے کیسی محبت تھی۔ اور خود بادشاہ اس محبت کی کیسی قدر کرتے تھے۔ عالمگیر ثانی کو فقیروں سے بڑی عقیدت تھی، جہاں سن پاتے کہ کوئی فقیر آیا ہوا ہے اس کو بلاتے۔ نہ آتا تو خود جاتے۔ اس سے ملتے۔ بہت کچھ دیتے دلاتے۔ اور اس فقیر نوازی کو توشۂ آخرت سمجھتے۔ غازی الدین خاں اس زمانہ میں دلی کا وزیر تھا، خدا جانے اس کو بادشاہ سے کیوں کی نفرت تھی۔ قلعہ میں تو ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی۔ دھوکے سے بادشاہ کو مارنے کا جال پھیلایا قلعہ میں مشہور کر دیا کہ پرانے کوٹلہ میں ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں بڑے صاحب کرامات ہیں۔ بڑے خدا رسیدہ ہیں۔ مگر نہ کہیں خود جاتے ہیں

نہ کسی کو آنے دیتے ہیں۔ ادھر بادشاہ کو ملنے کا شوق ہوا۔ ادھر لوگوں نے شاہ صاحب کی کرامتوں کے اور پل باندھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رات بادشاہ تن تنہا قلعہ سے نکلکر کوٹلہ پہونچے۔ اِدھر اُدھر کھنڈروں میں تلاش کی، یہاں تو پہلے ہی سے دشمن لگے ہوئے تھے۔ چار نمک حراموں نے ایک برج میں سے نکلکر بادشاہ کو شہید کردیا۔ اور لاش جمنا کی ریتی میں پھینکدی۔ خدا کی قدرت دیکھو ادھر سے ایک برہمنی رام کور آرہی تھی۔ اس نے جو لاش پڑی دیکھی تو ذرا ٹھٹکی بھاگنے کا ارادہ کیا۔ پھر ذرا غور کیا تو کیا دیکھتی ہے کہ ہیں یہ تو بادشاہ سلامت کی لاش ہے، رات بھر اس بیکس شہید کا سر زانو پر لئے ہوئے بیٹھی روتی رہی۔ صبح جمنا جی کے اشنان کو لوگ آئے۔ انہوں نے بھی لاش کو دیکھکر پہچانا۔ تمام شہر میں کھلبلی پڑ گئی۔ اس بیکس شہید کی لاش دفن ہوئی۔ شاہ عالم ثانی بادشاہ ہوئے۔ انہوں نے رام کور کو بلایا بہت کچھ انعام واکرام دیا، اور اس برہمنی کو اپنی منہ بولی بہن بنالیا۔ تھوڑے دنوں میں سلونو کا تہوار آیا۔ بھائی کے لئے بہن موتیوں کی راکھی لے کر پہونچی۔ بادشاہ نے خوشی خوشی راکھی بندھوائی۔ بہن کو جوڑا دیا۔ اس کے رشتہ داروں کو خلعت دئے۔ لیجئے راکھی بندھن کی رسم قلعہ کی رسموں میں شریک ہوگئی۔ جب تک قلعہ آباد رہا، اس برہمنی کے خاندان اور قلعہ والوں میں بھائی چارہ رہا۔ ہر سال راکھیاں آتیں، بادشاہ اور شاہزادوں کے باندھی جاتیں۔ جوڑے دیے جاتے۔ یہ سلسلہ اُسوقت ٹوٹا جب بادشاہ سے قلعہ چھوٹا۔

پھول والوں کی سیر بھی اسی محبت باہمی کا نتیجہ تھی۔ ہوا یہ کہ اکبر شاہ ثانی اپنے منجھلے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولیعہد بنانا چاہتے تھے۔ سراج الدین ظفر بڑے بیٹے تھے۔ مگر باپ بیٹے میں صفائی نہ تھی۔ مرزا جہانگیر کو بادشاہ بہت چاہتے تھے اور کیوں نہ چاہتے۔ مرزا کی والدہ نواب ممتاز محل کا قلعہ میں زور تھا، بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم دونوں نے رزیڈنسی میں کوشش کی کہ کسی طرح مرزا جہانگیر ولیعہد ہوجائیں۔ اس زمانہ میں دلی کے رزیڈنٹ سیٹن صاحب تھے۔ ایسا بادشاہ پرست انگریز شاید ہی ہندوستان میں کوئی اور آیا ہو۔ وہ اکبر شاہ کی ویسی ہی عزت کرتے تھے جیسی خود اپنے بادشاہ کی کرتے تھے۔ ٹوپی اتار کر مجرا گاہ سے آداب بجالاتے۔ کرسی دی جاتی تو بادشاہ کے سامنے بھی نہ بیٹھتے۔ گفتگو میں آداب شاہی ملحوظ رکھتے۔ بادشاہ کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ غرض سب کچھ کرتے تھے مگر اسپر راضی نہ ہوتے تھے کہ مرزا جہانگیر ولیعہد ہوں۔ بظاہر اسکی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ سلسلۂ تخت نشینی کو درہم برہم کرنا نہیں چاہتے تھے، اور دوسری یہ تھی کہ وہ مرزا جہانگیر کے عادات واطوار سے مطمئن نہ تھے۔

مرزا جہانگیر بلا کے پینے والے اور غضب کے منہ پھٹ تھے، اس مخالفت سے دلوں میں بیر تو پڑ ہی گیا تھا، ایک دن سر دربار مرزا جہانگیر نے سیٹن صاحب کو "لولو ہے ہے" کہدیا۔ صاحب کسی نہ کسی طرح پی گئے۔ تھوڑے دنوں بعد یہ غضب کیا کہ ان پر گولی چلائی۔ آخر کہاں تک طرح دی جاتی۔ قید ہوکر الہ آباد گئے۔ ممتاز محل کو بڑا صدمہ ہوا۔ منت مانی کہ مرزا جہانگیر چھوٹ کر آئیں گے تو حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چادر اور پھولوں کی مسہری چڑھاؤں گی۔ خدا کی قدرت اور سیٹن صاحب کی شرافت دیکھو کہ انہی کی سفارش پر صاحب عالم قید سے رہا ہوئے۔ دلی آگئے۔ بادشاہ بیگم نے منت بڑھانے کی تیاریاں کیں۔ بڑی دھوم دھام سے چادر گئی، شہر بھر کے تمام ہندو مسلمان شریک ہوئے۔ قطب میں کئی دن تک میلہ لگا رہا۔ پھول والوں نے جو مسہری بنائی تو اسمیں خوبصورتی کے لئے ایک پھولوں کا پنکھا بھی لٹکادیا۔ بادشاہ کو یہ میلہ بہت پسند آیا۔ دلی والوں سے پوچھا کہ اگر ہر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلہ ہوا کرے

دیکھا؛ مسلمان درگاہ شریف پر پنکھا چڑھائیں۔ ہندو جوگ مایا جی پر چڑھائیں۔ مسلمانوں کے پنکھے میں ہندو اور ہندوؤں کے پنکھے میں مسلمان شریک ہوں۔ میلہ کا میلہ ہو اور دونوں قوموں میں میل جول بڑھے بھلائی کی اور پوچھ پوچھ دلّی والے راضی ہو گئے، لیجئے پھول والوں کی سیر کی بنیاد پڑ گئی۔ بادشاہ سلامت خود قطب جاتے۔ وہاں رہتے۔ شہزادے میلہ میں شریک ہوتے۔ بڑھتے بڑھتے یہ میلہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اسی زمانہ میں یہ گانا چلا:۔

قطب کو چلا میرا اکبر ہٹیلا — نہ رستہ میں جنگل نہ ملتا ہے ٹیلا!

بہادر شاہ کے زمانہ میں تو اس کا وہ زور ہوا کہ بیان سے باہر ہے، اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس زمانہ میں پھول والوں کی سیر کیسی ہوتی تھی، تو ذرا آنکھیں بند کر لیجئے میں دکھائے دیتا ہوں:۔

---

۱۲۶۷ھ کا ساون بھی غضب کا ساون تھا۔ یا تو برستا ہی نہ تھا یا برسا تو ایسا برسا ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ بدھ بدھ پندرہ پندرہ دن ہو گئے مینھ نے آج کھلتا ہے نہ کل اور پانی کا یہ حال ہے کہ دھائیں دھائیں یکساں برسے چلا جاتا ہے۔ جمنا بڑھ کر نگمبود گھاٹ تک آ گئی۔ کیلا گھاٹ میں پانی ہو شہر میں گھس آیا۔ چاندنی چوک کی نہر ابل کر کناروں سے نکل گئی۔ بیچارے چھوٹے چھوٹے مکانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ بڑی بڑی حویلیاں چیں بول گئیں۔ جدھر سنو، اڑاڑ دھم کی آوازیں چلی آ رہی ہیں۔ اس مکان کی چھت بیٹھی اسکا پاکھا گرا۔ شاید ہی کوئی مکان ہو گا جسکی کم سے کم چھل نہ گری ہو۔ غریب بے گھر بار چھوڑ باہر نکل آئے۔ جامع مسجد کے نیچے سامان کا ڈھیر ہو گیا۔ کسی نے پلنگ بچھا، اوپر سے دری ڈال چھوٹی سی کوٹھری بنالی۔ کسی نے چھپر کھٹ کے گرد چادر گھیر عورتوں کے لئے جگہ نکال لی۔ غرض ایک عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ دو سال پہلے بھی دو دن لگاتار دھوپ کا مینھ برسا تھا مگر یہ تو کچھ اور ہی رنگ تھا۔ بنئے اپنی مصیبت میں مبتلا تھے بھٹیارے اپنے حال میں گرفتار۔ آخر رہیں تو کہاں رہیں اور کھائیں تو کیا کھائیں۔

دلّی میں بہادر شاہ برائے نام بادشاہ تھے۔ سارا انتظام کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھا۔ بھلا کمپنی کو کیا غرض پڑی تھی جو ان غریبوں کی خبر لے۔ شہر والے جانیں اور ان کا کام جانے۔ خیر بادشاہ سلامت کو خبر ہوئی۔ بیچارے کے جو کچھ اختیار میں تھا۔ وہ کیا۔ سارے سرکاری مکان کھلوا دیئے۔ کوٹ قاسم کی مالگذاری انہی دنوں میں آئی تھی۔ وہ سب کی سب اس مصیبت ماری رعیت پر خرچ کر دی۔ مسلمانوں کو دونوں وقت کھانا پہونچایا، ہندوؤں کو غلہ دیا۔ سر چھپانے کو جگہ دی، غرض یہ مصیبت کے دن بھی کسی نہ کسی طرح گذر گئے۔ سولھویں دن ذرا پانی نے دم لیا۔ ابر پھٹا۔ سورج کا کونا دکھائی دیا۔ لوگوں کی جان میں جان آئی۔ دو چار دن مکانوں کی مرمت اور حالت کی درستی میں لگے۔ اسکے بعد یاروں کو میلہ کی سوجھی

بھلا جمنا ایسی بھرپور چلے اور دلی والے چپکے بیٹھے رہیں۔ ڈھنڈورا پٹ گیا کہ کل تیراکی کا میلہ ہے، صبح ہی سے قلعہ کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ آٹھ نو بجے تک تو یہ حالت ہوئی کہ شہر خالی ہو۔ بیلہ[1] آباد ہو گیا۔ نواڑیوں۔ کا چھیوں۔ بساطیوں۔ سوداگروں غرض ہر قسم کے

---

[1] جمنا کی ریتی کے برابر برابر جھاؤ کا جو جنگل ہے اسکو بیلہ کہتے ہیں۔

سودے والوں کی دوکانیں لگ گئیں۔ جنگل میں منگل ہوگیا۔ بادشاہ سلامت بھی ثمن برج[1] میں آبیٹھے شہزادوں کے لئے دیوان خاص کی صحن میں فرش ہوگیا۔ بیگمات اور شہزادیوں کے لئے موتی محل۔ خاص محل۔ ہیرا محل اور اسد برج کی جالیوں کے سامنے مسندیں بچھ گئیں۔ تیراکوں کے استاد اپنے اپنے شاگردوں کو لے جمنا میں اترے۔ اور تیراکی کے کمال دکھانے شروع کئے۔ کوئی چیت تیرا تو اس طرح گویا تختہ بہا چلا آتا ہے۔ کسی نے کھڑی ماری تو ایسی کہ گھٹنے تک پانی سے باہر نکل آیا کوئی ہے کہ گٹھڑی بنا بہا ہوا چلا جاتا ہے۔ کوئی شیر کے ہاتھ مارتا چڑھاؤ پہ سیدھا چڑھ رہا ہے۔ ادھر تیراکی ہو رہی تھی۔ اُدھر قلعہ والوں اور شہر والوں میں کنکوے بازی شروع ہوئی۔ تکلیں لڑی تو ایسی کہ ہکراتی ہکراتی مقبرہ[2] سے آگے نکل گئیں پتنگ لڑے تو ایسے کہ سارا آسمان کنکووں سے چھپ گیا۔ غرض یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ دو دن پہلے اس شہر میں آفت بپا تھی۔ شام ہوتے ہوتے میلہ بچھڑنا شروع ہوا۔ رات کے نو دس بجے بیلہ پھر وہی جنگل کا جنگل ہوگیا۔ ہاں دونوں اور آبخوروں کے ڈھیر۔ بیکوں کے نشان اور چھلکوں کے انبار یہ ضرور بتاتے تھے کہ یہاں کوئی بڑا شہر تھا جو دم بھر میں بسا اور دم بھر میں غائب ہوگیا۔

ساون ختم ہوا۔ بھادوں لگا۔ جھڑیوں کا زمانہ گیا۔ پھوار کا زمانہ آیا۔ دلی والوں کے دلوں میں پھر گدگدی شروع ہوئی۔ قطب کا سبزہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ پھولوالوں کی سیر کی سوجھی۔ شرفاء دہلی میں سے دو ہندو دو مسلمان لال حویلی[3] پہونچے۔ اطلاع کرائی باریابی ہوئی۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد حرف مطلب زبان پر لائے۔ کہا "پیر و مرشد۔ پھولوالوں کی سیر کا زمانہ آگیا ہے۔ جھرنا اور شمسی تالاب بھر کر کٹورہ ہوگئے ہیں۔ کوئی تاریخ مقرر فرمادی جائے۔ اگر جہاں پناہ بھی تشریف لائیں تو زہے نصیب" بادشاہ نے فرمایا "ہاں اماں[4] ٹھیک تو ہے۔ جو تمہاری خوشی۔ وہ ہماری خوشی۔ ۱۵۔ تاریخ مقرر کردو۔ رہا ہمارا آنا تو جہاں تم وہاں ہم۔ کیوں نہ آئیں گے۔ ضرور آئیں گے" تاریخ مقرر ہونا تھا کہ شاہی روشن چوکی کا شہنائی نواز چاندی کی نفیری ہاتھ میں لئے حاضر ہوا۔ نفیری پر شادیانہ بجایا۔ لیجئے سیر کی ۱۵۔ تاریخ بھی ہوگئی۔ سارے شہر میں نفیری بجگئی کہ پندرھویں کو پھولوالوں کی سیر ہے۔ لوگوں نے تیاریاں شروع کیں۔ بادشاہ سلامت دربار خاص سے اٹھ کر تسبیح خانہ میں گئے ہی تھے کہ تمام بیگمات اور شہزادیاں جمع ہونی شروع ہوئیں۔ ایک آتیں۔ سلام کرکے بیٹھ جاتیں۔ دوسری آتیں۔ بیٹھ جاتیں۔ تھوڑی دیر میں سارا قلعہ تسبیح خانہ میں جمع ہوگیا۔ لیکن سب ہیں کہ منہ سے چپ ہیں۔ مگر نگاہیں صاف کہہ رہی ہیں کہ قطب چلئے۔ بادشاہ سلامت بھی سمجھ گئے۔ فرمایا:-

---

[1] قلعہ میں تسبیح خانہ سے ملا ہوا یہ ایک ہشت پہل برج ہے۔ نام تو اسکا مثمن برج ہے لیکن دلی والے اس کو ثمن برج کہتے ہیں

[2] مقبرہ سے مراد ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ یہ عمارت دلی سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

[3] دہلی کے قلعہ کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہتے تھے۔ حافظ عبدالرحمٰن خان احسان کا شعر ہے:-

میری تنخواہ لوٹی ان شیروں نے حویلی میں — دہائی ہے بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے

[4] آخر زمانہ میں شاہان دہلی انہی معنوں میں "اماں" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ جن میں ہم آج کل "بھئی" کا لفظ بولتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کا یہ خیال تھا کہ یہ لفظ شاید "اے میاں" کا مخفف ہے۔ چنانچہ اب بھی دہلی میں "اے میاں" کو مختصر کرکے "اماں" بولا جاتا ہے۔ ان کے اس خیال کو پیش نظر رکھ کر میں نے دلی کے شہزادوں سے اسکی مکرر تحقیق کی معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت اس لفظ کو اپنے اصلی یعنی "ماں" کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اس لفظ کا استعمال حیدرآباد دکن میں اب بھی عام طور سے ہوتا ہے

"اماں میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ سیر کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے۔ آج دس ہے۔ پندرہ کو سیر ہے۔ اچھا ہوگا کہ سب سے پہلے ہی چلے چلیں۔ بعد میں گئے تو شہر والوں کو تکلیف ہوگی۔ دو تین دن قطب کا لطف اٹھالو۔ اور پھر قطب دلی والوں کے سپرد کردو۔ لو جاؤ۔ چلنے کی تیاری کرو۔ انشاء اللہ کل سویرے سویرے روانہ ہوں گے۔ اور ہاں میاں دارا[1]۔ تم ہماری سواری کا بندوبست کرو۔ کوتوال سے کہدو۔ قلعدار سے کہدو۔ حکیم[2] صاحب سے میں خود کہدونگا کل صبح سویرے سے نکل گئے۔ تو سلطان جی ہوتے ہوئے شام تک انشاء اللہ قطب پہونچ جائیں گے" یہ سب لوگ تو اتنا سننے کے لئے جمع ہی ہوئے تھے۔ ایک ایک اٹھ، مجرا کر رخصت ہوا۔ سامان بندھنے لگا۔ سامان بندھتا اور داروغہ توشک خانہ کے پاس پہنچ جاتا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ بیسوں بیٹیاں۔ سیکڑوں بوغبند۔ ہزاروں چاء دانیاں۔ لاکھوں پوٹلیاں۔ غرض الم غلم منوں سامان جمع ہوگیا۔ کچھ چھکڑوں میں لادا گیا۔ کچھ اونٹوں پر چڑھایا گیا۔ کچھ شکرموں[3] میں رکھا گیا۔ کوئی بارہ ساڑھے بارہ کا عمل ہوگا کہ سامان چلنا شروع ہوا۔ خدا خدا کر کے کہیں دو بجے اس لین ڈوری کا تانتا ختم ہوا۔ اسوقت کہیں جا کر بیچارے داروغہ کو دم لینے کی فرصت ملی۔ ابھی پوری طرح دم نہ لیا تھا کہ اردابیگنی نے حکم پہونچایا کہ حضرت جہاں پناہ کا ارشاد ہوا ہے کہ توشک خانہ شاہی ابھی روانہ ہو۔ جنگلی محل میں قیام ہوگا اسلئے خیموں۔ سراپردوں۔ اور شامیانوں کے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں شہر والے اگر یہ سامان طلب کریں تو دیدیا جائے۔ دوسرے حکم کا انتظار نہ کیا جائے۔ اور حکیم صاحب کے ذریعہ سے شہر کے لوگوں کو اس حکم کی اطلاع کرادی جائے" حکم پہونچنا تھا کہ داروغہ صاحب پھر کمر باندھ اپنے پیش دستوں کو لے۔ سرکاری سامان باندھنے کی فکر میں لگ گئے۔ یہاں انتظام والے تو اپنی مصیبت میں گرفتار تھے۔ اور وہاں قلعہ والونکی یہ حالت تھی کہ گویا شادی رچی ہوئی ہے۔ چوڑی والیاں بیٹھی دھانی چوڑیاں پہنا رہی ہیں۔ رنگریزنیں سرخ دوپٹے رنگ رہی ہیں۔ کہیں مہندی پس رہی ہے۔ کہیں کٹیاں نکالی جارہی ہیں۔ کہاں کا کھانا اور کہاں کا سونا۔ اسی گڑبڑ میں رات کے بارہ بجادیئے۔ کوئی دو بجے ہونگے کہ سواری کا بگل ہوا۔ قلعہ کے لاہوری دروازہ کے سامنے نوبت خانہ سے ملا ہوا جو میدان ہے اسمیں سواریاں آن لگیں۔ انائیں۔ ددائیں۔ مغلانیاں۔ خواصیں[4]۔ چھوکریاں۔ لونڈیاں۔ سرتیں[5] سوار ہونا شروع ہوئیں۔ بہارکسوں۔ منجھولیوں۔ اور بہلیوں میں وہ ٹھسا ٹھس ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ سانگیوں[6] اور ماچیوں میں پہلے تو اٹا ٹٹ سامان بھرا۔ اوپر سے بھی دو دو۔ تین تین چھوکریاں اور مامائیں دھنس گئیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح سے یہ

---

[1] مرزا دارا بخت ولیعہد سلطنت تھے

[2] احترام الدولہ۔ عمدۃ الحکماء معتمد الملک، حاذق الزماں۔ حکیم محمد احسن اللہ خاں ثابت جنگ بہادر وزیر اعظم تھے۔ انہی کی شہادت نے بیچارے بادشاہ کو رنگون دکھایا

[3] اونٹ گاڑی کو پہلے شکرم کہتے تھے۔ پھر یہ لفظ بند گھوڑا گاڑی کے لئے بھی بولا جانے لگا

[4] اس زمانہ میں بیگمات اور شہزادیوں کی مصاحبوں کو خواص کہتے تھے۔ درجہ میں یہ مغلانیوں سے کچھ بڑی ہوتی تھیں

[5] زرخرید لونڈیاں سرتیں کہلاتی تھیں۔ سریہ عربی میں لونڈی کو کہتے ہیں

[6] بہارکسوں اور بہلیوں کے سامنے بانس باندھ کر اور سوت کا جال بنا کر جو جگہ نکال لیتے ہیں اسکو سانگی۔ اور اسی طرح پیچھے گھاس وغیرہ بھرنے کو جو جھولی سی بنا لیتے ہیں اسکو ماچی کہتے ہیں

یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔ بیل لگائے گئے اور یہ قافلہ قطب کو روانہ ہوا۔ مشعلچی مشعلیں اور تیل کی کپیاں ہاتھوں میں لئے ساتھ ہوئے۔ یہ لوگ قلعہ سے باہر ہی ہوئے ہوں گے کہ بیگمات اور شہزادیوں کے لیے رتھیں، ڈولیاں، نیمے، میانے، پالکیاں، چوپہلے، چنڈول اور سکھپال موتی محل کے برابر آ لگے۔ شاہزادہ ولیعہد بہادر بھی باہر نکل آئے۔ دگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے راستے بند کئے۔ ترکنوں اور گرجنوں نے قناتیں کھینچیں، جو بیگم یا شہزادی باہر آتی انکو بلحاظ ان کے درجہ کے سواری ملتی۔ ہر سواری کے ساتھ ایک قلماقنی اور ایک اردا بیگنی مقرر ہو جاتی۔ تین سوا تین بجے ہوں گے کہ پہلی رتھ روانہ ہوئی۔ آگے آگے رتھیں۔ اس کے پیچھے دوسری سواریاں سب سے آخر میں نواب زینت محل کا سکھپال۔ لاہوری دروازہ پر سواری پہونچی تھی کہ کپتان ڈگلس قلعدار نے اتر کر سلامی دی۔ دروازہ کے باہر سے دگلہ پلٹن کا ایک پرا آگے ہو گیا اور ایک پیچھے۔ شہزادیوں کی سواریوں کے ادھر اُدھر قلمانیاں مردانہ لباس پہنے۔ کھڑکی دار پگڑیاں باندھے۔ ساتوں ہتھیار سجائے ساتھ ہوئیں۔ بیگمات کی سواریوں کو ترکنوں کی پلٹنوں نے بیچ میں لیا۔ انکا بھی مردانہ فوجی لباس، گورے گورے چہرے۔ شانوں پر کاکلیں پڑی ہوئیں۔ سر پر چھوٹا سا عمامہ۔ اسمیں سفید پردں کی اونچی کلغی۔ ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی برچھیاں پشت پر ترکش۔ شانہ پہ کمان۔ پہلو میں تلوار۔ ڈاب میں پیش قبض بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ترکوں کی فوج دلی میں گھس آئی ہے۔ نواب زینت محل کی سواری کا بڑا ٹھاٹ تھا آگے آگے دو جلبشنیں۔ گھونگھر والے بال۔ انپر سرخ پگڑیاں، پگڑیوں میں سفید مقیش کے پھندنے۔ موٹے موٹے ہونٹ لال لال دیدے۔ سرخ گرنٹ کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ۔ گھوڑوں پر سوار۔ ہاتھوں میں پتلی پتلی چوبیں۔ سامنے گھوڑوں کی پشت پر زربفت سے منڈھے ہوئے ڈنکے۔ ایک چوب مارتی۔ دوسری پکارتی "ادب سے۔ نگاہ روبرو حضرت بادشاہ بیگم سلامت" سکھپال کے دونوں طرف دو دو گرجنیں ایک کے ہاتھ میں مورچھل دوسری کے ہاتھ میں چنور۔ ہر ہر قدم پر۔ بسم اللہ، بسم اللہ کہتی چلی آتی تھیں۔ سب سے پیچھے اردا بیگنیوں کی پلٹنیں۔ مردانہ لباس پہنے۔ ہتھیار لگائے۔ او بچی بنی ساتھ ساتھ تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مشعلچنیں۔ کسی کے ہاتھ میں مشعل اور کپی۔ کسی کے ہاتھ میں دو شاخہ کسی کے ہاتھ میں پنجشاخہ۔ سواری کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں۔ یہ جلوس دلی دروازہ تک تو اسی سلسلہ سے گیا۔ دروازہ

---

سہ نے تہ اور یہ آدھی پالکی کو نیمہ کہتے ہیں۔ اسمیں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے۔ اس سے بڑی میانہ ہے۔ چوپہلے بھی پالکی کی وضع کے ہوتے ہیں۔ مگر انکی شکل بجائے مستطیل کے چوکور ہوتی ہے

شہ یہ خاص محلسرا کی حفاظت کی فوج تھی صرف شریف لوگ اسمیں نوکر ہو سکتے تھے۔ اور انپر اسقدر اعتبار تھا کہ ساری ڈیوڑھیوں پر انہی لوگوں کا پہرا تھا۔ بغیر انکی اجازت کے کوئی عورت بھی محل میں قدم نہیں رکھ سکتی تھی انکے کسی قدر ڈھیلے ڈھالے لباس کی وجہ سے شاید اسکو دگلہ پلٹن کہتے ہوں۔ یا اسوجہ سے ہو کہ لڑائی کے وقت یہ لوگ جلتہ پہنتے تھے

تہ نواب زینت محل خاندان شاہی سے نہ تھیں۔ نواب علی قلی خاں کے خاندان میں نواب شمشیر الدولہ کی لڑکی سے بادشاہ نے بڑھاپے میں شادی کی تھی۔ خدا کی قدرت سے اولاد ہوئی۔ جواں بخت نام رکھا گیا۔ انہی کی ولیعہدی کے جھگڑوں نے قلعہ میں تفرقہ ڈالا۔ بیگم کی محبت میں بادشاہ ایسے گرفتار تھے کہ جو وہ چاہتیں بلا چون چرا کرتے۔ آخر انہی جھگڑوں نے رنگوں پہنچا دیا۔ یہ بیگم جب نکلتیں ڈنکہ انکے ساتھ ہوتا، اسی لئے انکو ڈنکے والی کہا جاتا تھا۔ قلعہ میں کم رہتی تھیں لال کنوئیں پر نیا محل بنوایا تھا۔ غدر کے بعد وہ محل پٹیالہ والوں کو ملا۔ اب وہ بھی ٹھکانے لگ گیا

کے باہر نکلکر رتھیں تو ترکمان دروازہ کی طرف سے ہوتی ہوئیں قطب کی سڑک پڑلیں۔ اور دوسری سواریاں دروازہ کے باہر ہی ٹھہر گئیں۔

کوئی چار بجے ہوں گے کہ بادشاہ سلامت بیدار ہوے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہوگڑ[1] کا شربت پی کر معدہ صاف کیا۔ خانساماں نے یاقوتی کی سرمہر پیالی پیش کی۔ تھوڑا کریاقوتی نوشجان کی اور فرمایا "اماں سب لوگ سدھارے" عرض کی جہاں پناہ کے اقبال سے سب انتظام ہوگیا۔ میر تزک[2] حاضر ہیں۔ کیا ارشاد ہوتا ہے۔ فرمایا "اچھا بسم اللہ کرو" یہ حکم ہونا تھا کہ بگل ہوا۔ ولیعہد بہادر کے لئے تام جھام۔ مرزا شاہرخ کے لئے تخت رواں مرزا فخرو کے لئے بوچہ اور خود بادشاہ سلامت کے لئے ہوادار دیوان خاص میں آگیا، باقی سب شاہزادے اور سلاطین زادے گھوڑوں پر سوار ہوے۔ ادھر بادشاہ سلامت نے باہر نکل ہوادار میں قدم رکھا اور ادھر چوبدار نے آواز لگائی "ادب تعظیم سے مجرا بجالاؤ۔ حضرت بادشاہ سلامت"، شہزادوں نے تلواریں میان سے نکال سلامی دی۔ دوسرے لوگ جھک کر آداب بجالائے بادشاہ سلامت کے بعد ولیعہد بہادر۔ مرزا شاہ رخ اور مرزا فخرو سوار ہوے۔ ہوادار کے پیچھے ایک خواصی نے چتر شاہی کھولا۔ دوسرے نے سورج مکھی لی۔ اور یہ جلوس آہستہ آہستہ قلعہ کے دہلی دروازہ کی طرف چلا۔ دروازہ کے باہر پہلے سے فوج کی حشل بندھی ہوئی تھی سب سے آگے نشان کا ہاتھی۔ اس پر شاہی پرچم۔ اس کے پیچھے نقارہ کے اونٹ۔ اونٹوں کے بعد ترک[3] سواروں کا رسالہ۔ رسالہ کے بعد روشن چوکی کے تخت۔ تختوں کے پیچھے میر تزک۔ اس کے بعد سلاطین زادوں کی سواریاں۔ شہزادوں کے گھوڑے۔ مرزا فخرو کا بوچہ۔ مرزا شاہ رخ کا تخت رواں۔ مرزا دارا بخت کا تام جھام۔ ان کے پیچھے دورباش[4] اور دورباش کے پیچھے بادشاہ سلامت کا ہوادار ہوادار کے پیچھے فوج کا پرا۔ آخر میں قلعہ کے نوکر، چاکر، بہیر و بنگاہ۔ سڑک کے کنارے کنارے مشعلچیوں کی قطاریں۔ غرض[5] قلعہ کے دلی دروازہ سے جو حشل بندھی تو پرانے کوٹلہ پر جاکر ختم ہوئی۔ سواری قلعہ کے دروازہ سے نکلی ہی تھی کہ شہدوں نے غل مچایا "حضرت پیر و مرشد۔ ہمارا حق بھی ملجائے۔ خدا تعالیٰ عمر و اقبال میں ترقی کرے آمین۔ اور صدوسی سال یہ سایہ دلی والوں کے سر پر قایم رکھے آمین خدا شہزادے

---

[1] بہادر شاہ مرحوم کا دستور تھا کہ صبح اٹھتے ہی گڑ کا شربت پی کر جوں کا توں نکال دیتے تھے۔ اس طرح کل رطوبات فاسدہ خارج ہو کر معدہ صاف ہوجاتا

[2] قلعہ میں میر تزک کا بڑا درجہ تھا۔ دربار اور جلوس کا انتظام اور لوگوں کو باریاب کرانیکی خدمت انہی کے سپرد تھی۔ ایک یہی شخص تھے جنکو دربار میں جریب لیکر کھڑے ہونے کی اجازت تھی۔ ذرا کسی نے آداب شاہی میں اونچ نیچ کی اور انہوں نے کھٹ سے جریب پاؤں پر ماری۔ یہ خدمت سعادت یارخاں رنگین کے خاندان میں مدت تک رہی ہے

[3] دلی کی جو فوج انگریزی لباس اور انگریزی ہتھیاروں سے آراستہ تھی اس کو ترک سوار کہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ترکوں کا بھی یہی فوجی لباس تھا

[4] دورباش ایک خوبصورت رنگین شستیر ہوتا تھا جس پر چھپیاں لگی ہوتی تھی۔ یہ سواری کے آگے آگے رہتا تھا کہ کوئی بادشاہ پر حملہ نہ کر بیٹھے

[5] قلعہ کے دو دروازے ہیں۔ لاہوری دروازہ اور دلی دروازہ۔ شہر پناہ کے دو دروازوں کے بھی یہی نام ہیں۔ لاہوری دروازہ کھاری باؤلی کے کنارہ پر تھا۔ وہ تو زمین کے برابر کردیا گیا۔ ہاں دلی دروازہ موجود ہے۔ فیض بازار کے سرے پر ہے اور اسی میں ہوکر پرانے قلعہ کو سڑک گئی ہے

شہزادیوں کو سلامت رکھے آمین۔ سیر آرہی ہے۔ کچھ ایسا ملے کہ ہم بھی جہاں پناہ کے صدقہ میں سیر کی بہار دیکھ لیں۔" بادشاہ سلامت نے اشارہ کیا۔ خواصی نے مٹھیاں بھر بھر کر روپئے ہوادار پر سے نچھاور کئے۔ پھر کیا تھا۔ روپیوں کے ساتھ شہدے سڑک پر بچھ گئے۔ کسی نے ہاتھ پھیلائے کسی نے جھولی پھیلائی۔ سواری چلنی مشکل ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک یہی ہنگامہ رہا۔ جب دل بھر کر روپیہ لوٹ چکے تو شہدے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئے۔ اور ہوادار آگے بڑھا۔ لوگوں کو پہلے ہی سے خبر ہوگئی تھی کہ آج پچھلی رات کو سواری مبارک قطب جائے گی رات کے بارہ ہی بجے تو خاص بازار سے لگا فیض بازار اور شہر کے دلی دروازہ تک خلقت کا ہجوم تھا۔ بازاروں میں آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ چھتوں اور کمروں پر ہزاروں عورتیں بیٹھی جلوس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہر شخص اپنے بادشاہ کو دیکھنے کے لئے بیچین تھا۔ وقت کم تھا، اس لئے بازاروں میں آئینہ بندی تو نہیں ہوئی تھی، ہاں، بعض بعض مکانوں کے دروازے۔ کمروں کے روکار اور دوکانیں سجا کر روشنی کر دی تھی۔ جلوس آہستہ آہستہ ان سڑکوں پر سے گزرا ایک سناٹے کا عالم تھا۔ مگر ہر شخص کے بشرہ اور آنکھوں سے جوش ٹپک رہا تھا۔ بادشاہ سلامت بھی اس جوش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ایک پھریری سی آئی۔ اور آنکھوں سے خود بخود آنسو نکل کر رخساروں پر بہہ آئے۔ کیا خبر تھی کہ نو برس نہ گذریں گے کہ اسی سڑک پر سے گذرنا ہوگا۔ مگر کس حالت میں کہ سڑک ویران ہوگی۔ دلی والے تباہ ہوں گے۔ گولوں کی مار سے مکانات مسمار ہوں گے اور بیگناہوں کے خون سے زمین رنگین ہوگی۔ اس کے چند ہی دنوں بعد اسی سڑک سے پھر شہر میں داخل ہونا ہوگا۔ مگر کس حالت میں کہ خود قید ہوں گے۔ چاروں طرف جنگی پہرہ ہوگا بیٹوں۔ بھانجوں۔ اور بھتیجوں کی لاشیں میدانوں میں بے گور و کفن پڑی ہونگی۔ محل ویران ہوں گے۔ اور محل والیاں خدا جانے کہاں ہونگی اور کس حالت میں ہوں گی

غرض سواری مبارک ان سڑکوں پر سے گذر کر دلّی دروازہ پہونچی۔ محافظوں نے سلامی دی۔ اور یہ جلوس سلطان جی لہ کی سڑک پر پڑلیا جو زنانہ سواریاں پہلے روانہ ہو کر یہاں ٹھیری ہوئی تھیں وہ بھی جلوس کے آخر میں شریک ہوگئیں۔ کہاروں نے یہاں سے قدم ذرا تیز کر دیئے۔ اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے سواری پرانے قلعہ پہونچ گئی۔ شیر شاہ کی مسجد کے سامنے ہوادار رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے مسجد میں نماز پڑھی۔ وظیفہ پڑھا۔ کوئی گھنٹہ آدھ گھنٹہ قیام کر کے یہاں سے سواری بڑھی، اور ابھی دن پوری طرح نہ نکلا تھا کہ ہمایوں کے مقبرہ پہونچ گئی۔ مقبرہ میں پردہ ہوگیا۔ سواریاں اتریں۔ باہر کے دروازہ سے بادشاہ سلامت کا ہوادار کہاریوں نے سنبھال لیا۔ اور مقبرہ کے دروازہ پر جا لگایا۔ سامنے کے صحن میں پہلے سے فرش ہوگیا تھا۔ مسند بچھی ہوئی تھی۔ بادشاہ سلامت مسند پر جا بیٹھے۔ وظیفہ ختم کیا۔ مقبرہ کے اندر گئے۔ خاندان شاہی کے سیکڑوں لوگ اس مقبرہ کے تہ خانوں میں موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ہر ایک کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی۔ شاہزادے ساتھ تھے۔ سب کو ایک ایک قبر دکھاتے۔ نام بتاتے انکے کارنامے سناتے اپنی اور انکی حالت کا مقابلہ کرتے اور بے اختیار روتے۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر پھر ہوادار میں سوار ہوئے۔ اور جس ترتیب سے یہ قافلہ آیا تھا۔ اسی ترتیب سے آگے بڑھا۔ درگاہ شریف قریب ہی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہونچ گئے۔ دلی والوں کو خاص اس درگاہ سے جو عقیدت ہے وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ کسی قوم اور کسی ملت کا آدمی

لہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کو دلی والے سلطان جی کہتے ہیں انکا مزار مبارک دلی دروازہ سے ۳ میل پر ہمایوں مقبرہ کے بالکل سامنے ہے

نہیں جو اس چوکھٹ پر سر نہ جھکاتا ہو۔ اور کوئی بدنصیب ہی ہوگا جو یہاں سے نامراد جاتا ہو۔ پردہ کا انتظام پہلے سے ہو گیا تھا، ہوادار باولی پر رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے اتر کر وضو کیا۔ شہزادوں نے ہاتھ منہ دھویا۔ شہزادیوں کے لئے باولی کے طاقوں کے سامنے اوٹ لگ گئی تھی۔ کسی نے وضو کیا۔ کسی نے غسل کیا۔ کوئی پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ بادشاہ سلامت وضو کر۔ ہوادار میں آ بیٹھے۔ اردابیگنی نے عرض کی "جہاں پناہ، باولی میں تیرنے کے لئے خداموں کے لڑکے آئے ہیں۔ کیا حکم ہوتا ہے" فرمایا "ہاں اماں۔ ہاں۔ بلاؤ۔ وہ حقدار ہیں اپنا حق لینے آئے ہیں۔ کیوں نہ ملے گا۔ ضرور ملیگا" حکم ہونا تھا کہ سات سات آٹھ آٹھ برس کے بیس پچیس لڑکے اندر آئے۔ مجرا بجالائے۔ اجازت چاہی اور گنبد پر چڑھ گئے۔ سیڑھیوں پر سے بیگمات اور شہزادیوں نے باولی میں روپے پھینکنے شروع کئے۔ ادھر روپیہ گرا۔ اور ادھر کوئی نہ کوئی لڑکا گنبد پر سے کودا۔ ڈبکی لگائی۔ اور روپیہ نکال لایا۔ تھوڑی دیر تک یہی تماشہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد سب کے سب درگاہ شریف میں گئے۔ پہلے حضرت امیر خسروؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ وہاں سے حضرت سلطان جی کے مزار پر آئے۔ بادشاہ سلامت تو اندر چلے گئے۔ عورتوں نے گنبد شریف کے دروازے پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ کسی نے زنجیر پکڑ کر دعا مانگنا شروع کی۔ کسی نے چوکھٹ کی مٹی لے کر منہ پر ملی۔ کسی نے گود پھیلا کر دل ہی دل میں دعا مانگی۔ کوئی فاتحہ پڑھ پہلو کی مسجد میں جا نفل پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ کسی نے مسجد میں کلام مجید کی تلاوت شروع کی۔ کسی نے مسجد کے کٹورے کا قصہ شروع کیا۔ "دیکھا بوا۔ یہ کٹورہ سونے کا ہے۔ بڑا بھاری ہے۔ کئی سیر کا ہوگا۔ یہ سامنے جو تسبیح خانہ ہے۔ اسمیں بھی ایک ایسا ہی کٹورہ لٹکا ہوا تھا۔ ——

دادا جان کے زمانہ میں ایک بڑھیا مصیبت کی ماری درگاہ شریف میں آئی اور عرض کی یا حضرت سات بیٹیاں ہیں۔ کھانے کو پیسہ پاس نہیں۔ یہ پہاڑ کیونکر اٹھیں گے۔ آپ ہی یہ مشکل آسان کیجئے۔ وہاں سے اٹھ جو تسبیح خانہ میں آئی۔ تو کٹورہ گنبد سے اتر اس کی گود میں آ گیا۔ خوشی خوشی گھر آئی۔ بڑی دھوم دھام سے بیٹیوں کی شادیاں رچائیں۔ مزے سے ہنسی خوشی رہنے لگی۔ دلی کے ایک امیر تھے انکو جو یہ خبر ہوئی۔ تو انہوں نے بھی درگاہ شریف میں جا کر دعا مانگی۔ وہاں سے اس مسجد میں آئے بڑی دیر تک کٹورے کو دیکھتے رہے۔ کٹورہ جہاں تھا وہیں رہا۔ جل گئے۔ مزدوروں کو بلوا پاڑ باندھی۔ جتنی پاڑ اونچی ہوتی۔ کٹورہ اونچا ہوتا جاتا۔ پاڑ گنبد کی چھت تک پہونچی تو کٹورہ غائب ہو گیا۔ ادھر پاڑ کھلی کٹورہ اپنی جگہ پر آ موجود ہوا۔ سچ ہے لالچ بری بلا ہے۔ کٹورہ تو کیا ملتا۔ پاڑ باندھنے کا خرچ مفت گلے پڑا۔"

بادشاہ سلامت فاتحہ سے فارغ ہو۔ درگاہ شریف سے باہر آئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے مزار۔ مرزا جہانگیر[۱]۔ مرزا نیلی[۲] اور جہاں آرا بیگم[۳]

---

[۱] مرزا جہانگیر وہی شہزادے ہیں۔ جنکی وجہ سے پھول والوں کی سیر قایم ہوئی تھی۔ واپس آنے کے بعد انہوں نے پھر بے اعتدالیاں کیں پھر الہ آباد بھیجدیے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ نواب ممتاز محل نے انکی لاش الہ آباد سے دلی منگوائی اور سلطان جی میں ایک نہایت خوبصورت سنگ مرمر کا محجر بنوا دفن کر دی۔

[۲] مرزا نیلی شاہ عالم ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ انتقال کے بعد انکو بھی مرزا جہانگیر کے محجر میں دفن کیا گیا۔

[۳] جہاں آرا بیگم شاہجہاں بادشاہ غازی کی بیٹی تھیں۔ حضرت سلطان المشائخ سے بڑی عقیدت تھی۔ انکا مزار درگاہ کے پائنتی

(باقی آئندہ صفحہ پر)

کی قبر پر گئے۔ فاتحہ پڑھی۔ یہاں سے پھر باولی پر آئے۔ خادموں کو انعام دیے۔ فقیروں کو خیرات تقسیم کی۔ اور وہاں سے نکل منصور کے مقبرہ کی سیدھی سڑک پر ہولئے۔ یہاں دو ڈھائی گھنٹہ آرام کیا۔ خاصہ تناول فرمایا۔ کوئی چار بجے یہاں سے روانہ ہو۔ شام ہوتے ہوتے قطب پہونچ گئے۔ جنگلی محل اور مرزا بابر[1] کی کوٹھی پہلے سے آراستہ تھی جو سواریاں سیدھی قطب آئی تھیں انہوں نے سب سامان قرینہ سے جمادیا تھا۔ خاصہ تیار تھا۔ دن بھر کے سب تھکے ماندے تھے۔ کھا۔ پی۔ نماز پڑھ ایسے سوے کہ جب چار بجے کی نوبت بجی اسوقت کہیں جاکر آنکھ کھلی۔

جنگلی محل اب تو واقعی جنگلی محل ہے۔ ہاں کسی زمانہ میں بڑا غدار محل تھا۔ پہلے ہی کچھ کم بڑا نہ تھا۔ بہادر شاہ نے دیوان خاص۔ دیوان عام۔ خاص محل اور باب ظفر بنواکر اسکو اور بڑا کر دیا۔ دروازہ کیا ہے۔ خود ایک چھوٹا سا محل ہے۔ سرتاپا سنگ سرخ کا ہے۔ ردکار پہ سنگ مرمر کی پٹیاں۔ حاشیہ اور پھول دیکر اسکی رونق کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔ دروازہ کی بلندی کوئی ۱۶-۱۷ گز ہے۔ پہلو میں سیڑھیوں کا چکردار زینہ ہے۔ محراب کے عین اوپر شاہی بارہ دری ہے۔ یہیں سے بیٹھ کر بادشاہ سلامت اور بیگمات پنکھوں کا تماشہ دیکھتے تھے۔ دروازہ سے ملا درگاہ شریف کا دروازہ ہے جھرنے سے پنکھے اوٹھ کر ادھر آتے۔ پہلے دن جوگ مایاجی کا پنکھا اٹھتا۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا۔ درگاہ شریف کا پنکھا تو برابر والے دروازہ سے مزار شریف پر چلا جاتا۔ جوگ مایاجی کا پنکھا شاہی دروازہ کے سامنے کچھ دیر رکتا اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں کے مکان کے سامنے سے ہوتا ہوا مندر چلا جاتا۔ باب ظفر کے اندر کا حصہ دیکھنے کے قابل ہے بڑے پھاٹک سے لگا کر اندر محل تک سات ڈیوڑھیاں ہیں۔ ہر ڈیوڑھیوں پر پہرہ داروں کے لئے سہ دریاں بنی ہوئی ہیں پھاٹک پر تو دگلہ پلٹن کا پہرہ رہتا۔ اندر کی ڈیوڑھیوں پر ترکنوں[2]۔ قلماقنیوں[3]۔ اردابیگنیوں[4]۔ شدنوں[5] اور گرجنوں[6] کی نشست ہوتی۔ بھلا کیا

---

ایک سنگ مرمر کے محجر میں ہے۔ سرہانہ کتبہ لگا ہوا ہے۔ کتبہ کا یہ شعر بڑا دردناک ہے :-

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا  کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

[1] مرزا بابر اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ انکی ایک بڑی کوٹھی انگریزی وضع کی ابتک قطب میں موجود ہے۔ اسکا ایک دروازہ تو درگاہ شریف میں ہے دوسرا جنگلی محل میں۔ اور تیسرا جنگل میں جھرنے کی طرف نکلتا ہے۔

[2] آخر زمانہ میں ترکستان۔ حبش اور گرجستان سے عورتوں کی آمد بند ہو گئی تھی۔ پہلے سے جو خاندان دلی میں بس گئے تھے انہیں میں سے یہ پلٹنیں بھری جاتیں۔ لباس ان سب کا مردوں کا سا ہوتا تھا۔ یہ سب مردانہ کرتب جانتی تھیں انکا کام محلوں میں پہرہ دینا تھا۔

[3] قلماقنیاں پہرہ دینے اور حکم احکام پہونچانے پر مقرر تھیں۔ انکے لباس کا ذکر اوپر آچکا ہے ان عورتوں کو شادی کرنا حکماً ممنوع تھا۔

[4] اردابیگنیاں بھی محل کا انتظام کرتیں اور شاہی حکم احکام باہر پہنچاتی تھیں۔ انکا صرف مردانہ لباس ہی نہ ہوتا تھا بلکہ نام بھی مردوں کے سے ہوتے تھے۔ گفتگو بھی مردوں کی طرح کھری کھری زبان میں کرتی تھیں۔ تھیں تو عورتیں مگر شکل صورت وضع قطع چال ڈھال سے بالکل مرد معلوم ہوتی تھیں۔ دلی میں انکو "ہتو ابیگنیاں" کہتے تھے۔ پھر یہ لفظ اردو میں ایسی لڑکیوں کے لئے استعمال ہونے لگا جو بڑی شریر اور ڈنگی ہوں اور جنپر سودا کا یہ شعر صادق آتا ہو ؎

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے  نہ کہ لونڈوں میں جاکے ڈنڈ پیلے

مجال کہ محل میں پرندہ پر تو مار جائے۔ پھاٹک سے گھستے ہی الٹی طرف پہلی ڈیوڑھی کے پاس سے مردانہ کو راستہ جاتا تھا غرض اس محل میں اتنی گنجائش تھی کہ سارا قلعہ اس میں سما جاتا۔ اور پھر بھی جگہ رہتی۔ اب مردانے اور زنانے سب مکانات ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گئے۔ ایک باب ظفر رہ گیا ہے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس محل کا یہ دروازہ ہے وہ محل کیا ہوگا۔ بادشاہ کی کہی ہوئی تاریخ دروازہ کی رو کار پر کندہ ہے۔

ایں درِ عالی چو شد مکرم بنا حسب المراد

گفت دل۔ سال بنا۔ باب ظفر پائندہ باد

سنہ ۱۱ جلوس ——————— ۱۲۶۴ھ

زمانہ کے ہاتھوں اس دروازہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو اندر کے محلوں کا۔ وہ تو کہو محکمۂ آثار قدیمہ نے اس کو اپنی نگرانی میں لے کر سنبھال لیا

خیر۔ تو۔ صبح کی نوبت بجی تھی کہ محل میں چہل پہل شروع ہوئی۔ منہ ہاتھ دھو، کپڑے بدل نماز پڑھ ناشتہ کر سب شہزادے شہزادیاں بادشاہ سلامت کے سلام کو آئیں۔ مطلب یہ تھا کہ چلئے۔ یہاں بیٹھنے تھوڑی آئے ہیں۔ جہاں پناہ بھی وظیفہ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ سب کا سلام لیا۔ دعائیں دیں۔ ان سب کا مطلب سمجھ گئے۔ فرمایا "کہو اماں۔ کہاں کا ارادہ ہے۔ جھرنے کا یا قطب صاحب کی لاٹ کا" سب نے عرض کی "پیر و مرشد۔ پہلے جھرنے تشریف لے چلئے۔ ابر آیا ہوا ہے۔ اسوقت جھرنے پر بہار ہوگی" فوراً اردا بیگنی کو پردہ کرانے کا حکم دیا گیا۔ دگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے ناکہ بندی کر دی۔ اردا بیگنیوں اور قلماقنیوں نے راستہ کا انتظام کیا۔ شدنیں اور گرجنیں بیگمات اور شہزادیوں کے ہمراہ ہوئیں۔ ماماؤں۔ اصیلوں۔ خواصوں اور سریتوں کا غول کا غول نکلا۔ اور سیدھا جھرنے کا رخ کیا۔ شہزادیوں نے پہلے درگاہ شریف میں حاضری دی۔ وہاں سے مرزا بابر کی کوٹھی میں سے ہو جنگل میں نکل گئیں۔ پہلے جہاز[1] پر جا کر ذرا دم لیا۔ شمسی تالاب کا لطف اٹھایا۔ میلوں تک پانی ہی پانی تھا۔ برجی[2] بیچ میں آ گئی تھی۔ پانی کا یہ عالم دیکھ کر بہتوں کے جی میں آیا کہ کود پڑیں۔ پھر خیال آیا کہ بادشاہ سلامت سے اجازت لئے بغیر پانی میں ترنا ٹھیک نہیں۔ جھکی ہو رہیں۔ تھوڑی دیر یہاں ٹھیر کر سب کے سب اولیا[3] مسجد پہونچے۔ مصلوں پر نفل پڑھے، اتنے میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آ گئی۔ شہزادے ساتھ تھے۔ آگے آگے سواری چلی۔ پیچھے پیچھے۔ عورتوں کا یہ غول روانہ ہوا۔ اولیا مسجد سے جھرنہ دور ہی کتنا ہے۔ تھوڑی دیر میں سب کے سب وہاں پہونچ گئے۔

[1] شمسی تالاب کے کنارے جہاز کی شکل کی ایک بہت بڑی اور خوبصورت عمارت قدیم زمانہ کی بنی ہوئی ہے۔ اس عمارت کو جہاز کہتے ہیں

[2] اسی تالاب کے بیچ میں ایک چھوٹا سا کھلا ہوا برج ہے اور برج کے نیچے ایک سنگ خارا پر گھوڑے کے سم کا نشان ہے۔ اس سم کے نشان کے متعلق عجیب عجیب روایتیں مشہور ہیں۔ عام طور سے اسکو براق کا سم کہتے ہیں۔ کنارے سے برجی اتنی دور ہے کہ وہاں تک جاتے جاتے اچھے اچھے تیراکوں کے دم ٹوٹ جاتے ہیں

[3] یہ ایک چھوٹی سی مسجد شمسی تالاب کے کنارے پر ہے۔ صحن میں دو مصلے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان مصلوں پر حضرت معین الدین اجمیریؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نماز پڑھا کرتے تھے

جسنے پہلے زمانہ کا جھرنہ نہیں دیکھا۔ اس نے دلّی میں کچھ خاک نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بہشت کا ایک کونہ کاٹکر مہرولی[1] میں جوڑ دیا ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ یہ بنا کس لئے تھا اور ہو کیا گیا۔ فیروز شاہ تغلق نے شمسی تالاب کا بند باندھ کر اسکا پانی نوکھی نالہ میں ڈالا تھا۔ اور اس نالہ کو تغلق آباد کے نالوں سے ملا دیا تھا۔ تاکہ قلعہ میں پانی کی قلت نہ ہو۔ تغلق آباد ویران ہوگیا۔ نالہ ٹوٹ گیا۔ تالاب کا پانی جنگل میں بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر ۱۷۰۰ء میں نواب[2] غازی الدین فیروز جنگ بہادر نے شمسی تالاب کے بند کے سامنے حوض بنوائے۔ نہریں نکالیں۔ فوارے لگائے اور اس ٹکڑے کو بہشت کا نمونہ کردیا۔ رفتہ رفتہ یہاں بارہ دریاں۔ دالان اور مکانات بن گئے چاردیواری کھنچ گئی۔ درخت بڑھ کر جھرنے پر چھپتر ہو گئے۔ اور تھوڑے دنوں میں یہ جگہ کچھ کی کچھ ہوگئی۔ بند سے سوتوں کی شکل میں پانی جھر جھر کر یہاں آتا تھا۔ اس لئے اس مقام کا نام جھرنہ ہوگیا۔ بند سے ملا ہوا جو سہ درہ دالان ہے وہ ہی جھرنے کی جان ہے۔ دالان کی چھت اندر سے کھوکھلی ہے۔ بند کا پانی پہلے چھت میں آتا ہے چھت میں درزیں چھوڑ دی ہیں۔ درزوں میں سے پانی اسطرح گرتا ہے گویا دالان میں مینھ برس رہا ہے۔ دالان کے سامنے کی جو دیوار ہے۔ اسمیں چراغ رکھنے کے لئے سیکڑوں طاق بنے ہوئے ہیں۔ چراغوں کے سامنے پانی کی چادر گرتی ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے یا تو پانی میں آگ لگادی ہے۔ یا سونا پگھل پگھلکر برس رہا ہے۔ چھت کی منڈیر کے نیچے ۱۳ پرنالے ہیں۔ پرنالوں میں سے ہوکر پانی چھجے پر آتا ہے۔ چھجے کے نیچے ایک بڑا حوض ہے۔ پرنالوں کا پانی چھجے پر پھیل کر اس زور سے حوض میں گرتا ہے گویا دھواں دھار بارش ہورہی ہے۔ حوض کے سامنے ۸ گز لمبی۔ ۲ گز چوڑی اور گز بھر گہری ایک نہر ہے۔ حوض کا پانی ابل کر اس نہر میں آتا ہے۔ جہاں نہر ختم ہوئی ہے وہاں سلامی کے پتھر دے کر ایک چادر سی بنادی ہے۔ اس سلامی کے پتھروں پر ایسی اچھی منبت کاری کی ہے کہ پانی کے بہنے سے چادر پر مچھلیاں سی تڑپتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس چادر کے نیچے شمال اور جنوب سے دو نہروں کے پانی اور آن ملے ہیں۔ آگے چلکر یہ پانی پھر تین نہروں میں بٹ جاتا ہے۔ بڑی نہر تو بارہ دری کے منڈوے کے نیچے سے چلی گئی ہے۔ اور چھوٹی دونوں نہریں چکر کھاکر منڈوے کے دونوں طرف سے چاردیواری کے باہر نکل جاتی ہیں۔

محمد شاہ کے زمانہ سے لگا کر بہادر شاہ تک شاید ہی کوئی دلّی کا بادشاہ ہوگا جس نے جھرنہ میں کوئی نہ کوئی عمارت نہ بنوائی ہو۔ خود بہادر شاہ نے تو بڑی نہر کے اوپر بارہ دری کا منڈوا[3] بنوایا۔ شاہ عالم ثانی نے جنوب کی طرف پنج درہ دالان نکالا۔ اکبر شاہ ثانی نے

---

[1] مہرولی ہی کو قطب کہتے ہیں۔ یہ دلّی سے گیارہ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں یہاں خاصی رونق ہوگئی تھی۔ وہ قطب کے عاشق تھے۔ جہاں ذرا ابر آیا اور انکی سواری قطب چلی۔ کہا کرتے تھے کہ ابر ہمارے قطب جانیکا نقیب ہے۔

[2] نواب غازی الدین فیروز جنگ شاہان دھلوی کے وزیر اور آصف جاہ اول کے فرزند تھے۔ یہ وہ غازی الدین فیروز جنگ نہیں ہیں جنھوں نے عالمگیر شاہ ثانی کو کوٹلہ میں شہید کرایا تھا۔

[3] اس بارہ دری کی چھت نہیں ہے۔ بلکہ ٹٹیاں لگا کر اوپر پھولوں کی بیلیں چڑھادی ہیں پھول کھلنے سے ساری چھت ڈھک جاتی ہے

شمال کی جانب دھر ادالان تعمیر کیا۔ بیچ میں جو جگہ رہی تھی اس میں بہادر شاہ نے سنگ سرخ کی بارہ دری بنوا کر جھرنہ کی عمارتوں کو مکمل کر دیا۔

جھرنہ کے قریب ہی دو چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک "پھسلنا پتھر" دوسرے "امریان" "پھسلنا پتھر محمد شاہ بادشاہ کی جدت پسند طبیعت کی یادگار ہے۔ یہ پتھر کوئی سوا چھ گز لمبا اور ۲ ۱/۲ گز چوڑا ہے۔ اور جھرنہ کی مشرقی دیوار سے ملا کر اسکو ذرا جھکا ہوا گاڑ دیا ہے۔ یہ پتھر اس بلا کا چکنا ہے کہ ذرا کوئی بیٹھا اور پھسلا۔ پھول والوں کی سیر میں لوگوں کا، سپر چڑھنا اور پھسلنا ایک تماشہ ہوجاتا ہے۔ اسی پتھر کے استعارہ سے ذوق نے یہ شعر کہا ہے۔

میں کہاں سنگ در یار سے ٹل جاؤنگا ۔۔۔ کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤنگا

بارہ دری کے منڈوے سے ملا ہوا۔ جھرنہ کا دوسرا دروازہ ہے اور اس کے باہر امریاں۔ آموں کے درخت تو ہر جگہ ہوتے ہیں مگر یہاں کے درختوں پر کچھ اور ہی بہار ہے۔ جھرنہ کے پانی سے بارہ مہینے سر سبز رہتے ہیں۔ اور اتنے گھنے ہو گئے ہیں کہ آسمان بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔ ادھر انکی سبزی۔ ادھر نیچے گھاس کی سبزی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین اور آسمان سبز مخمل کے بن گئے ہیں۔ جھرنہ میں چادروں کا گرنا۔ فواروں کا اچھلنا۔ پانی کا بہنا اگر "جنت نگاہ" ہے تو امریوں میں موروں کی جھنگار۔ پپیہے کی پکار۔ اور کوئل کی کوکو "فردوس گوش" ہے۔ غرض جھرنہ ایک عجیب چیز تھا کہ ہر موسم میں نیا لطف دکھاتا تھا۔ اور ہر شخص کو نئی لذت بخشتا تھا۔ اب اسکی بھی بہار گئی۔ شمسی تالاب کٹ چھنٹ کر حوض بنگیا۔ بند اس سے دور جا پڑا۔ پانی کا رسنا موقوف ہوا۔ نہریں خشک ہوگئیں۔ حوض ملبہ سے اٹ گئے۔ درخت سوکھ ساکھ کر کٹ گئے۔ پھسلنا پتھر ٹوٹ کر ٹکڑے ہوگیا۔ ہاں عمارتیں کھڑی رہ گئیں ہیں۔ کچھ دنوں میں ان کا بھی وقت آ لگے گا۔ اس کے بعد جھرنا اور امریوں کا بس نام ہی نام رہ جائیگا۔ سچ ہے:۔

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

تو ہاں۔ بادشاہ سلامت کے جھرنے پہونچتے ہی قلماقنیوں نے شاہی پنگوڑا لا کر اسمیں مسند بچھادی۔ ہوادار پنگوڑے کے پاس جا لگا۔ بادشاہ اتر اسمیں جا بیٹھے۔ دو خواصیں مورچھل لے پیچھے جا کھڑی ہوئیں۔ دو نے آہستہ آہستہ پنگوڑے کو ہلانا شروع کیا تھوڑی دیر آرام لینے کے بعد بادشاہ سلامت نے فرمایا "کھوااں۔ کیا ارادہ ہے۔ اب تیرنا ہوتا ہے یا جھولا جھولنا۔ اچھا کچھ جھرنہ میں رہو۔ کچھ امریوں میں چلو۔ یہاں کا بھی لطف اٹھاؤ اور وہاں کا بھی مزا دیکھو۔ لو۔ ہم تو امریوں میں جاتے ہیں" یہ کہہ بادشاہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ٹہلتے ٹہلتے بارہ دری کے دروازہ سے امریوں میں آ گئے۔ یہاں پہلے سے سب انتظام ہوگیا تھا۔ ایک طرف

---

لہ قلعہ میں شہزادے اور شہزادیاں دونوں کو مردانہ فن اور کرتب سکھائے جاتے تھے۔ شاید ہی کوئی ہوگا جس کو تیر چلانا تلوار مارنا۔ بندوق چلانا۔ سوار ہونا اور تیرنا نہ آتا ہو۔ بابر بادشاہ کے زمانہ سے یہ خاندان پانی کا عاشق ہے۔ قلعہ ہی کو دیکھو تو آدھا قلعہ نہروں اور حوضوں نے گھیر لیا ہے

بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم کے تخت بچھ گئے تھے۔ دوسری طرف شہزادیوں کے لئے دری۔ چاندنی اور قالینوں کے فرش کر کے تکیے لگا دیئے گئے تھے۔ درختوں میں بیسیوں جھولے پڑ گئے تھے۔ پہلے بادشاہ سلامت تخت پر بیٹھے۔ اس کے بعد سب سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ انتظار تھا کہ کب حکم ہو اور کب جھولوں پر جائیں۔ بادشاہ نے فرمایا "واہ۔ جی واہ خالی جھولا کیسا۔ کڑھائی چڑھاؤ۔ جھولتے جاؤ۔ کھاتے جاؤ"۔ تاج محل[1] نے عرض کی "جہاں پناہ ہم پہلے ہی سے یہ انتظام کر کے آئے ہیں۔ حکم کی دیر ہے ابھی سب کچھ ہوئے جاتا ہے" یہ کہہ لونڈیوں کی طرف دیکھا۔ وہ تو حکم کی منتظر ہی کھڑی تھیں۔ ذراسی دیر میں بیسیوں کڑھائیاں آگئیں درختوں کی جڑوں میں چولھے لگ گئے۔ کسی کسی بیگم کے سامنے انگیٹھی آگئی۔ اب ہے کہ کوئی تو میٹھا بیسن پھینٹ رہا ہے۔ کوئی گلگلوں کے آٹے میں کھانڈ ملا رہا ہے۔ کوئی سہال اور اندرسے تلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ کوئی اندرسہ کی گولیوں کا سامان نکال رہا ہے۔ کوئی چھاج پر کھجوریں بنا رہا ہے۔ غرض تھوڑی دیر میں خاصہ بازار سا لگ گیا۔ جب سب سامان سے لیس ہو گئے۔ تو ایک نے بڑھ کر بادشاہ سلامت سے عرض کی "حکم ہو تو کڑھائی میں گلگلہ پڑے" فرمایا "نہیں اماں، ابھی نہیں جھولوں پہ لوگ بیٹھ لیں اسوقت پکوان شروع ہو" یہ کہہ نواب زینت محل اور نواب تاج محل کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں کھڑی ہو گئیں۔ تاج محل تو ایسی خوبصورت نہ تھی ہاں زینت محل کی کچھ نہ پوچھو۔ عجیب قبول صورت پائی تھی۔ شہر بھر میں ایک تھیں۔ انکی جامہ زیبی اور حسن کی تعریف ہی سن کر بادشاہ نے ان سے شادی کی تھی۔ رنگت ایسی سرخ و سفید تھی جیسے گلاب کی پتی۔ یا شہاب اور میدہ۔ کتابی چہرہ۔ بڑی۔ بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک۔ ہاں بھویں بالکل نہ تھیں۔ اس کمی کو سرمہ کی بھویں بنا کر پورا کیا جاتا۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں سر پہ تاروں بھرا گلنار دوپٹہ۔ جسم پر سرخ انگیا۔ کرتی۔ بادن کلی کا سبز زربفت کا پیجامہ۔ موتیوں جڑی گھیتلی جوتی۔ آنکھوں میں گہرا گہرا سرمہ دانتوں میں مسّی۔ ہونٹوں پہ لاکھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پرستان کی پری امریوں میں اتر آئی ہے۔ زینت محل نے تاج محل کو ناک بھوں چڑھا کر دیکھا۔ تاج محل نے زینت محل کو برے برے دیدوں سے گھورا۔ حکم سے لاچار تھیں۔ بادشاہ سلامت کے سامنے جو جھولا تھا۔ اس کے لال سبز ریشم کے رسے اور گنگا جمنی پٹریاں تھیں۔ دونوں اٹھ اس میں جا بیٹھیں۔ زینت محل نے پاؤں جوڑے تاج محل نے جھونکے لینے شروع کئے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا "واہ جی۔ واہ۔ ایسا سوتا جھولا ہمکو تو پسند نہیں۔ بی ٹرمنھی[2] خانم اور دلدارا[3] کو بلاؤ۔

---

[1] نواب تاج محل کا قلعہ میں بڑا زور تھا۔ تھی تو ڈومنی مگر جب سے بادشاہ نے اسکو محل میں داخل کیا تھا اسوقت سے بادشاہ اسکی مٹھی میں آ گئے تھے۔ بغیر اس کے حکم کے قلعہ میں پتا تک نہیں ہل سکتا تھا۔ آخر نواب زینت محل نے اسکا کفر توڑا۔ قلعہ سے نکالی گئی۔ اور ایسی نکالی گئی کہ پھر قلعہ کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

[2] [3] میں نہیں جانتا کہ اس لفظ کی املا ہے۔ ٹرمنھی کے معنی ٹیڑھے منھ والی۔ لقوے سے اسکا منھ ذرا پھر گیا تھا جو املا میری سمجھ میں آئی وہ میں نے لکھدی۔ جو آپکی سمجھ میں آئے وہ پڑھ لیجئے۔ ٹرمنھی خانم غضب کی گانے والی تھی۔ تان رس خاں بھی اس سے ذرا کنیاتے تھے۔ آخر اس سے لڑ کر نکل گئے۔ بادشاہ کی غزلیں حضوری میں یہی گاتی تھی۔ دلدارا اسکی چھوٹی بہن تھی دونوں ڈیرہ دار رنڈیاں تھیں بڑی بہن کی نواسی دونی جان اور چھوٹی بہن کی نواسی کالی جان ابتک دلّی میں موجود ہیں

(पुस्तकालय)

بھلا بیگمات جھولیں اور یہ دونوں جھرنے میں نہاتی رہیں" یہ سنتے ہی دوار دا بیگنیاں جا دونوں کو جھرنے میں سے پکڑ لائیں۔ دونوں بیچاریاں جھرنے میں نہا رہی تھیں۔ سارے کپڑے شور بور تھے۔ پہلے تو سامنے آتے ذرا جھجکیں۔ مگر جب بادشاہ سلامت نے خود فرمایا "آؤ۔ اماں۔ آؤ قطب کی بہار یہی ہے" تو اسوقت ذرا ہمت بڑھی۔ کپڑے نچوڑتی ہوئی دونوں جھولے کے ادھر ادھر کھڑی ہو گئیں۔ اور شہزادیاں بھی آواز ملانے لگیں۔ ادھر انہوں نے ملار شروع کیا اور ادھر کڑھائی میں گلگلہ پڑا۔ بی ٹرمنھی خانم اور دلدارا تو خیر رنڈیاں تھیں۔ تاج محل ڈومنی تھیں مگر شہزادیوں کی آوازیں بھی رس میں کچھ ان سے کم نہ تھیں۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ سے شاید ہی کوئی محل والی ہوگی جو گانا نہ جانتی ہو۔ تان رس خاں اسی لئے نوکر تھے۔ تاج محل اسی لئے محل میں آئیں۔ بی ٹرمنھی خانم اور دلدارا کی اسی گانے سے بادشاہ کے حضور میں رسائی ہوئی۔ اب جھولے کے ساتھ گانا شروع ہوا:۔

جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں جھولا کن ڈارو۔ رے۔ امریاں

رین اندھیری۔ تال کنارے۔ مرلا جھنکارے۔ بادل کارے۔ بوندیاں پڑیں جھنیاں۔ جھنیاں۔

جھولا کن ڈارو۔ رے۔ امریاں

دو سکھی جھولیں۔ دو ہی جھلائیں۔ چار مل گیاں۔ بھول بھلیاں۔ جھولا کن ڈارو۔ رے۔ امریاں

وہ نور کے گلے۔ وہ رسیلی آوازیں۔ وہ اونچی تانیں۔ وہ وقت کی راگنی۔ وہ سہانا وقت۔ پتے پتے اور ٹہنی ٹہنی سے "جھولا کن ڈارو رے۔ امریاں" کی آواز آرہی تھی۔ مور درختوں سے اتر جوش میں آسامنے ناچنے لگے۔ درختوں کے جانور چہکنے لگے۔ پھیئے کی پیہو اور کوئل کی کوکو سے سارا جنگل گونج اٹھا۔ غرض ایسا سماں بندھا کہ ایکدفعہ ہی فراٹے سے مینھ کا چھینٹا آیا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا "واہ۔ اماں۔ واہ۔ قطب میں مینھ سے بھاگتے ہو۔ بھادوں کا چھینٹا ہے۔ ابھی برسا۔ ابھی نکل گیا۔ ہاں بی دلدارا۔ کوئی اور چیز ہو جائے۔ اور ہاں تم سب لوگ ایک ہی جھولے کو کیوں گھیرے کھڑے ہو۔ دوسرے جھولوں پر جاؤ۔ گاؤ۔ بجاؤ۔ کھاؤ۔ پیو۔ کچھ لطف اٹھاؤ" یہ سننا تھا کہ جھولوں کی طرف سب دوڑ پڑے — دو چار جھولوں پر تو بچوں نے قبضہ کر لیا جو باقی رہ گئے ان پر شہزادیاں ہو بیٹھیں۔ جب ذرا یہاں چھیڑ ہوئی تو دلدارا نے دوسری چیز شروع کی۔

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ میں جوگن تیرے ساتھ

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا بجائے بین۔ بانسری۔ جوگیا بجائے بین۔ بانسری۔ جوگن گائے ہے ملار۔ سنو سکھی سیاں —— جوگیا ہو گئے

جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگن نے چھایا ہے بدیس۔

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے —

جوگیا نے پہنے لال کپڑے۔ جوگیا نے پہنے لال کپڑے۔ جوگن کے لمبے لمبے کیس۔ سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔

اب کیا پوچھتے ہو۔گرم گرم پکوان آرہا ہے۔کھا رہے ہیں۔جھولا جھول رہے ہیں۔کوئی اندرسہ کی گولیاں منہ میں دبائے ہے۔کسی کے منہ میں سُہال کا ٹکڑا ہے۔کسی کے حلق میں بیسن کی پھلکی پھنس گئی ہے۔سانس رکا جاتا ہے۔مگر ملار ہے کہ چل رہا ہے۔مینھ برس کر نکل گیا تھا۔پھر بھی پانی کی بوندیں درختوں میں سے ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ادھر بوند کڑاہی میں گری تیل اڑا اور ادھر کسی نہ کسی کے منہ سے "اوئی" کی آواز نکلی۔کسی کے ہاتھ پر چھینٹا پڑا تو کسی کے منہ پر۔کوئی تو "اوئی توبہ ہے" کہہ کر رہ گئی۔کوئی کلہ سہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔دوسروں نے پھر پکڑ یہ کہہ بٹھلا لیا "واہ بوا نوج کوئی ایسا نازک بنجائے۔چھینٹا پڑتا ہی ہے۔یوں کڑھائی چھوڑ کوئی نہیں اٹھ کھڑا ہوتا"۔

بچوں کے جھولے پر کچھ اور ہی مزا تھا۔پکوان کی سب سے زیادہ کھسیٹ یہیں تھی۔دو جھولے تو لڑکوں کے قبضہ میں تھے۔باقی پر لڑکیاں جھول رہی تھیں۔لڑکے تو جھولے میں کھڑے ہو وہ لمبے لمبے پینگ بڑھا رہے تھے کہ خدا کی پناہ۔ہاں لڑکیاں جھولوں میں چھوٹی چھوٹی لال سبز پٹریاں ڈالے پاؤں جوڑے جھول رہی تھیں۔وہ بے سرا ملار چل رہا تھا کہ واہ جی واہ۔کسی کی تان کدھر جاتی تھی کسی کی کدھر۔لڑائی بھی ہوتی جاتی تھی۔کہ "لو بوا بس اترو۔بہت جھول چکیں اب ہماری باری ہے"۔لیکن گانے کا سلسلہ نہ ٹوٹتا تھا گیت بھی بڑے مزے کا تھا۔ذرا سنئے:-

اماں۔اڑہ جامن گھلے دھرے ——— اماں۔میں نہیں کھاتی میری ماں

اماں تتا پانی بھرا دھرا ——— اماں۔میں نہیں کھاتی میری ماں

اماں۔دھانی جوڑا اسلا دھرا ——— اماں۔میں نہیں پہنتی میری ماں

اماں۔بھائی بھاوج ملن کھڑے ——— اماں۔میں نہیں ملتی میری ماں

غرض پھوپھا۔پھوپھی سے لگا ماماؤں اور ناناؤں تک سب ملنے کو کھڑے ہیں۔مگر لڑکی کسی سے ملنے کا نام نہیں لیتی۔آخر تان اس پہ ٹوٹی تھی کہ:-

اماں ساجن ڈولا لئے کھڑا ——— اماں۔میں نہیں جاتی میری ماں

یہاں تو یہ ہو رہا تھا۔اور وہاں جھرنہ پر کچھ اور ہی بہار تھی۔بادشاہ سلامت جھرنہ سے نکل ادھر امریوں میں آئے اور ادھر شہزادیوں نے کواڑ بند کر۔ڈھیلے پائجامے اتار تنگ پائجامے پہن دھم سے جھرنہ میں غوطہ مارا۔کوئی ڈبکیاں لگا رہی ہے۔کوئی تیر رہی ہے۔کوئی کمر کمر پانی میں کھڑی چھینٹے اڑا رہی ہے۔نیچے اتھل نہروں میں کھڑے اودھم مچا رہے ہیں۔کچھ حوض کے سہ درہ دالان میں کھڑی نہا رہی ہیں کچھ بیلوں پر تھر سے پھسل رہی ہیں۔نیچے گر کر قلا بازیاں کھاتی ہیں۔کیچڑ میں لت پت ہوتی ہیں۔حوض میں آکر کود پڑتی ہیں ———

نہانے والیاں غل مچاتی ہیں "نکلو جی نکلو۔سارا پانی گدلا کر دیا"۔غرض ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں ایسا مست تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔اتنے میں پرچہ لگا کہ حضرت جہاں پناہ ناظر کے باغ تشریف لے جا رہے ہیں۔اب کیا تھا۔سب نے پانی میں سے نکل جھٹ پٹ کپڑے بدلے۔بچوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نہروں میں سے نکالا۔یہ ادھر ان کے کپڑے لینے گئیں اور وہ دھم سے پھر نہر میں کود گئے۔

بڑی مشکل سے بچوں کو پونچھ پانچھ کپڑے بدلوائے۔ جھرنہ کے دروازے کھل گئے۔ سب کے سب وہاں سے نکل امریوں میں آئے تھوڑا بہت جھولا جھولا۔ پکوان کھایا، اور ناظر کے باغ کا راستہ لیا۔

ناظر کا باغ جھرنہ سے قریب ہی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے ناظر روزافزوں نے بنوایا تھا۔ امریوں کے سامنے ہی اس کا بڑا دروازہ ہے۔ دروازہ پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

پئے تاریخ سالش گفت ہاتف خدایا ایں بود باللہ مبارک

باغ کے گرد پختہ چاردیواری ہے۔ اندر چاروں طرف سنگ سرخ کی چار بارہ دریاں اور بیچ میں ایک بڑی خوبصورت عالیشان بارہ دری ہے۔ بیچ کی بارہ دری کے چاروں طرف چار حوض ہیں۔ ان حوضوں میں کئی کئی فوارے ہیں جھرنہ کا پانی اس باغ میں آتا ہے۔ ان چاروں حوضوں سے چار نہریں نکالی ہیں تھوڑی دور نہر گئی۔ اور دو کر حوض میں گر گئی۔ اس سے نکلی تیسرے حوض جا گری۔ اسی طرح حوضوں میں سے یہ نہریں ہوتی ہوئی اور سامنے کی بارہ دریوں کے گرد گھوم کر باہر نکل جاتی ہیں۔ ان نہروں کی وجہ سے باغ کے چار حصہ ہو گئے ہیں۔ نہروں کے دونوں کناروں پر چلنے پھرنے کے لئے پختہ روشیں ہیں۔ اس کے بعد گھانس کے تختے۔ ان درختوں سے ملی ہوئی پھولوں کی کیاریاں اور کیاریوں کے بعد گھنے سایہ دار درخت شروع بھادوں تھا۔ آم کے درختوں پر بہار تھی۔ گوندنی کی طرح لدے ہوئے تھے۔ بھلا بغیر اجازت کے کون ہاتھ لگا سکتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بادشاہ سلامت سے اجازت چاہی۔ اجازت ملنی تھی کہ سب کے سب درختوں پر ٹوٹ پڑے۔ آدھے کھائے آدھے پھینکے گٹھلیاں چلیں چھلکے چلے۔ تھوڑی دیر میں نئے کپڑے عجیب شان کے ہو گئے۔ بارہ دری کے حوضوں میں پھر سب جا کر نہائے۔ کپڑے بدلے۔ خاصہ پر آ کے بیٹھے۔ مگر کیسا کھانا اور کہاں کا کھانا پکوان اور آموں سے پیٹ بھر چکے تھے۔ منہ جھوٹا لنے کو بیٹھ گئے تھے۔ ذرا سی دیر میں دسترخوان بڑھ گیا۔ اس کے بعد سب ہیں اور وہی آموں کے درخت۔ شام تک کئی کئی جوڑے بدل گئے۔ غرض کہ سارے کا سارا دن اسی جھرنہ امریوں اور باغ کے پھیر میں گذر گیا۔ شام کو جنگلی محل میں آن کر دہ لمبی تانی کہ صبح کی خبر لی۔

دوسرے دن قطب صاحب لاٹھ۔ علائی دروازے[1]۔ امام ضامن کے مقبرے۔ سیم کی جھنجنکی[2]۔ کڑوے[3] میٹھے نیم۔ اور بارہ بادشاہوں[4]

---

[1] یہ دروازہ سلطان علاء الدین کا بنوایا ہوا ہے۔ لاٹھ کے بالکل پاس ہے اور خوبصورتی میں لاجواب سمجھا جاتا ہے۔

[2] مہرولی میں شمال کی طرف کوئی میل بھر کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا پتھر۔ پہاڑ کی چٹان پر رکھا ہوا ہے۔ بچہ بھی ہلائے تو اس طرح ہلتا ہے کہ اب نیچے جا پڑے گا۔

[3] جھنجنکی کے قریب ہی ایک بزرگ کے مزار پر یہ درخت ہیں۔ کہتے ہیں رائے پتھورا کی بیٹی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی تھی اسکی قبر پر بھی اس نیم کا سایہ ہے۔ نیم کے درخت کا جو حصہ ان بزرگ کے مزار پر ہے اس کے پتے میٹھے اور جو حصہ راجہ کی لڑکی کی قبر پر ہے اس کے پتے کڑوے ہیں۔

[4] یہ پٹھان بادشاہوں کی قبریں ایک کھلے چبوترے پر بنی ہوئی ہیں۔

قبروں کا چکر رہا تیسرے روز چہل تن چہل من[1] بکاولی کے قلعہ[2] جمالی کمالی کے مزار اور اندھیریا باغ[3] کی سیر کی غرض تین دن میں سارا قطب چھان مارا تھک کر چور ہوگئے پھرتے پھرتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے جب کہیں جا کر محل سے بیٹھے۔ چودھویں تاریخ بھی آگئی تھی معرف جنگلی محل اور مرزا بابر کی کوٹھی قلعہ والوں کے پاس رہی باقی سارے قطب پر دلی والوں نے قبضہ کر لیا۔

دلی والے سیر کا انتظام تو پورے سال کرتے رہتے ہیں۔ ہاں تاریخ مقرر ہونے کے بعد اسمیں ذرا تیزی آجاتی ہے۔ ادھر تاریخ مقرر ہوئی اور اُدھر کارخنداروں (کارخانہ داروں) کے ہاں پتی پڑی۔ حسب مقدور سب نے اس میں چندہ دیا۔ یہ تو قطب میں کھانے پینے کا خرچ ہوگیا۔ اب رہے دوسرے خرچ وہ تم جانو اور تمھارا کام جانے۔ جی چاہے اُدھار جی چاہے نہ اٹھاؤ۔ تیرہ تاریخ سے دلی خالی ہونی شروع ہوئی۔ اجمیری دروازہ سے لگا قطب تک دوکانیں لگ گئیں۔ امیروں کی پالکیاں جارہی ہیں۔ رنڈیوں کی رتھیں نکل رہی ہیں۔ ایک ایک رتھ ایسی کہ نظر لگے۔ مخمل کی جُرجی اس پر زردوزی کے پھول۔ اوپر سنہری کلس۔ اطلس کے پردے۔ مقیش کے پھندنے۔ کلابتون کی ڈوریاں۔ سفید براق پہیے۔ اُس پر رنگین جل بوٹے ناگوری بیل۔ اُن پر زردوزی کام کی جھولیں گلے میں چاندی کے گھنگرو سینگوں پر سنگوٹیاں۔ ڈوریوں کی ناتھیں اندر بناؤ سنگار کئے رنڈیاں بیٹھی ہیں۔ ایک رتھ آئی نکل گئی۔ دوسری آئی نکل گئی۔ دلی کے شرفا۔ گھوڑوں پر سوار۔ مخمل کے کارچوبی زین پوش پیٹیں لگی ہوئی لگام میں گنگا جمنی گہنا پہنے ہوئے گھوڑے کی رنگی اور گندھی ہوئی ایالیں۔ ریشمی باگ ڈور تھامے ہوئے سائیس۔ ان کے صاف شفاف کپڑے چھوٹی چھوٹی سُرخ پگڑیاں ایک ہاتھ میں باگ ڈور۔ دوسرے میں جوھری سوار ہیں کہ شہسواری کے انداز دکھاتے چلے جارہے ہیں۔ غریبوں کا کچھ عجیب رنگ ہے صرف ایک تہمت[4] بندھی ہے۔ نہ جسم پر کرتہ ہے نہ سر پر ٹوپی۔ نہ پاؤں میں جوتی۔ ہاں ایک چھوٹا مٹکا سر پر اوندھائے ہوئے سرپٹ اڑے جارہے ہیں اب یہ نہ پوچھو کہ اس مٹکے میں کیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ سیر کا سارا ذخیرہ اس مٹکے میں ہے تحفہ تحفہ کپڑے ہیں لیس دار کارچوبی ٹوپی ہے۔ لپوال سلیم شاہی جوتہ ہے روپئے ہیں۔ پیسے ہیں۔ بچھونا ہے۔ غرض سب کچھ بھرا ہے۔ مٹکے میں اس لئے رکھا ہے کہ بھیگ نہ جائے ترکیب اچھی نکالی ہے۔ سامان کا سامان بچا اور مٹکہ قطب میں کام آیا۔

تیرھویں کی صبح کو جو یلیں لگی تو کہیں چودھویں کی شام کو جا کر ختم ہوئی۔ ساری دلی خالی ہوگئی۔ شاید ہی کوئی گھر ہوگا جس میں کوئی مرد یا

---

[1] اولیا مسجد کے سامنے چالیس شہیدوں کے مزار ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسیطرح گنتی میں نہیں آتے بے ترتیبی کی وجہ سے بھول چوک ہوجاتی ہے۔

[2] چہل تن چہل من کے پاس ہی ایک ویران عمارت ہے سنتے ہیں کہ رات کے وقت اسمیں سے گانے کی آوازیں آتی ہیں۔

[3] اندھیریا باغ قطب کی جان ہے۔ شمسی تالاب کے جنوبی کنارہ پر اس خوبصورتی سے لگایا ہے کہ دھوپ گھرے ابر کا دھوکا ہوتا ہے گھنا ایسا ہے کہ دن کی دھوپ بھی مشکل سے اسکے پتوں میں سے چھنتی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ نے اس باغ میں دنیا کے جو مزے اٹھائے ہیں وہ کسی بادشاہ کے خواب خیال میں بھی نہیں آسکتے۔ اب بس زیادہ کیا لکھوں خیر جو تھا سو تھا اچھی گزر گئے۔ بہادر شاہ کے بیٹے مرزا شاہ رخ کا مزار باغ کے عین بیچ میں ایک چبوترہ پر بنا ہوا ہے۔ اب باغ کسیقدر چھدرا ہوگیا ہے

[4] لفظ تو ''تہ بند'' ہے اس سے تہمد ہوا۔ پھر تہمت بن گیا۔ شاہ مبارک ابرو کا شعر ہے۔

آبرو کے قتل کو حاضر ہوئی کس کی کمر
خون کرنے کو چلے عاشق یہ تہمت باندھکر

یا بچہ رہ گیا ہو۔ اب ہی عورتیں تو انھوں نے دلی میں سیر منائی۔ سبزی منڈی نکل گئیں۔ باغوں کی سیر کی۔ جھولے ڈالے۔ کڑھائیاں چڑھائیں۔ آم کھائے۔ حوضوں میں نہائے۔ غرض دل کے پورے ارمان نکال لئے۔ شاہی حکم تھا کہ سرکاری باغ میں دلی والیاں جائیں جانے دو پردہ کرادو۔ سب باہر پہرے لگا دو۔ کہ کوئی مرد اندر نہ جائے۔ آگے یہ جائیں اور باغ جانے۔ انھوں نے بھی دو، دو دن میں سارے باغوں کو لنڈورا کر دیا۔ آموں کی گٹھلیوں اور چھلکوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ دن میں کئی کئی دفعہ اٹھائے جاتے اور پھر وہی پہاڑ کے پہاڑ لگ جاتے۔

سیلانیوں نے پہلے تو قطب میں اپنے لئے کونے تلاش کئے۔ بھلا۔ قطب میں ٹھہرنے کیلئے جگہ کی کیا کمی تھی۔ سرکاری ڈیرے تھے۔ شاہی مکانات تھے۔ مقبرے تھے۔ پرانے کھنڈر تھے۔ امرا تو اپنے مکانوں میں جا ٹھہرے۔ روپے پیسے والوں نے سڑک کے دونوں طرف جو کوٹھے تھے وہ کرایہ پر لے لئے۔ غربا کچھ تو ڈیروں اور سرکاری مکانات میں جا پڑے۔ کچھ جھرنے میں جا ٹھہرے۔ کچھ ناظر کے باغ میں اتر گئے۔ لیکن جنکو قطب کا لطف اٹھانا تھا انھوں نے آسمان کے نیچے ڈیرا کیا۔ مینہ برستا ہے برسنے دو یہی قطب کی بہار ہے

مہرولی کے بازار کی کچھ نہ پوچھو۔ اس سرے سے اس سرے تک سارے کا سارا آئینہ بند تھا۔ دنیا بھر کے سودے والوں کی دوکانیں لگ گئی تھیں۔ میوے۔ مٹھائیوں اور کھلونوں سے بازار پٹا پڑا تھا۔ ایک طرف حلوائیوں کے ہاں پوریاں۔ کچوریاں۔ میوڑیاں۔ سہال اور اندرسے تلے جا رہے تھے۔ تو دوسری طرف کبابوں۔ پراٹھوں۔ بریانی۔ زعفران اور متنجن کی خوشبو سے سارا بازار پڑا مہک رہا تھا۔ گاہک ہیں کہ ٹوٹے ہیں۔ لیا۔ کھایا۔ پتے وہیں پھینک آگے بڑھے۔ پنواڑن کی دوکان پر پہونچے۔ بی پنواڑن ہیں کہ بالوں میں تیل ڈالے۔ کنگھی کئے۔ آنکھوں میں سرمہ لگائے۔ دانتوں میں مسی ملے بڑے ٹھاٹھ سے میٹھی پان بنا رہی ہیں۔ نیسی پان لال لال صافوں میں لپٹے سامنے دھرے ہیں۔ پان بن رہے ہیں۔ مذاق ہو رہا ہے۔ یار لوگوں نے پان لئے خود کھائے دوسروں کو کھلائے پیک تھوکی آگے بڑھے پھولوالوں کی دوکان سے گجرے لئے گلے میں ڈالے ساقی کے پاس ٹھہر کر دو دم حقے کے مارے ایکدم پیے لئے آگے قدم بڑھایا۔ ساقی کا رنگ بھی آج کچھ نیا ہے۔ حقہ کیا ہے ایک تماشہ ہے۔ کوئی گز بھر اونچا نیچہ۔ اس پر اتنی بڑی چلم کہ ڈیڑھ پاؤ تمباکو آئے۔ نے ہے کہ یہاں سے وہاں تک چلی گئی ہے۔ نے کو سنبھالنے کے لئے کئی کئی گھوڑیاں دے رکھی ہیں۔ نے پر خس چڑھا ہے۔ اوپر موتیا اور چنبیلی کی لڑیاں لپٹی ہیں۔ گھوڑیوں کے اوپر روشنی کے چھوٹے چھوٹے گلاس لگے ہیں۔ خود بھی سفید کپڑے پہنے۔ سبز بنارسی سیلہ باندھے۔ لال پٹکا لپیٹے۔ کھڑے حقہ پلا رہے ہیں۔ کوٹھے والوں کو پلانا ہوا تو نے سیدھی کر دی۔ انھوں نے بھی دو کش کھینچ لئے۔ ادھر کسی نے مہنال پر ہونٹ رکھے اور انھوں نے شعر پڑھنے شروع کئے۔

حقہ جو ہے حضور معلیٰ کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

شام ہوتے ہوتے بازار اتنا بھرا۔ اتنا بھرا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ تھالی پھینکو تو سروں پر جائے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہی جھرنے نفیری کی آواز آئی۔ سمجھئے پنکھا اٹھا۔ اب ہر شخص ہے کہ جھرنے کی طرف جا رہا ہے۔ کچھ جا رہے ہیں۔ کچھ واپس آ رہے ہیں۔ ریلے پر ریلا پڑ رہا ہے۔ جو ذرا دم خم والے ہیں وہ ان جھٹکوں کو سینہ اور پشت پر سہہ رہے ہیں۔ جو ذرا کمزور ہیں وہ یہ کہکر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں کہ "ارے بھئی۔ جانے بھی دو کون اس بلا میں پڑے۔ آگے چلکر پنکھا دیکھ لینگے۔

پنکھا جھرنے سے اٹھا۔ شمسی تالاب سے ہوتا ہوا۔ مہرولی کی سڑک پر آیا۔ یہاں پہلے ہی سے مشعلیں لالٹینیں۔ گلاس۔ ہانڈیاں۔

فانوس اور دیوارگیریاں جل چکی تھیں۔ روشنی اتنی تھی گویا دن نکلا ہوا ہے۔ اب پنکھے کا جلوس بازار میں سے گزرنا شروع ہوا۔ آگے آگے ڈھول تاشے والے رد بہلی ٹھپہ ٹکے ہوئے سبز کرتے لیس لگی ہوئی گول لال ٹوپیاں۔ کسی کے گلے میں ڈھول کسی کے گلے میں تاشہ۔ ہاتھوں میں چوبیں دھوں دھوں کرتا آرہا ہے گزرا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے۔ ان کے پیچھے دو جھنڈے۔ زربفت کے پھریرے۔ مقیش کے پھندنے۔ کلابتون کی ڈوریاں۔ جھنڈوں کے سروں پر رنگ برنگ کے شیشوں کی ہشت پہل لالٹینیں۔ ایک لالٹین کے سرے پر سنہرا ہلال۔ دوسرے پر روپہلی چکر۔ ان کے بعد شرف الحق کوتوال کا گھوڑا اردلی میں پولیس والوں کا پرا۔ ان کے پیچھے نوبت خانے کا تخت۔ تخت کیا ہے۔ خاصی بارہ دری ہے۔ تخت کے اوپر بانسوں کی بارہ دری کھڑی کر اوپر کھپچیوں کا نصف گنبد بنا۔ کپڑا منڈھا۔ پنی لگا۔ کاغذوں کے پھولوں سے سجا۔ دروں میں گیندئی پردے ڈال۔ ڈوریوں سے کس دیئے۔ نوبت والے اندر جا بیٹھے۔ تخت کو کہاروں نے اٹھایا اور یہ خاصہ مکان کا مکان جلوس کے ساتھ چلنے لگا۔ نوبت خانے کے پیچھے دلی کے اکھاڑے۔ ہر اکھاڑہ کے ساتھ ایک ایک استاد۔ بیس بیس پچیس پچیس شاگرد۔ بنے ہوئے تیار جسم۔ چوڑے چوڑے سینے۔ بھرے بھرے ڈنڑ۔ بھری ہوئی مچھلیاں۔ پتلی پتلی کمریں۔ جسم پر چست جانگیے۔ گلے میں سونے کے چھوٹے چھوٹے تعویذ۔ کوئی بنیٹی کا چکر باندھ رہا ہے۔ کوئی لیزم ہلا رہا ہے۔ کوئی تلوار کے ہاتھ نکال رہا ہے۔ کہیں پھری گتکہ سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ کہیں بانک اور بنوٹ کے کرتب دکھائے جا رہے ہیں۔ غرض دور تک اکھاڑے ہی اکھاڑے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے نفیری والے اور ان کے ساتھ دلی کے سقے۔ سفید براق کپڑے پہنے۔ لال کھاروے کی لنگیاں کمر سے لپیٹے۔ سبز سیلے سروں پر باندھے۔ ہاتھوں میں منجھے منجھائے پیتل کے کٹورے لئے۔ نفیری اور جوڑی کے ساتھ کٹوروں کی آواز ملاتے چلے آ رہے تھے۔ نفیری والوں کے بعد ڈنڈے والوں کی سنگتیں تھیں۔ ہاتھوں میں لال سنہرے ڈنڈے۔ پندرہ بیس کا حلقہ۔ بیچ میں طبلہ سارنگی والے۔ تال سُر پر ڈنڈوں کی کھٹا کھٹ عجیب مزا دے رہی تھی۔ ان کے پیچھے تخت رواں۔ تختوں پر رنڈیاں بھاری بھاری پشوازیں پہنے کارچوبی ڈوپٹے اوڑھے۔ پاؤں میں گھنگرو باندھے چھم چھم ناچ رہی ہیں۔ ان کے بعد انگریزی باجہ اور ترک سواروں کا رسالہ۔ سرخ بانات کی وردیاں۔ ان میں سفید بانات کے کف اور کالر۔ شانوں پر فولادی جال۔ پاؤں میں کالی برجیس۔ فکٹ[۵۱] کے چمڑے کے اونچے بوٹ سر پر سرخ منڈاسے۔ ہاتھوں میں لمبے لمبے برچھے لئے۔ گھوڑوں کی کنوتیاں ملائے آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔ سواروں کے پیچھے شاہی روشن چوکی اور سیلانیوں کا اژدہام۔ سب کے صاف ستھرے کپڑے۔ کارچوبی ٹوپیاں۔ مداخل ٹکی ہوئی نیچی چولی کے انگرکھے۔ ایک برے پیجامے۔ سلیم شاہی جوتیاں۔ ان کے بعد بچھیرا پلٹن[۵۲] کی چار قطاریں۔ کم عمر گورے گورے لڑکے۔ سر پر دھانی منڈاسے۔ منڈاسوں پر چھوٹی چھوٹی کلغیاں۔ سبز[۵۳] اطلس کے کوٹ۔ سفید اطلس کی کسی ہوئی برجیس سیاہ چمڑے کے انگریزی جوتے۔ ہاتھوں میں سبز پھریروں کے چھوٹے چھوٹے نیزے۔ بڑی آن بان سے قدم ملاتے چل رہے ہیں۔ انکے پیچھے دہلی کے

---

۵۱ PATENT LEATHER کو دلی میں فکٹ کہتے ہیں۔

۵۲ شرفا دہلی کے لڑکوں اور کم عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی یہ فوج بادشاہ نے بنائی تھی۔ یہی لڑکے گر غدر میں بادشاہ کے پیچھے سب کٹ کر ڈھیر ہو گئے انکے قصے دلی کے بڈھے بیان کرتے تھے اور روتے تھے۔ تاریخ میں اس اور انکے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں ہے خدا معلوم کیا بات ہے۔ ہاری ہوئی فوج تھی۔ شاید اس لئے ان کا ذکر بے ضرورت سمجھا گیا۔ ۵۳ دہلی کا شاہی رنگ سبز تھا۔

شرفا، اور عماید کا ہجوم - نیچی نیچی قبائین اور جنبے - ہندؤن کے سرون پر چھوٹی چھوٹی پگڑیان - مسلمانون کے سرون پر عمامے اور چوگوشیہ ٹوپیان - ہاتھون مین رنگ برنگ کی جریبین - ہشاش بشاش چہرے - گلون مین پھولون کے کنٹھے - ہاتھون مین مولسری کی لڑیان - موسم کا لطف اُٹھاتے - میلہ کی رونق بڑہاتے خرامان خرامان چلے آرہے ہین - انکے بعد شاہی شہنائی نوازون کا گروہ - نفیری کے کمال دکھاتا - موسم کی چیزین بجاتا - خود بھی اپنے کمال کے مزے اُٹھاتا - پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے - سب سے آخر مین پنکھا اور پنکھے کے پیچھے پھول والون کا غول -

بھلا اس جلوس کو دیکھو اور پنکھے کو دیکھو - بانس کی کھپچیون کا بڑا سا پنکھا بنا - پنّی چڑہا - آئینے لگا - پھولون سے سجا ایک لمبے رنگین بانس پر لٹکا دیا تھا - یہ پنکھا نہ تھا بلکہ جوش محبت اور یگانگت کا نشان تھا - جس نے چھوٹے بڑون - ہندو مسلمانون - غربا - امرا - غرض ہر قوم و ملت اور ہر طبقہ کی رعایا کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور خود بادشاہ کو قلعہ سے نکال مہرولی مین لے آیا تھا - یہ پنکھا نہ تھا - بلکہ عقیدت اور محبت کے مظاہرون کا مرکز تھا - اور یہ مہرولی نہ تھی بلکہ لگن تھا - جس مین خود بادشاہ شمع تھے اور رعایا انکے پروانے

غرض خلقت کا یہہ ہجوم پھوار مین بھیگتا - خس کے پنکھے جھلتا آہستہ آہستہ مہرولی کی سڑک پر سے گزرا - باجہ والے اور نفیری والے ہر کمرے کے سامنے ٹھہرتے - ایک آدھ چیز سناتے - انعام لیتے اور آگے بڑھتے - ہوتے ہوتے یہ جلوس شاہی دروازہ کے سامنے پہنچ گیا بادشاہ سلامت اوپر کی بارہ دری مین برآمد ہوئے - بیگمات کے لئے چلمنین پڑ گئین - اب ساری بھیڑ سمٹ سمٹا کر باب ظفر کے سامنے آ گئین پھاٹک کے سامنے بڑا کھلا میدان تھا - یہان باجہ والون نے اپنے کمال دکھائے - اکھاڑے والون نے اپنے کرتب دکھائے سقون نے کٹورے بجائے ٹنڈے والون نے اپنے ہاتھ دکھائے - رنڈیون نے اپنا ناچ دکھایا - سب کو حسب مراتب انعام ملا - کسی کو سیلہ ملا - کسی کو دوشالہ ملا - کسی کو مندیل ملی - کسی کو کڑے ملے - اتنے مین پنکھا بھی سامنے آ گیا - شہر کے شرفا وامرا مجرا بجا لائے - اور سارے مجمع پر گلاب پاشون سے گلاب اور کیوڑا چھڑکا گیا - عطر اور پان سے تواضع کی گئی - بادشاہ کے اشارہ کرتے ہی ولیعہد بہادر نیچے اتر آئے - لوگون کے گلون مین پھولون کے کنٹھے ڈالکر سب کو رخصت کیا - یہان سے سلاطین زادے اور شہزادے بھی جلوس کے ساتھ ہو گئے - کوئی بارہ بجے ہونگے کہ پنکھا جوگ مایا جی پہنچ گیا

یہ مندر قطب صاحب کی لاٹھ سے کوئی دو ڈہائی سو قدم پر ہے - بڑی لمبی چہار دیواری ہے - کونون پر چار برجیان ہین - احاطہ کے اندر ۲۰ - ۲۲ عمارتین ہین - بیچ مین دیوی کا استھان ہے - کہتے ہین کہ یہ دیوی کشن جی کی بہن تھین - بجلی بنکر الوپ ہو گئین - اور یہان آن پڑین - راجہ یدھشٹر نے مندر بنوا دیا - مندر زمین کے برابر ہو گیا تھا - پھول والون کی سیر شروع ہوئی تو اکبر شاہ ثانی کے ایما سے لالہ سیڈمل نے نیا مندر بنوایا - رفتہ رفتہ اور عمارتین بھی اندر بن گئین - اب یہ خاصی آباد جگہ ہو گئی ہے - اس مندر کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے اندر پلنگ یا چارپائی نہین جا سکتی -

کوئی ایک بجے لوگ پنکھا چڑہا کر واپس ہوئے - دوسرے دن درگاہ شریف کا پنکھا بھی اسی دھوم دھام سے اُٹھا -

باب ظفر کے سامنے آکر ٹھہرا۔ بعض مصاحبون نے کوشش کی کہ بادشاہ سلامت کو بھی پنکھے کے ساتھ درگاہ شریف مین کسی نہ کسی طرح لے چلین مگر بادشاہ کسی طرح اسپر راضی نہین ہوئے۔ کہا ”امان۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب مین جوگ ملیا جن کے پنکھے کے ساتھ نہین گیا۔ تو اب اس پنکھے کے ساتھ کیسے جاؤن۔ تمھارے ہندو بھائی کیا خیال کرینگے۔ کہین گے۔ مسلمان تھا مسلمانون کے پنکھے مین شریک ہو گیا۔ ہمکو غیر سمجھا اسلئے جھروکون سے نیچے بھی نہین آیا۔ نا۔ امان۔ نا۔ جیسا ایک کے ساتھ کرنا۔ ویسا دوسرے کے ساتھ کرنا۔ شہزادے پہلے بھی گئے تھے۔ اب بھی جائینگے۔ آتشبازی[51] مین ہندو مسلمان سب شریک ہوتے ہین وہان ہم بھی چلین گے۔

خیر۔ درگاہ[52] شریف تو قریب ہی تھی۔ لوگ دس بجے پنکھا چڑھا کر فارغ ہوگئے۔ اور یہان سے نکل سیدھے شمشی تالاب پہونچے تھوڑی دیر مین بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی بیگمات کے لئے جہاز پر چلمنین پڑ گیئن۔ وہ اندر جا بیٹھین۔ بادشاہ سلامت نے مہتابی پر جلوس کیا۔ مصاحبون اور دہلی کے اکثر امراء و شرفاء کو اوپر بلا لیا گیا۔ سارے سیلانی تالاب کے کنارہ جم گئے۔ تالاب مین سینکڑون کشتیان۔ بجرے اور نواڑے پہلے ہی سے پڑ گئے تھے۔ آدھون مین شاہی آتشباز سوار ہو ایک طرف چلے گئے۔ باقی مین دہلی کے آتشباز اور شوقین بیٹھکر دوسری طرف گئے۔ بادشاہ سلامت کا آنا تھا کہ دونون پارٹیان مقابلہ کو تیار ہوگیئن۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ جہاز پر مہتابی چھٹی۔ مہتابی چھٹنا تھا کہ میدان کارزار گرم ہو گیا۔ سب سے پہلے غبارے چھوڑے گئے

---

[51] مین نے بزرگون کی زبانی سنا تھا کہ بہادرشاہ کو آتشبازی کا بڑا شوق تھا۔ آتشباز نوکر تھے۔ کوئی میلہ نہ تھا جسمین قلعہ سے آتشبازی نہ جاتی ہو۔ دہلی والون سے مقابلہ ہوتے تھے۔ ان مقابلون کے دو بڑے میدان تھے۔ ایک شمشی تالاب۔ دوسرے سید حسن رسول نما کا حوض۔ پھول والون کی سیر مین تو اب آتشبازی نہین چھٹتی۔ ہان سید حسن رسول نما مین اب بھی خوب مقابلے ہوتے ہین ان بزرگون کے بیانکی تائید اب ایک کتاب سے بھی ہوگئی ابھی حال مین مسٹر اینڈ رُوز نے شمس العلماء منشی ذکاء اللہ خان دہلوی کی سوانح عمری لکھی ہے۔ اور دہلی کے بڈھون بڈھون سے پوچھ پوچھ کر غدر سے پہلے کے حالات جمع کئے ہین۔ اسمین بادشاہ کے اس شوق کا بھی ذکر ہے اس کتاب کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اور دہلی والون مین کیا تعلقات تھے۔ اور کس طرح یہ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ صاحب لکھتے ہین کہ مین نے جس بڈھے سے بادشاہ کا حال پوچھا۔ خواہ ہندو ہو یا مسلمان اسکے آنسو نکل آئے۔ یہ نہین معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر کا قصہ بیان کر رہا ہے بلکہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خود اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ یہ کتاب ابھی سنہ ۱۹۲۹ء مین ڈبلیو۔ ہیفر اینڈ سنز لمیٹیڈ کیمبرج نے چھاپی ہے۔ اور ساڑھے سات روپے قیمت ہے۔

[52] یہ درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی ہے۔ آپ حضرت سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفہ تھے سلطان شمس الدین التمش کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ آپکا وصال قوالی مین اس شعر پر ہوا۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جانے دیگر است — دہلی کے بادشاہون نے آپکے مزار کے گرد سنگ مرمر کی جالیان فرش اور دروازے بنوائے دیوارون پر کاشانی اینٹون کا کام کرایا اور آس پاس مسجدین اور مسجد تعمیر کرلئے۔ خود مزار شریف

اور ذرا سی دیر میں آسمان پر ہزاروں چاند اور سورج نکل آئے۔ ان سے فراغت ہوئی تو جنگی[۱] آتشبازی کا نمبر آیا۔ ہوائیاں[۲]۔ چھلے[۳]۔ لٹو[۴] اور خدنگے[۵] چلے ہوائیوں کی شائیں۔ شائیں۔ چھلوں کی غائیں۔ غائیں۔ لٹوؤں کی دہائیں۔ دہائیں۔ خدنگوں کی زائیں۔ زائیں اور قلموں[۶] کی سائیں۔ سائیں سے بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑی جنگ ہو رہی ہے۔ ادھر آسمان پر مقابلہ ہو رہا تھا۔ اور ادھر پانی پر آتشبازی بجرے چھوٹے۔ بجرے کیا تھے۔ چھوٹے چھوٹے جہاز تھے۔ توپوں کی جگہ مہتابیاں اور چھچھوندریں۔ گولوں کی جگہ چکر اور خدنگے مستولوں کی جگہ انار۔ آدمیوں کی جگہ مٹی کے سپاہی۔ پیٹ میں بارود۔ ناف میں چھچھوندر۔ اس سرے سے اس سرے تک تشابہ کا سلسلہ۔ ادھر سے۔ دلی والوں کے بجرے چلے۔ ادھر سے قلعہ والوں کے بجرے آئے۔ بیچ تالاب میں پہنچکر دھواں دھوں ہونے لگی۔ سمند کی لڑائی کا مزا آ گیا۔

آتشبازی کی چمک سے سارا تالاب اور کنارے روشن ہو جاتے تھے اور پانی میں روشنی کے عکس کشتیوں کے سایہ۔ آتشبازوں کے ننگے جسم۔ کناروں پر خلقت کے ہجوم۔ انکے غل۔ آتشبازی کے عکس سے انکے زرد زرد چہروں۔ اور اوپر دھوئیں کے بادلوں نے

---

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کچی مٹی کا ہے۔ ہاں آس پاس دوسروں کی قبروں کے بڑے عمدہ عمدہ سنگ مرمر کے تعویز ہیں۔ ایک طرف سنگ مرمر کی چھوٹی سی مسجد ہے اور اسکے پہلو میں آخری بادشاہان دہلی کے مزار۔ بیچ میں شاہ عالم ثانی کا مزار ہے۔ اور اسکے ایک طرف اکبر شاہ ثانی کی قبر۔ ایک پہلو خالی تھا۔ اسمیں بہادر شاہ نے اپنا سردابہ بنوایا تھا۔ خیال تھا کہ مرنے کے بعد باپ دادا کے پہلو میں جا پڑینگے۔ یہ کیا معلوم تھا کہ وہاں قبر بنے گی جہاں بزرگوں کا پہلو تو کجا کوئی فاتحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔

[۱] دلی والوں نے آتشبازی کو دو قسموں میں بانٹا ہے۔ ایک جنگی۔ دوسری گلکاری۔ ان دونوں کا مطلب آگے خود آپ سمجھ جائیں گے

[۲] بڑے بڑے انزن اناروں کو دلی میں ہوائی کہتے ہیں۔

[۳] موٹے مضبوط بانسوں کی لمبی لمبی پوریوں پر آٹھ تین لپیٹ اوپر سے جھلی چڑھا اور اندر خوب ٹھونس ٹھونس کے بارود بھر کر چکہ بنایا جاتا ہے۔ اسکا جلانا واقعی بڑا کمال ہے۔ بارود کو آگ دے اسکو ہلانا شروع کیا۔ جب زور پکڑ گیا تو جھلا کر اور کئی چکر دیکر اوپر چھوڑ دیا۔ اب بانس کی یہ آدہ گز لمبی پوری غائیں غائیں کرتی اس زور سے جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اگر چھوڑنے میں کہیں ہاتھ بچارہ گیا اور یہ پوری تماشائیوں میں گھس گئی تو سمجھ لو کہ قیامت آ گئی۔ کسی کی ہڈی ٹوٹی کسی کا منہ جھلس گیا۔ کسی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ غرض آتشبازی کیا ہے ایک بلا ہے [۴] مٹی کے چھوٹے چھوٹے اور ہلکے کوزے بناتے ہیں۔ یہ اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ ایک طرف چھید کیا اور بارود بھر دی چھید میں چھوٹی سی چھچھوندر لگا دی۔ جلاتے وقت چھچھوندر کو آگ لگا۔ لٹو کو اوپر پھینک دیا۔ اندر کی بارود نے آگ لی۔ اور لٹو پھٹا۔ اس زور کی آواز ہوتی ہے جیسے توپ چل گئی [۵] خدنگ کو دلی والے خدنگے کہتے ہیں۔ یہ چیز ایسی عام ہے کہ کسی نوٹ کی ضرورت نہیں۔ [۶] بڑی چھچھوندر کو قلم کہتے ہیں۔ اس کی بارود اتنی تیز ہوتی ہے کہ زمین پر لوٹنا جانتی ہی نہیں پانی کی چوٹ کھا کر بھی اٹھتی ہے تو بیس بیس تیس گز اونچی اڑ جاتی ہے۔

ایک عجیب خوفناک منظر پیدا کر دیا تھا۔

یہ سلسلہ ختم ہوتے ہی مہتابیون۔ آفتابیون۔ انارون۔ سہرون۔ جائی جوہیون سے ہت پھولون اور چرخیون کا مقابلہ شروع ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ دونون طرف کی کشتیان سمٹ کر جہاز کے بالکل سامنے آگئین۔ یہان استادون نے اپنے ہنر کے کمال دکھائے۔ نسری چھوڑی تو ایسی کہ لوٹ لوٹ کر سو سو دفعہ اُٹھے اور رہ رہ کر سانس لے۔ بتاشہ انار ایسے کہ کئی کئی گز اونچے جائین اور بیچ رنگی پھول دین۔ اور پھر یہ مزا کہ ہتیلی پر چھوڑ لو۔ کیا مجال جو چرکہ لگے۔ بڑے انار جو اُٹھے تو جہاز سے اونچے نکل گئے۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ سرو کے درختون کو آگ لگا کر کشتیون مین کھڑا کر دیا ہے۔ اور ان سے رنگ برنگی پھول جھڑ رہے ہین دم اتنا کہ ختم ہونا ہی نہ جانین۔ کمال یہ کہ کپڑے پر دھبہ نہ دین۔ آتشبازی کی روشنی سے تو یہ نظر آتا تھا کہ سارے کا سارا پانی سونے کا ہو گیا ہے۔ اور اسکے عکس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے تالاب مین آتشین باغ لگا دیا ہے۔

غرض دو بجے کے قریب آتشبازی ختم ہوئی۔ بادشاہ سلامت کی طرف سے شال۔ دوشالے مندیلین اور سیلے تقسیم ہوئے۔ کہین تین بجے جا کر لوگون کو فرصت ہوئی سب اپنے اپنے ٹھکانون پر جا پڑے بادشاہ سلامت کی سواری رات ہی کو قطب سے نکل گئی اور روشن چراغ دہلی[ل۵] ہوتی ہوئی تیسرے پہر تک دہلی آ گئی۔ دوسرے روز لوگون نے صبح ہی صبح اُٹھ۔ میوے۔ مٹھائیان۔ پراٹھے چھلے[۵۲] اور کھلونے خریدے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے نکل اپنے گھرون کا راستہ لیا۔ شام تک مہرولی سنسان اور دہلی آباد ہو گئی۔

---

دیکھ لیا۔ آپنے پھول والون کی سیر کا مزا۔ اور اب کی کیا پوچھتے ہو۔ غدر ہوا۔ دہلی تباہ ہوئی۔ بادشاہ رنگون پہنچے۔ بند ہن ٹوٹ گیا۔ تیلیان بکھر گیئن۔ بندہن اب بھی ہے۔ مگر وہ محبت کا بندہن تھا۔ یہ قانون کا بندہن ہے۔ ذرا کچھ بات ہوئی اور چل پھیا عدالت مین۔ بات یہ ہے کہ پھول والون کی سیر، عایار کی عقیدت اور بادشاہ کی محبت کا مظاہرہ تھی۔ بادشاہ کے بعد بھی چلی۔ مگر مرکز اور یکجہتی نہونے سے زور گھٹتا گیا۔ اب پانچ چھ برس سے بالکل بند ہے۔ اگر یہی لیل و نہار ہے۔ اور دلون کی کدورت کا یہی حال رہا۔ تو ہمیشہ کے لئے اسکو بند ہی سمجھو۔

اے مصحفی مین روؤن کیا اگلی صحبتون کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھون بگڑ گئے ہین

مضمون ختم ہو گیا پڑھنے کے بعد ہر شخص کے دل مین خیال پیدا ہو گا کہ یہ واقعات ہین یا کوئی من گھڑت قصہ اسکے متعلق مین

---

ل۵ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا مزار پرانی دہلی مین ہے۔ قطب سے ۵ میل اور دہلی سے کوئی ۲ میل۔ آپ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ ہین اور وہین سے آپکو چراغ دہلی کا خطاب ملا تھا۔ جہان آپکا مزار ہے اس بستی کو اسی خطاب کی وجہ سے چراغ دہلی یا روشن چراغ دہلی کہنے لگے ہین ۵۲ پھولوالونکی سیر کی بس وہی سوغاتین تھین۔ ایک پراٹھے۔ دوسرے چھلے۔ آتے اور گھر گھر بٹتے۔

بعض باتون کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہون - اس مضمون مین جسقدر تاریخی واقعات یا مکانات کے نقشے ہین - انکی صحت مین کو کسی کو شک ہو ہی نہین سکتا - البتہ بقیہ واقعات کے متعلق دل مین دگدا پیدا ہو سکتا ہے - اسکی یہ کیفیت ہے کہ جھرنے اور امریون کے واقعات کا حال مین نے ان بڑھیون سے سنا ہے جو ان جلسون مین شریک تھین - اس زمانہ کی سیر دیکھنے والے اب بھی دہلی مین موجود ہین - وہ میرے ایک ایک حرف کی تائید کرینگے - جلوس کی تصویر خود مین نے اپنے مصوری کے استاد کے ہان دیکھی ہے - مین نے صرف یہ کیا ہے کہ ان واقعات کو ملا کر رنگ بھر دیا ہے - اب رہی گفتگو تو وہ البتہ میرے خیال کا نتیجہ ہے - لیکن جو تعلقات اور محبت رعایا اور بادشاہ مین تھی اسکا لحاظ کرتے ہوئے اس گفتگو کو بھی مبالغہ آمیز نہین کہا جا سکتا - مسٹر سی - ایف اینڈریوز کی کتاب "ذکا اللہ دہلوی" اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو جائیگا کہ جو کچھ مین نے اس بارے مین لکھا ہے وہ صحیح ہے یا غلط - مسٹر اینڈریوز میرے استاد تھے - مجھکو معلوم ہے کہ کس طرح بڈھے بڈھون سے ملکر انھون نے غدر سے پہلے کے حالات دریافت کئے ہیں اور خود ان پر اس تحقیقات کا کیا اثر ہوا ہے

اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ سنہ ۱۲۶۴ھ کا انتخاب کیون کیا گیا - اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے سنہ ۱۲۶۴ھ تک بہادر شاہ کی زندگی بہت چین چان اور امن امان سے گزری - اسکے سال بھر بعد ہی سے اس بچارے پر پے در پے مصیبتین آنی شروع ہوئین -

دارالبخت ولیعہد کا انتقال ہوا - مرزا شاہرخ مرے - مرزا فخرو چل بسے - خود بادشاہ کو زہر دیا گیا - جوان بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے پڑے - قصہ مختصر یہ کہ غدر تک ان مصیبتون نے بچارے بڈھے بادشاہ کو بٹھا دیا - اسی خیال سے مین نے وہ آخری سال لیا ہے - جب بادشاہ ان تمام فکرون اور مصیبتون سے آزاد ہے

بہر حال بڈھون کی یہ ودیعت تھی جو مینے آپکو پہنچا دی - اب چاہین آپ اسکو قبول کرین یا نہ کرین -

مرزا فرحت اللہ بیگ


## سرمۂ تریاق چشم

اس سرمہ کا دھند، جالا، غبار، روہے، پربال، گوہانجی، ناخونہ، آشوب چشم، ضعف بصر، خارش چشم، آنکھوں سے پانی بہنا، شب کوری، روز کوری، وغیرہ وغیرہ امراض میں ہزاروں بار تجربہ ہو چکا ہے ہندوستان کے مشہور حکیم و ڈاکٹر اور جید اہل الرائے حضرات نے اسکی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے - مثلاً

**جناب نیاز فتحپوری صاحب** اڈیٹر رسالہ نگار بسلسلۂ ملاحظات ماہ دسمبر تحریر فرماتے ہیں کہ تجربہ سے یہ سرمہ بہت مفید ثابت ہوا ہے اور آنکھوں کے بہت سے امراض کے لئے کارآمد چیز ہے - قیمت فی شیشی علاوہ محصول ...... عہ

**انڈین میڈیکل اسٹور نظیر آباد لکھنؤ**

# دلّی کا آخری دیدار

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

زمانے کا ہر قدم آگے کو ہے۔ دلّی سے اچھے شہر بنائے جائیں تو آج بنجائیں۔ اینٹ پتھر ہے۔ کاریگر ہیں۔ پہلے سے زیادہ سہولتیں ہیں۔ مگر جو دلّی اصل میں اینٹ پتھر کا نام تھی ہی نہیں۔ یہ بات ہوتی تو کہنے کو حویلی[1]، جامعہ مسجد، اور سارے چیزیں باقی ہیں۔ آج بھی یہاں پہلی سی گھما گھمی ہوتی، لیکن نہیں اگلے وقتوں کوئی اور چیز تھی جو شہروں کی جان بنی رہی۔ اسی سے دلّی دلّی تھی۔ وہ روح رواں پرواز ہوئی تو سمجھو یہ بے جان ہوگئی۔

دلّی کی جان اس کی آن بان تھی۔ یہ ایشیائی تہذیب کے دودھ سے پلی۔ بادشاہت کی گود میں کھیلی۔ علم و فن نے پروان چڑھایا، راجہ بھرت سے لیکر تیموری خانوادے تک کی رنگینیاں اس سرزمین پر رچتی رہیں۔ جسے دیکھو اعلیٰ زندگی کا جیتا جاگتا نمونہ، چلتی پھرتی تصویر۔ پشتینی شرافت رگوں میں، رگوں کے دوڑتے ہوئے خون میں بسی ہوئی۔ جو بات کلچر کی جان سمجھکر اوروں میں فخریہ بیان کی جاتی، وہ ان کے خون میں پڑی ہوتی۔ ہندو مسلمان بھائی بھائی، جنہیں "میاں جی" کہتے ایک کا منہ خشک ہوتا تو دوسرا "لالہ جی" کہہ کہکر بچھتا، دونوں متواضع، ملنسار، دکھ درد کے شریک، محبت دار۔ دونوں جسم و روح کے بلونت، علم و فن کے پتلے، حسن و عشق کے رسیا۔ کیا مجال جو حد سے گذریں۔ ایک دوسرے کا پاس مذہب بھی، ملت بھی، بس یوں کہو سب انسان تھے۔ آج کل کی طرح بھیڑیے نہ تھے کہ ایک ایک کو نگلے جاتا ہے۔ یہ پڑھے لکھے امیر، شرافوں کا طور طریق تھا۔ ان پڑھ اجلاف بھی انجان طور پر تمیز تہذیب کے دلارے بن بن گئے۔ گویا امیر مال میں، غریب حال میں مست تھا۔ اللہ اللہ ایک وہ زمانہ گذرا کہ اس شان سے برکتیں بیدار تھیں۔ دن عیدرات شبرات تھی۔ یا ایکا ایکی جو نصیب سویا تو برے دن آگئے۔ لچھن اچھے نہ رہے، اپنے پرائے بننے لگے۔ عقل پر پٹی پڑی۔ ملت اندھی ہوگئی۔ ایک ہماہمی پڑی۔ روز کمزوری بڑھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ دنیا اس سونے کی چڑیا پر تاک لگائے بیٹھی تھی۔ ان باتوں نے رستہ صاف کرکے، اور شے دی۔ سنہ ۱۸۵۷ء اجل بنکر آن پہونچا۔ بادشاہت نے پاک باطن بہادر شاہ کی گود میں دم توڑا۔ بزم تیموری کا جھلملاتا ہوا چراغ آخری دفعہ بھڑکا اور خاموش ہوگیا۔ اس کے چاہیتے، چاہنے والے کچھ سر بسجدہ انگل کھڑے ہوئے، اور ایسے نکلے کہ پھر دلی دیکھنی نصیب نہوئی۔ بہت پکھ مارے گئے۔ جو گنتی کے رہ گئے۔ وہ باہر والوں کے طوفان میں ہوئے نہ ہوئے برابر تھے۔ یوں دیکھتے دیکھتے یہ مزے کی بستی اجڑی۔ مغلئی تہذیب کی بساط الٹی۔ جب وہ دلی والے ہی نہ رہے تو دلّی کیا رہتی، "اللہ کا نام رہ گیا"۔

خیر! عروج وزوال ہرتی پھرتی چھاؤں ہے۔ جو بڑھتا ہے، ایک دن گھٹتا بھی ہے، دنیا کا کچھ یہی دستور ہے۔ یہاں ایک رنگ آتا ہے اور ایک جاتا ہے، یہی سدا ہوا، یوں ہی شاید ہوتا رہے۔ اسی طرح دلّی کا پیدائشی روپ سروپ بھی چھن گیا۔ دولت گئی، حکومت گئی۔

---

[1] دلّی والے قلعہ کو "حویلی" بھی کہتے تھے۔

دلولے سٹے۔ ہمتیں ڈھیئیں، جولانیاں سرد پڑ گئیں۔ سماج کی یوں آب ہوا بدلی تو گویا مغلئی شاہی کا قدیم سانچہ ہی ٹوٹ گیا۔ مگر یہاں عروج و زوال کی دھوپ چھاؤں دکھانی نہیں۔ اگلے وقتوں کی صرف وہ آخری جھلک مرہنا روتی میں دیکھ لینی ہے، جو کسی طرح بھولنے بھلانے کی چیز نہیں۔ یہ اچھے دنوں کی موہنی باتیں کہیں کتابوں میں ملیں۔ کبھی بڑے بوڑھوں کی زبانی سنیں۔ یوں ہوتے ہوتے دماغ ان کا گنجینہ بنا۔ خیال نے افسانہ کر دیا، اب جو "نگار" سننے پر آمادہ ہے تو جی چاہتا ہے، آنے والے، رفتگاں کی یہ سہانی کہانی اسی کی زبانی سنیں۔ کبھی ہنسیں، کبھی روئیں۔ اس طرح جو موتی جستہ جستہ کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں یا ان کا یہ بھی مالا انہیں تیار ہو جائے۔ مانا کہ کتابیں ہیں اور رہیں گی، مگر اس کا کیا علاج کہ ان میں ایک چیز یہاں، ایک وہاں ہے۔ دوسرے سب میں بڑی بات یہ ہے، ان بزرگوں میں بہت سے اٹھ گئے۔ جو ہیں وہ گنتی کے خال خال اور چراغ سحری ہیں۔ آج موئے کل دوسرا دن۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے ساتھ بہت سی مزیدار باتیں بھی قبر میں چھپ جائیں۔ اس لئے جو آنکھوں دیکھی یہ سنائیں۔ اسے جگا جگا کر رکھ لینا ہے۔ ورنہ یہ معلوم ہے۔ زمانے نے انہیں چھوڑا ہے، نہ ہمیں چھوڑے گا۔ جس طرح اچھے دن نہ رہے، ایک روز یاد ایام بھی مٹ جائے گی۔

ہاں تو ذکر یہ تھا۔ دلّی کی جان اس کی آن تھی جیسیں زندہ دلی کی بجلی دوڑتی چمکتی رہی۔ اس سے بات بات پر حسن رچا۔ حسن نے انداز پیدا کیا۔ بادشاہت نے نوازا۔ آب و ہوا نے بڑھایا۔ لیجئے: ادنیٰ اعلیٰ، امیر غریب، بچہ بوڑھا، پڑھے لکھے، ان پڑھ سب خوش باش خوش خوراک، خوش لباس، خوش مزاج بن گئے۔ برس کے بارہ مہینے چہل پہل رہنے لگی۔ جب دیکھو میلے ٹھیلے، سیر تماشے، ناچ رنگ ہو رہے ہیں۔ جہاں اپنا پرایا اس طرح ملے گھلے مزے اٹھاتا تھا کہ زندگی مزے کی موج، شانتی کی سوت دکھائی دیتی۔ قاعدہ ہے: حکومت کی سب ریس کرتے ہیں۔ قلعہ میں گو نام کی بادشاہت رہ گئی تھی۔ مگر بجھتا چراغ تھی۔ اس کی گنڈری حالت میں بھی بہار دے گئی۔ اس نوبت میں بھی تختہ زندگی کا نمونہ بنی رہی۔ سارے شہر میں اسی کی مثال لی جاتی۔ اس لئے جسے دلّی دیکھنی ہو وہ پہلے اندرون کا قلعہ بعد میں اور باہر دیکھے۔ شہری زندگی کا یہی سجل نمونہ کبھی عطر زندگی رہا۔ اسی سے کبھی ہندوستان ٹپ مہکتا تھا

اس سکھ کی سیج میں کبھی نیا سال شروع ہوتا تو صبح عید کا گلابی نور برستا تھا بادشاہ سے لیکر فقیر تک نوروز مناتا۔ دیوان عام، دیوان خاص چھوٹا بڑا رنگ محل۔ خاص محل۔ ہیرا محل۔ موتی محل، باغ حیات بخش۔ مہتاب باغ۔ ساون بھادوں جمع ہر شئے سجتی۔ برجوں اور فصیلوں پر نت نیا سبھاؤ ہوتا۔ محلات کے بیش بہا گل بوٹے، پچی کاری، باغات کی رنگ برنگ پھلکاری پڑی منہ سے بولتی۔ سنگ مرمر کی نہر بہشت میں صاف و شفاف پانی اس طرح دوڑتا پھرتا جیسے حوض نور بہتی ہو۔ چھڑ نگوں کے نیچے انگوری، گلابی باغ تو دلہن بنجاتے۔ خیمے کھڑے ہیں شامیانے تنے ہیں، ان میں جا بجا کرن کے بڑے بڑے طرّے، جھالریں جھلمل جھلمل کر رہی ہیں۔ چھتوں میں کہیں مقیش کا جال بنا ہوا کہیں گنگا جمنی لیس کا چوخانہ، جس میں سلمے ستارے کے پھول، تاروں بھرے آسمان کی طرح جگمگا رہے ہیں، چوبوں پر زربفت اطلس لپٹا ہوا ہے، ریشمی طنابیں سونے چاندی کی میخوں میں کھینچدی گئیں ہیں۔ چپہ چپہ تاش تمامی کی جھنڈیوں کی بہار ہے۔ چھڑ نگوں کے باغ سے لگی لگی جمنا بہہ رہی ہے، اس میں کشتیاں پڑی ہیں۔ کشتیوں میں قناتیں لگی ہیں۔ نجومی پنڈت سال بسال جو رنگ خوش آیند بتاتے ہیں وہی نوروزی رنگ کہلاتا ہے، ہر چیز پر رچ جاتا ہے، کسی سال دیکھو تو قلعہ، قلعہ والے سر تا سر گلنار، نا فرمانی اگیندئی ہیں، نہیں تو کوئی گلابی

نارنجی، ترکنیں، حبشنیں، جسولنیاں، قلماقنیاں، اردبیگنیاں اندر، قلار، مردھے، پیادے، دربان باہر لپاک جھپاک انتظام کرتے پھرتے ہیں۔ لے لو! وہ دربار آراستہ ہوا، جہاں پناہ ہوادار میں برآمد ہوئے۔ اس کے چاندی کے چار ڈنڈے ہیں، گرد چاندی کا نازک نازک کٹہرا۔ پشت پر سونے کے کام کا زرملّ گاؤ دار تکیہ۔ بیچوں بیچ زرکوبی مسند تکیہ۔ اہلو پہلو دو اور ملائم تکیے ریشمی ڈوریوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ سامنے سنہری روپہلی دو گنگا جمنی ترکش اور ایک کمان آویزاں ہے۔ دیوان خاص آئے۔ جو بقول فرگسن دنیا کا سب سے شاندار محل تھا۔ بادشاہت کی پیچ تھی۔ اس کے مرمریں در و دیوار، ستون، مرغول، محراب، فرش، چھت۔ ہر جگہ عقیق، مرجان اور بیش بہا پتھروں کی پچکاری، گل بوٹوں نے پڑی جھلملا رہی ہے۔ اجارے اور چھت کا حصہ تو گویا سونے سے لیپ دیا گیا ہے۔ سامنے صحن میں بیچوں بیچ چوکھنڈی کا سنگ مرمر کا مسند کٹہرا اور چاندی کی سفید براق چھت ہے۔ بیچ میں چاندنی کی سی نہر بہشت بھی رواں ہے، صدر میں ہشت پہلو مرمریں چبوترا ہے، جس پر تخت طاؤس رکھا ہے، یہ بھی سراسر سونے کا ڈلا ہے۔ چاروں طرف خوشنما محرابیں ہیں۔ گرد مسند کٹہرا۔ پشت پر گاؤ دار تکیہ۔ آگے تین تین جڑاؤ سیڑھیاں۔ اوپر محراب۔ گول قبہ نما چھت۔ سنہری کلیاں پاؤں میں رنگ برنگ کے پھول پتے۔ سامنے محراب پر آمنے سامنے دو موتیوں کی تسبیحیں منہ میں لئے کھڑے ہیں۔ نذر نذور سے دربار شروع دعاؤں پر ختم ہوا۔ شعراء قصیدے پڑھتے ہیں۔ خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوتے ہیں، شاہزادوں کے سر پر جیغہ۔ سرپیچ۔ گوشوارہ اور معزز امیروں کے سر پر گوشوارہ حضور بہادر شاہ خود اپنے ہاتھ سے باندھ رہے ہیں۔ بعد میں حضرت علیؓ کی نیاز دی۔ سب نے تبرک چکھا، پنکھا جھلنے کا شگون ہوا۔ چاندی سونا اچھالا گیا۔ بیلہ بٹا۔ تیسرے پہر کشتیوں میں بیٹھے۔ باغوں کی سیر کی مگر اس سے بھی کہیں زیادہ جشن کے ٹھاٹھ رہتے۔ یہ پادشاہ سلامت کی تخت نشینی کی سالگرہ ہوتی، پورا ایک چلہ رنگ رلیوں میں گذرتا۔ دس روز پہلے توڑے بندی شروع ہو جاتی۔ امیر امراء میں جیسی جس کو عزت اتنے خوان کا توڑا سرفراز ہوتا۔ چار دن باقی رہے مہمان داری ہونے لگتی۔ شاہزادیوں، امیرزادیوں سے محلات بھر جاتے۔ نت نئے شگون ہوتے طرح طرح کی تیاریاں کی جاتیں۔ شادیانے بج رہے ہیں۔ خلعت۔ انعام دیئے جا رہے ہیں۔ نذر نذور، مہمانداری۔ ناچ رنگ کی بہار ایک چھوڑ چالیس دن تک ہے۔۔

یوں ہی برس کے بارہ مہینے جشن رہتے۔ دن عید رات شبرات ہوتی۔ حویلی کی خوشوقتی سماجی زندگی سے گتھ گئی تھی وہاں سے جو مزے کی موج اٹھتی۔ ساری دلی اس شاداب ہوتی۔ ان دنوں حویلی ایک ایسا دریا تھی۔ جو خود بھی شاداب ہوا اور اپنی آبیاری سے اہلو پہلو کو بھی سرسبز کرتا جائے۔ محرم سے بقرعید تک دلی کا بچہ بچہ ایک سے جذبات کا نمونہ ہوتا۔ محرم غم کا مہینہ ہے۔ اس میں بادشاہ سے لگا فقیر، امام حسن حسینؑ کا فقیر بنتا۔ کوئی پیک ہے۔ کوئی نشانچی۔ جابجا پیاؤ سبیلیں لگی ہیں۔ شہیدوں کے نام کا شربت پلایا جا رہا ہے۔ کہیں مجلسیں ہو رہی ہیں، کہیں مرثیے پڑھے جا رہے ہیں۔ علم اور تعزیے اٹھتے ہیں۔ محرم میں دلی گویا سوگوار تو ہے مگر ان انوٹ اداؤں سے جو کسی خوبصورت سوگوار کی گوری گوری برہنہ کلائیوں، بکھرے بالوں میں ہوں! تیرہ تیزی[1] میں آخری چہار شنبہ آیا، قلعہ قلعہ کے

---

[1] بیگمات دلی صفر کو تیرہ تیزی، ربیع الاول کو بارہ وفات، ربیع الثانی کو میراں جی، جمادی الاول کو مدار، جمادی الثانی کو خواجہ معین الدین، شعبان کو شبرات، شوال کو عید، ذیقعدہ کو خالی، ذالحجہ کو بکرید (بقرعید) کہتی تھی۔

باہر میلے لگ گئے۔ بڑی رنگ رلیاں رہیں۔ سلونی میٹھی گھنگنیوں[1] پر نیاز ہو رہی ہے۔ سونے چاندی کے چھلے تقسیم ہوتے ہیں۔ تیسرے پہر سب بن سنور باغوں میں سبزہ روندنے گئے۔ صدقے بلیئے اتارے۔

بارہ وفات کے آتے ہی جا بجا قوالی کی دھوم مچی۔ مزاروں پر قوال بیٹھے گا رہے ہیں۔ قلعہ میں صبح شام مشائخوں اور ملانوں کو کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ چودھویں تاریخ قطب صاحب میں بڑے زور شور سے عرس ہوا۔ بادشاہ ان کے ساتھ سارا شہر خواجہ صاحب جا پہونچا۔ بادشاہ نے مزار شریف پر پھول۔ صندل۔ غلاف چڑھایا۔ دوسرے دن ختم میں شریک ہو سب رخصت ہو گئے۔ میراں جی میں حضرت غوث الاعظم کی بڑی دھوم دھام سے نیاز ہوئی۔ آتش بازی چھوٹی۔ سترھویں تاریخ سلطان جی میں حضرت سلطان نظام الدین اولیا کا عرس ہوا، یہی عرس عام طور سے سترھویں کے نام سے مشہور ہے۔ رات میں ختم ہوا۔ قوالی ہونے لگی۔ صبح کو حضور بادشاہ بڑے تزک و احتشام سے آئے۔ ان کے ساتھ سارا شہر امڈ آیا۔ درگاہ میں نذریں چڑھائیں۔ خادموں نے سر سبز پھینٹے[2] باندھے۔ تبرک دیا۔ کوئی باؤلی میں کود رہا ہے، کوئی سیڑھیوں پر نہا تا ہے۔ شہزادے امیرزادے باؤلی میں روپے پیسے پھینک رہے ہیں۔ لڑکے غوطے مار مار کے نکال لاتے ہیں۔ بازار میں خلقت کا یہ عالم ہے کہ کھوے سے کھوا چھلے۔ قسم قسم کی مٹھائی، کچوریاں، کباب، پراٹھے، لونگ چڑے اور جانے کیا کیا بک رہا ہے۔ چو طرفہ پتنگ بازی ہو رہی ہے۔ دو پہر دن آئے ہو حق کا غل و شور ہوا۔ بادشاہ ہمایوں کے مقبرے آئے۔ ساری خلقت ادھر ٹوٹ پڑی۔ شام تک یہاں میلہ لگا۔ ناچ رنگ رہے۔ مدار میں قلعہ کے نیچے چھڑیوں کا میلہ ہوا۔ درگاہ شریف میں بادشاہی لمبا لمبا نشان چڑھا۔ اس میں کرکری تاش کا پھریرا، جھل جھل کر رہا ہے۔ چھلیب دار ڈھول بجاتے ہیں۔ قلعہ سے مالیدہ کے خوان آئے۔ حضور عالم پناہ برآمد ہوئے۔ پھولوں کی بدھی پہنی۔ چھلیب داروں کو معمول دیا۔ رخصت کیا۔ کچھ دیر بعد میلہ ختم ہو گیا۔ خواجہ معین الدین کے مہینے چودھویں تاریخ سے خواجہ صاحب کی چھڑیاں ہونے لگیں۔ سولھویں تاریخ اجمیر شریف میدنی[3] رخصت ہوئی۔ بادشاہ نے چاندی کا نشان تامی کے پھریرے کا چڑھایا۔ کچھ دور میدنی پہونچانے گئے۔ چند روز میں لوگ پھر آئے۔ کنبے والوں نے جا بجا کھیجی[4]۔ انہوں نے درگاہ شریف کا صندل، صندل کی کنگھیاں۔ تسبیحیاں۔ تھولی۔ جامدانیاں۔ جے پور کے چادرے۔ انگوچھے۔ رومال۔ چندریاں۔ کلیاں۔ چلمنیں، عطر کی سوغات روانہ کی۔ رجب میں گھی کھانڈ اور میدے کی میٹھی روٹیاں تندور (تنور) سے پکوائیں۔ سونف خشخاش لگی ہے۔ روٹیوں پر مردوں کی تبارک ہوئی۔ اسی مہینے حضرت جلال بخاری کے کونڈے پلاؤ۔ زردہ۔ کھیر۔ جلیبیوں سے بھرے۔ نیاز دی۔ بانٹ دیے۔ شبرات میں اور دھوم مچی۔ طرح طرح کے حلوے۔ شیرمالیں۔ میدے کی پوریاں تیار ہوئیں۔ امیر حضرت صلعم۔

---

[1] چنوں کو ابال کر نون مرچ لگا کر سلونی، گیہوں کو ابال کر خشخاش اور کھانڈ ڈال کر میٹھی گھنگھنیاں بناتے ہیں۔

[2] دس بارہ گز کا سبز کپڑا خادم لوگ سر پر لپیٹ دیتے ہیں۔

[3] خواجہ صاحب اکٹھے ہو کر جو لوگ اجمیر شریف جاتے ہیں۔ انہیں میدنی کہتے ہیں۔

[4] دھوے تل۔ چانول۔ کھانڈ سینیوں میں لگا کر بھیجی جاتی ہے۔

حضرت امیر حمزہ۔ حضرت بی بی فاطمہ۔ بڑ بڑ بڑے[1]۔ بابر بادشاہ، دودھ کے آبخوروں پر معصوم بچوں کی جدا جدا نیاز ہوئی۔ حضرت بی بی فاطمہ کی نیاز کا بیوی زنوں کو باہر بادشاہ کی نیاز کا خاص ان کی اولاد کو باقی ہمہ شما کو بٹ گیا۔ حصے بخروں کے خوان آنے جانے لگے۔ پتنگ بازی۔ آتش بازی۔ تاشے۔ مرفے۔ باجے۔ نوبت نقارے کا چوطرف شور مچ گیا۔ شام بادشاہ اماماڑہ آئے۔ اپنے ہاتھ سے روشنی کی۔ کنگنی کی کھیر چکھی۔ ایک ایک چمچہ سب کو دی۔ رمضان شریف آیا۔ اس کا پوچھنا ہی کیا۔ یہ تو ایک مہینے کچھ دن کا تہوار تھا۔ سارا مہینہ ایک ایک گھنٹہ گن گن کر گذرتا۔ گیارہ مہینے کی کمائی ہر شخص اس مہینے گھر بیٹھکر کھاتا۔ خود بھی اس کا بڑا احترام کرتے۔ پچھلے پہر تو بیں چلیں ڈنکے بجے۔ سب نے سحری کی۔ روزے کی نیت کی۔ کوئی کلام اللہ لے بیٹھا۔ وظیفہ کوئی پڑھنے لگا۔ فجر کی نماز کے بعد کسی نے آرام کیا۔ گرمی ہوئی تو کوئی دریا کی سیر کو نکل گیا۔ کسی نے تیتر۔ بٹیر۔ اگن کے لال سفید بستیوں دار پنجرے لئے اور کرم جگاتے جنگل نکل گیا۔ کوئی پھولوں کا دونا لئے ہوئے مزاروں پر چلا جاتا ہے۔ سورج نکلا۔ شہر سنہری دھوپ کے نور میں ڈوب گیا۔ اب نو دس بجے ادھر درزن ڈھلے ادھر۔ بازاروں میں گھما گھمی ہوتی۔ قلعہ سے لگا سارے شہر میں نت نئے پکوان ہو رہے ہیں۔ پتیلیاں ٹھنٹھنا رہی ہیں۔ تن بھاون چیزیں پک رہی ہیں۔ گھڑی بھر دن رہے روزہ کشائی لگنی شروع ہوئی۔ قسم قسم کے شربت۔ تخم ریحاں۔ فالودہ۔ لیموں کا آبشورہ تلمی بڑے۔ دہی بڑے۔ لونگ چڑے۔ مچھلی کے کباب۔ پھلکیاں۔ سیو دال۔ پالک کے پتے۔ طرح طرح کی ترکاریاں، رکابیوں۔ سینیوں میں لگائی گئی گئیں۔ لے لو وہ سورج غروب ہوا مشرق سے سیاہی پھیلی۔ بادشاہ نے اشارہ فرمایا۔ ہرکارے نے جھنڈی ہلائی۔ وہ روزے کی توپ دغی۔ دھائیں۔ چوطرف اذانیں ہونے لگیں۔ سب نے جلدی جلدی آب زمزم۔ مکے کی کھجور یا چھوارہ سے روزہ کھولا۔ کٹورے پہ کٹورہ غٹ غٹ شربت پیا۔ ذرا ذرا سی دال ترکاری میوہ چکھا۔ نماز کے لئے کھڑے ہوگئے۔ رات میں تراویوں (تراویح) کی چہل پہل رہی۔ محلہ کی کوئی مسجد نہیں جہاں سے کلام اللہ کی آواز نہ آتی ہو۔ اس سے بخت ہوئے، گیارہ بارہ بجے ذرا کمر سیدھی کی ایک ڈیڑھ بجے چوکیدار آن پہونچے: کوئی لے داری سے کہتا ہے: روزہ دارو! اللہ کے پیارو! اٹھو دینداروں اٹھو۔ کوئی کہتا: جاگیو بابا بھلا ہوگا۔ اور جاگنے میں خدا ملا ہے گا۔ بس یہ سمجھئے سارا مہینہ یونہی چہل پہل سے گزرتا۔ آخری جمعہ کو الوداع کے ٹھاٹھ رہتے انتیسویں تاریخ ہوئی اور سب کی آنکھیں آسمان پر لگ گئیں۔ سانڈنی سوار چاند کی خبر کو روانہ ہوئے۔ کہیں چاند دیکھ لیا گیا۔ تو گواہی آ گئی۔ خوشی خوشی سب نے جوان عید کی تیاریاں کیں نہیں تو بوڑھی عید تو کہیں گئی نہیں۔ دوسرے دن صبح سویرے دودھ سوئیاں کھائیں۔ بنے سنورے۔ خوشبوؤں میں بسے بچے، جوان، بوڑھے سب رتھ، پالکی، مانگی اور تام جھام میں عیدگاہ پہونچے۔ بادشاہ کا جلوس بھی عیدگاہ روانہ ہوا۔ یہاں پہونچکر دوگانہ ادا کیا۔ خطبے سے پہلے توشہ خانہ[2] کے داروغہ نے امام جی کے گلے میں کلابتونی پرتلہ اور تلوار ڈال دی۔ امام جی نے خطبہ پڑھا ختم پہ سب بغلگیر ہوئے۔ دھائیں دھائیں سلامی کی توپیں سر ہوئیں۔ بادشاہ نلگدمبر[3] میں سوار ہوئے۔ بیٹھک آئے۔

---

۱؎ بزرگ۔ ۲؎ سلح خانہ۔ ۳؎ عماری کی صورت ایک ہوادار ہاتھی پر کس دیتے تھے۔

یہ مرمریں عمارت بھی اپنی نفاست، نزاکت اور منبت کاری سے کبھی قلعہ کی جان گنی جاتی تھی۔ اس کے شمالی، جنوبی محرابوں پر سعداللہ خاں کے مشہور کتبے اور اجارہ کے نزدیک آب زر سے لکھے ہوئے اشعار پوری داد حسن و کمال دے رہے ہیں شہ نشین کے آگے زر سنگ مرمر کا چمن کار نہایت لطیف پچدرہ دالان ہے، جس کے غربی حجرے میں خاص ڈیوڑھی سے ہو کر دیوان خاص رستہ نکل جاتا ہے۔ دالان کے بیچوں بیچ مرمریں مستطیل حوض ہے۔ اس کی تہ پر طرح طرح کے رنگین اور بیش بہا پتھروں کے گل بوٹے، پھول پتے بنے ہوئے ہیں، ہر پھول کی پنکھڑی میں باریک سوراخ ہے جن سے پانی ابل رہا ہے، دالان کے آگے مرمریں صحن ہے، جس میں موتی سی نہر بہشت بہتی ہوئی محلات چلی جاتی ہے۔ یہاں سے ہو کر بادشاہ دیوان خاص آئے۔ تخت طاؤس پر دربار کیا۔ نذریں۔ پھولوں کے طرّے اور ہار مرحمت فرمائے۔ بقرعید میں بھی یونہی عیش رہے۔ ہاں قربانی کا لطف اور بڑھ گیا۔ شہر کا چپہ چپہ خوشی سے معمور ہے۔ شہر والے گرم گرم کچوریاں، مٹھائیاں۔ کباب لئے چلے آتے ہیں۔ کوئی عید ملنے جا رہا ہے۔ کوئی بازدید کو چلا آتا ہے، ایک دھوم مچی ہے۔ چیل کوّوں کی طرح تنگیں، تکلیں دوڑتی ہیں۔ سبز باغات بسائے۔ لطف اڑائے۔ یہ تو مسلمانوں کے تہوار ہوئے۔ اہل ہنود کے بڑے تہوار بھی قابل دید و شنید ہوتے۔ دسہرہ آیا۔ بادشاہ کے سامنے ایک نیل کنٹھ اڑا دیا گیا۔ بازخانہ کا داروغہ باز اور شکرہ لیکر آیا۔ بادشاہ نے ہاتھ پر بٹھایا۔ تیسرے پہر ہندو امرا نے نذریں پیش کیں۔ بادشاہ جھروکوں میں آن بیٹھے۔ عمدہ فیل، یوزک رکاب برخاست ہوا۔ شاہی اصطبل کا داروغہ خاص گھوڑوں کو رنگ رنگا سنہری روپہلی ساز لگا کر جھروکوں کے نیچے لایا۔ ملاحظہ ہوا۔ انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔ نو دن رام لیلا کے ٹھاٹھ رہے۔ دسویں دن بھرت ملاپ ہوا، اس میں ہر سال گویا ہندو مسلمان دو بھائی ملتے۔ پیار و محبت استوار کرتے۔ دیوالی آئی۔ جابجا نوبت۔ نقارے۔ روشن چوکی بج رہی ہے۔ کھیلیں۔ بتاشے۔ کھانڈ، مٹی کے کھلونے اور گنے کی اونچی اونچی ہنڈیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ دوکانوں پر ہیجڑے "پھلا دے رے مورے تائیں" گاتے پھر رہے ہیں۔ حلوائیوں نے جھر جھر تھالی مٹھائیاں۔ رنگ برنگ کی لوزائیں بنائیں۔ طرح بطرح سجائیں۔ پہلے دئے سے تیسرے دئے تک ایسی روشنی ہوئی کہ سارا شہر دن بن گیا۔ تیسرے دئے کو بادشاہ سونے چاندی میں تلے۔ ایک بھینسا۔ کالا کمبل۔ کڑوا تیل۔ ست نجا۔ سونا۔ چاندی بادشاہ پر سے تصدق ہوا۔ قلعہ میں بھی خوب روشنی ہوئی۔ اہل ہنود نے جابجا حصے بھیجے۔ احباب نے جا کر مبارکباد دی۔ وہ بازدید کو آئے۔ رتھبانوں۔ گھوسیوں نے بیلوں۔ گائے۔ بھینسوں کے پاؤں میں مہندی لگائی۔ زنگار رنگ کی اون پر نقاشی کی۔ سینگوں پر قلعی اور تاش کی سنگوٹیاں۔ گلے اور پیروں میں گھنگرو۔ بانات کی زردوزی جھولیں ڈالیں۔ چھم چھم، چھم چھم یہ انہیں اپنے اپنے ٹھکانوں پر لیکر گئے۔ ڈھال سنکھ۔ تاشے۔ باجے بجا کر انہیں نچایا۔ انعام و اکرام لئے۔ رہی ہولی تو یہ بھی بھانت بھانت کے سانگ سے دلّی کی چیز بنجاتی۔ بازاروں۔ گلیوں۔ گھروں میں رنگ کھیلے جا رہے ہیں۔ دف۔ جھانجھ۔ نفیری بج رہی ہے۔ جا بجا طائفے ناچ رہے ہیں۔ شہر کے سارے رنگ ایک ایک کر کے قلعہ پہونچتے۔ حضور عالم پناہ ہندو مسلمان امرا ایک طرف، بادشاہزادیاں، امیرزادیاں دوسری طرف جھروکوں میں بیٹھی ہیں۔ رنگ، سانگ آ رہے ہیں۔ انعام لے کر جا رہے ہیں۔ کبھی بادشاہی طائفے ہولی کھیلتے۔ بادشاہ تشریف فرما ہیں۔ چار کا فرادا ہیں بھر بھر پچکاریاں ایک دوسرے پر ڈال رہی ہیں چار ناچ گا رہی ہیں:-

رنگ میں کیسے ہوری کھیلونگی سانوریاں کے سنگ ...... رنگ

۱ـ ندی کنارے دھوبی دھوئے چولی کے دو بند
کس پاپی کی نجر پڑی تو چولی ہو گئی تنگ ....... رنگ

۲ـ ندی کنارے بگلہ بیٹھا مچھلی چن چن کھائے !!!
بڑی مچھلی کا کانٹا چبھا تو تڑپ تڑپ مرجائے
رنگ میں کیسے ................. رنگ۔

شہر کے تیج تہوار کے سوا بھی ان منچلوں سے باہر کی رعنائیاں نہ چھوٹتیں۔ کالکا کا میلہ ہو یا میرٹھ کی نوچندی۔ حضرت پیران پیر کلیر صابری یا خواجہ اجمیری کا عرس ہو۔ یہ ہر جگہ وارد ہیں۔ ان باتوں سے طبیعت میں اپنے آپ ایسی ہلکت پڑ گئی کہ عید برات ہو یا نہ ہو ان کے دل کا کنول کھلا رہتا۔ ان کے ہاں زندگی کا دوسرا نام گویا ہنستے کھیلتے آنا اور چلا جانا تھا۔ آج وہ لوگ نہیں۔ ہم دوسروں کی دیکھا دیکھی بہت کچھ بھلا بیٹھے اور یہ نہ سمجھے: کہ استخواں فروشی کی طرح "استخواں فراموشی بھی گناہ ہے"۔ اگلی باتیں بجز دکھائی دینے لگیں۔ مگر یاد رکھو: کہ زمانہ اچھے یا بروں کو نہیں بھولے گا۔ یہ ان آقاؤں کے خادم۔ ان مہاراجاؤں کے پرجا ہیں۔ جو ہندی تمدن کی آن بان تھے۔ جنھوں نے ہندوستان فتح ہی نہیں کیا، بلکہ اسے اپنا مالوف وطن، پیارا گھر بنایا۔ اور جس طرح انسان اپنا گھر بسا کر سجاتا رہتا ہے انہوں نے بھی اپنی زبان۔ سیاست۔ تعمیر۔ معاشرت۔ ذہنیت۔ موسیقیت۔ شاعری۔ خوشوقتی۔ اور اور علم و فن سے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ یہی وجہ تھی جو رنگین راج کی رنگین پرجا خالی دنوں میں بھی دن عید رات شبرات منانی تھی۔ گرمی میں گرمی، جاڑے، برسات میں سدا دن کے سے ٹھاٹھ رہتے۔

گرمی آئی۔ فجر کی نماز سے فارغ ہو کوئی جمنا گیا۔ کوئی جنگل نکل گیا۔ کہیں دیکھو تو کسرت ہو رہی ہے۔ اور کہیں ڈنٹ۔ کچھ بھلے مانس میر محل کے ارد گرد مونڈھے بچھائے ادھر ادھر کی باتیں اڑا رہے ہیں۔ کچھ محلسرا میں امیر امرا کی مصاحبت میں جا پہونچے۔ یہاں صحن میں طرح طرح کے پھول بہار دکھا رہے ہیں۔ ایک طرف کورے کورے مٹکے گھڑونچیوں پر سلیقہ سے رکھے ہیں۔ بجھیروں پر صراحیاں ہیں۔ جن پر اجلی اجلی صافیاں لپٹی ہوئی ہیں۔ چاندی کے نقشین کٹورے ڈھکے ہوئے ہیں۔ بیچوں بیچ مچھلی بھون[۱] ہے۔ جس کے گرد جنگی تخت بچھے ہیں۔ ان پر سفید سفید نین سکھ کی چاندنیاں سفید بگلا سے لگی لگی گاؤ تکیے۔ چنبیلی کے جال کی براق سی سوزنیاں بچھی ہیں۔ کونوں پر گلناری تراش کے میر فرش رکھے ہیں۔ آنکھ میں میل اس فرش فروش پر میل کا نام نہیں۔ اندر جاؤ تو روشن روشن کھلا کھلا مکان۔ خوبصورت شہ نشین۔ نفیس نفیس صحنچیاں۔ سفید جھک در و دیوار۔ جن سے آنکھوں میں نور آئے۔ جی روشن ہو۔ طاقوں میں نفیس نفیس۔ رنگ رنگ طاق پوش، جن پر چانچی کے گلدان، اور گلدانوں میں پائیں باغیچہ کے بنے گلدستے سجے ہیں۔ جا بجا چنبیلی اور مولسری کی لڑیاں لٹک رہی ہیں، پیش میں اگن۔ بلبل۔ ابلقہ۔ دیشر۔ بیا۔ تیتر۔ بٹیر۔ طوطا۔ مینا۔ جنڈول لال دیدڑیوں کے پنجرے لٹک رہے ہیں۔ سامنے

---

[۱] وہ حوض جس میں رنگین مچھلیاں ڈالدیتے ہیں۔

صحن میں ایک طرف کابکیں[1] ہیں۔ یاہو[2]۔ لوٹن۔ چوہے چندن خال۔ زرد بند۔ شیرازی کے جوڑے جھول لینے کے لئے پلے ہوئے ہیں۔ چھت پر جال میں۔ چھتر[3]۔ جنگلا۔ لال بند لمبا۔ ویٹر۔ پڈید۔ زرد جوگیا۔ لال جوگیا۔ ہرا۔ نیلا۔ ابا بیلیا ایک سے ایک اعلیٰ کبوتر تیواز[4] پر بیٹھا ہے۔ پہلے کھولکر انہیں ہڑ کسکردی۔ پھر چھیپی[5] سے اٹھا دیا[6]۔ دہ تا[7] داکاٹ کرلوٹ[8] ان لوٹوں ان جا صیدی[9] کے جھڑ[10] سے لڑ گئے۔ یوں دوسرے کا کبوتر چڑھ[11] آیا تو مار لیا[12]۔ ورنہ اپنا کھو بیٹھے۔ اچھا تو اس طرح کہیں کبوتر بازی ہو رہی ہیں۔ کہیں باتیں ہو رہی ہیں سب کے سب ثقہ صورت۔ شگفتہ مزاج۔ مرنجاں مرنج۔ سڈول جسم۔ چوڑا ابھرا ہوا سینہ۔ پتلی کمر۔ بنے ہوئے ڈنڑ۔ ان میں کسی کا سر منڈا ہوا۔ لبیں کتری ہوئی۔ ڈاڑھی بڑھی ہے۔ کسی کے پٹے، زلفیں اور خشخشی ڈاڑھی ہے۔ چکن۔ شربتی ململ۔ ڈوریا، یا جامدانی کا نیچی چولی کا انگرکھا، جو سینہ اور ڈنڑوں میں کھبا جاتا ہے۔ گلبدنی۔ نین سکھ کا ایک بڑا یا تنگ موری کا پاجامہ۔ گھیتلی۔ کفش۔ سلیم شاہی جوتی چوگوشیہ۔ ہشت پہلو۔ دوپلڑی۔ جالیدار یا ارخ چین کی ٹوپی۔ ہاتھ میں لٹھے کا چوکور رومال۔ ٹھوس بانس کی سیاہی مائل چمکیلی لکڑی۔ کوئی بانک۔ بنوٹ۔ نیزہ بازی۔ گھوڑے سواری۔ پھینک پٹا۔ پہلوانی۔ تیراکی۔ لیزم۔ اکسنگ۔ غلیل بازی۔ نعل برداری کا ذکر کر رہا ہے۔ کہیں میر پنجہ کش جید خوشنویس۔ محمد جان۔ آغا صاحب۔ احمد جان۔ امام الدین۔ بدرالدین۔ کے فن و کمال کی داد دی ہو رہی ہے۔ یہ بدرالدین کون؟ وہی جن کے پاس ولایت سے ملکہ معظمہ کی مہر کھدنے آئی تھی۔ کہیں دیکھو تو شاہ ناصر وزیر، مرزا کانے، مرزا گوہر یا ان کے شاگرد ہیں اور ستار کے کمال دکھا رہے ہیں۔ دھوپ میں تیزی بڑھی تو خسخانوں میں آن پڑے فراشی پنکھا چل رہا ہے۔ خس کی ٹٹیوں پر ہزاروں سے پانی چھڑکا جا رہا ہے، یہ امیر امرا کا حال ہے۔ دوسرے ملازم پیشہ اور دوکاندار اور اور متوسط طبقہ بھی چین سے گزارتا۔ بازاروں، گلیوں سے ترکاری والوں کی سہانی آوازیں چلی آ رہی ہیں۔ وہ اس مزے سے ترکاریاں بیچتے کہ ان ہوئے کا جی للچائے۔ بن بلائے آن پھنسے:۔ "ریشم کے جال میں ہلایا قدرت کا او دا بنا جلیبا کھالو۔ بارش کے رنگ لال ہیں پکے جی رنگ لال ہیں۔ شرطی[12] لگائے ہیں میٹھے جلیبیوں سے میٹھے۔ ڈالی[13] کا کھلا ہیو نڈی ہے۔ سانولے سلونے، کیا رنگیلے فالسے لگا دیئے ہیں، شربت کو۔ کھیرے کی نوبہار ہے، کھیرا ختگی کھیرا۔ انگور کا مزہ ہے رنگترے میں۔ گلابی باغ کا شیریں آلوچہ۔ برف والے قلفیاں (قفلیاں)، جما کے لے آئے۔ تو وہ ٹھنڈی میٹھی برف کھانے لگے۔ نہیں تو کیوڑہ گلاب بسی گنڈیریاں بیٹھے چوس رہے ہیں۔ شام میں نہا دھو سفید براق سے کپڑے پہن سب عطروں میں بس گئے۔ گلے میں موتیا کے کنٹھے ڈالے۔ کوئی چوک پہ آیا، کوئی جاوڑی نکل گیا۔ کسی نے چاندنی چوک کی سیر کی، یہاں جابجا شربت کی دوکانیں لگی ہیں۔ بڑے بڑے اولے۔ فالودہ۔ تخم ریحاں ڈال ڈال کے طرح بطرح کے شربت دوکاندار دے رہا ہے، کٹورے پہ کٹورے اترے چلے جاتے ہیں۔ سقے کٹورے چھل پلا رہے ہیں۔ بھری مشک کاندھے پر،

---

[1] کبوتروں کے لکڑی کے گھر۔ [2] اقسام کبوتر [3] اقسام کبوتر [4] جال کی لکڑیاں جنپر کبوتر بیٹھتے ہیں [5] ایک لکڑی جس میں کپڑا باندھ کر کبوتر اڑاتے ہیں۔ [6] اڑا دیا۔ [7] حلقہ میں اڑکر۔ [8] مخالف۔ [9] مل آیا۔ [10] پکڑ لیا۔

[11] تربوز۔ [12] خربوزے۔ [13] آڑو۔

جس پر کھار دے کا تر بتر کپڑا پڑا ہوا ہے۔ بڑے تپاک سے کہہ رہے ہیں: "میاں پانی لاؤں! آب حیات کے دو گھونٹ پیجئے گا" رات ہوئی کوٹھوں پر پلنگ بچھے۔ سفید سفید دودھ سی چادریں پڑی ہیں۔ سرہانے مولسری، موتیا، چمپا، زرد چنبیلی کے پھول پڑے ہیں۔ خس کی گیلی پنکھیاں جھل رہے ہیں۔ کوئی کھڑی چارپائی پر پڑا کروٹیں بدل رہا ہے۔ چاندنی راتیں ہوئیں تو یار دوست فالیز گئے۔ خوب تربوز خربوزے کھائے۔ پھاوڑا۔ کبڈی کھیلی۔ ناچ گانا سنا۔ صبح نہا دھو گھر آ گئے۔

گرمی گئی برسات آئی۔ آٹھ آٹھ دس دس دن جھڑی لگی ہے۔ کیا مجال جو ذرا کھلے۔ آسمان نظر آئے۔ ابھی پھیّاں پھیّاں مینہ برس رہا تھا کہ ایکا ایکی بھورے بھورے بادلوں کی ریل پیل ہوئی۔ موسلا دھار برسنے لگا۔ کئی کئی روز سورج دکھائی نہ دیتا۔ کبھی کبھی دن میں آفتاب بجلی کی طرح چمک جاتا۔ یا رات میں تاروں کے جگنو ذرا کی ذرا نظر آ جاتے۔ ورنہ آٹھوں پہر گھٹائیں تلی کھڑی ہیں۔ اس سمے باغ آباد ہو جاتے۔ کوئی خواجہ صاحب گیا۔ کوئی سلطان جی پہونچا۔ ایک سے ایک تحفہ سلونی، میٹھی، مٹھلونی چیزیں تل تل کے آ رہی ہیں۔ کہیں گرم گرم بری پراٹھے اتر رہے ہیں۔ کہیں سرولی۔ گولڑا۔ سیندوریا۔ لنگڑا آدم بھیگا ہوا ہے۔ سب بیٹھے مزے سے کھا رہے ہیں۔ کہیں کھم گڑھے ہیں۔ کہیں درختوں میں جھولے پڑے ہیں، اور شہر کی بہو بیٹیاں پور پور مہندی رچائے، گلنار جوگیا، ملاگیری۔ جوڑے، دھانی چوڑیاں پہنے جھول رہی ہیں۔ لہک لہک ملار گا رہی ہیں۔ لو وہ جمنا چڑھ آئی۔ تیراکی کا میلہ لگا، دو کا لگ گئیں۔ خونچے والے بھی پہونچے۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ سیلانیوں کے جمگھٹ ہیں۔ تیراک کمال دکھا رہے ہیں۔ دوکانوں میں گرم گرم اندرسے کی گولیاں۔ سہال۔ پھپیاں اتر رہی ہیں۔ لوگ لے لے کر کھا رہے ہیں۔ کہیں سے یہ آوازیں آ رہی ہیں:۔ "کاٹے بھوڑ لے نون کے بتاشے میں نکیں لو۔ پال میں ڈالے ہیں جی گرانے کے لڈو والو۔ بیڑ کے پکے امرود میں سیب کا ہی مزہ ہے" کہیں کچالو بک رہے ہیں۔ کوئی کھٹے چنوں کی آواز لگا رہا ہے۔ "رنگیلے چٹپٹے چنے ہیں بارہ مسالے کے۔ کرارے بھر بھرے ہیں جی، نیمو (لیمو) کے رس کے۔ نو بہار کیلے۔ بھٹے بھی لینا ہری ڈال والے! لینا جی پیتی کے کیلے میں کا مزہ" غرض جان کی ایک گہما گہمی اور جان میں بھی زندہ دلی کی ایک چہل پہل نظر آتی ہے۔ جس سے اپنے آپ دل کی کلی کھلے۔

جاڑے میں جاڑے کے سے ٹھاٹھ ہیں۔ سب اوڑھے لپیٹے ہیں۔ صبح آٹھ نو بجے تو کہیں جا کر لحافوں سے نکلے۔ مگر دالانوں کے پردے جوں کے توں ہیں۔ انگیٹھیاں روشن ہیں، پھر بھی تھر تھری چھوٹ رہی ہے۔ لے لو وہ چنے والا، حلوا پوری والا آیا۔ بھولے بھولے خستہ چنے۔ مٹر۔ گرم گرم حلوا پوری چٹ کی۔ نہیں تو نہاری۔ خمیری روٹی اڑائی۔ دس گیارہ بجے اللہ اللہ کر کے گھر سے باہر قدم نکالا۔ اب بھی سی سی۔ ہی ہی سے چھٹکارا نہیں۔ جسے دیکھو روئی کا بنولہ بنا ہوا ہے۔ بتیسی بج رہی ہے۔ کہیں مہاوٹ برس گئی تو بس سمجھو: "سردی کا باوا" آ گیا! نہ آگ میں گرمی۔ نہ دھوپ میں گرمی۔ عجب سماں ہو گیا۔ رات میں جا بجا برف پڑنے لگی۔ پانی جمنے لگا۔ ولایت سے سیب۔ انگور۔ انار۔ پستے۔ بادام۔ اخروٹ۔ چلغوزے۔ کاجو۔ اور اور تر و خشک میوہ بھر بھر بوریاں چلا آتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔ دیسی ترکاریوں کی بہار جدا ہے۔ بازاروں، گلیوں میں غل مچا ہوا ہے۔ شاہ[۳] مرداں کی لالڑیاں،

---

۱ جامنیں۔ ۲ گولڑے آم۔ ۳ گاجریں۔

علی گنج کی ہیں جی گڑھ سے میٹھیاں۔ کاغذی گری کے بھنا دیئے ہیں بادام، کالے پہاڑ کی سوندیاں بیج بیجیوں ہی میٹھیاں۔ باغ والوں کی گنڈیریاں ہیں بیر۔ ہرے بھرے بونٹ لڑیوں میں پہلے! آدمیاں سیر میں سوا سیر ناج۔ گجرات کے چبینے ترمیوے میں کھریان لو۔ پیاری لاڈو نے توڑے ہیں۔ بیر! گھونگٹ والی نے توڑے ہیں بیر"۔ کہیں ددھیا۔ جوزی۔ حبشی۔ گوندے کا۔ گری کا۔ بیڑی کا حلوا سوہن تھالوں میں جما اور سجا ہے۔ کہیں گاجر کی تری تیار ہو رہی ہے۔ کہیں قسم قسم کی گجک۔ تل بھگنے کے لڈو۔ کڑا کے داریٹی۔ ریوڑیاں ہیں۔ گھروں میں رساول۔ باجرے کا سوندا سوندا ملیدہ بن رہا ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھائے جاتے ہیں۔ منہ چلے جاتا ہے۔ ادھر کھایا۔ ادھر ہضم۔ جیسے دیکھو لال لال انار کا دانہ بنا ہوا ہے۔ چلّوؤں خون بڑھ رہا ہے۔ عیدگاہ دنگل بندھ رہے ہیں۔ کالے جن والے۔ دری والے، گوند شاہ والوں کے پٹھے لڑ رہے ہیں۔ تیتر۔ بٹیر۔ گلدم کی پالیاں الگ ہیں۔ اسی زمانے پتنگ بازی کے ہاتھ لگتے۔ سلیم گڈھ پر شاہی پتنگیں، تکلیں لڑنے لگیں۔ عام لوگ جنگلوں میں نکل گئے۔ کانڑا۔ ٹِگلا۔ انگارا۔ مانگ دار۔ زلفوں دار۔ جنیو دار۔ کندے کھلی۔ سر کھلی۔ ادھ رنگی۔ پری۔ رنگ برنگ کی پتنگیں اور تکلیں اڑ رہی ہیں۔ پیچ ہو رہے ہیں۔ بیچ کا پیچ ہوا تو ایک جھول میں گھسا آتا ہے۔ دوسرا ادپر سے قط کا سخا تر رہا ہے۔ لو دونوں نے ڈوریں ملا دیں۔ پیچ چبنے لگے۔ جس کا موقعہ بنا پیچ نکال کے لے گیا۔ واہ واکا شور مچا۔ رات میں سب رات میں سب دبکے دبکائے مردانوں میں بیٹھے ہیں۔ دیسی کرارے پان پر پان اڑ رہے ہیں۔ جن کی سہانی مہکار چلی آتی ہے۔ کہیں گنجفہ ہو رہا ہے۔ کہیں کعبتیں۔ کہیں شطرنج ہو رہی ہے۔ کہیں چوسر۔ کہیں علم کی پالی جمی ہے۔ حقایق و معارف کے دقیق مسایل طے ہوتے ہیں۔ صخرا کبر پھڑک رہے ہیں۔ رمل۔ جفر سے لگا فقہ حدیث اور جانے کیا کیا بحثیں ہوتیں۔ شاعری کا عام چرچا تھا۔ اوستاد ذوق، مرزا غالب کے حامی موالی جا بجا تھے۔ مشاعروں میں ان کی لے دے رہتی، ہد ہد۔ زاغ۔ زغن، کی چونچیں جدا ہوتیں۔ ایک کہتا ہے "اردو میں مرزا نوشہ کی طرز جدید تو واقعی اپنا جواب نہیں رکھتی"۔ دوسرا کہتا:۔ "غالب شعرا کے شمار میں تو ہیں نہیں۔ ایک تو انہوں نے قصیدے نہیں کہے کہ قصیدہ فن کی کسوٹی ہے۔ دوسرے بے استادے ہیں۔ اپنی خفت کے مٹانے کے لئے تو مولوی عبدالصمد نامے انہوں نے زبردستی استاد گڑھا۔ کوئی خضر راہ ملا نہیں۔ جبھی تو بیچارے تخیل کے اندھیرے میں ٹپے ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی:۔

منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

میر صاحب! تمہیں خدا کی قسم ذرا دیکھنا۔ اس میں کہاں کا فلسفہ آن ٹھنسا۔ ان باتوں سے باہر والے بھی تو منہ آنے لگے۔ ایک صاحب کہتے ہیں

---

۱ سنگھاڑے۔ ۲ کچریاں۔ ۳ جھاڑی بوٹی کے بیر۔ ۴ گنے کے رس کی کھیر۔ ۵ ہُبُل۔ ۶ جلسے منعقد ہوتے۔

۷ میر علی احمد نام۔ مومن خاں مرحوم کے جلیسوں میں تھے۔ غدر میں سارا خاندان تہ تیغ ہو گیا۔ تنہا رہ گئے تھے۔ دلی کی معاشرت کا جیتا جاگتا نمونہ۔ علم نجوم میں لاجواب۔ مزاج میں سورج کی سی توانائی، زہرا کی سی رعنائی۔ چاند کی سی سج دھج تھی، چتلی قبر سید رفاعی کی مسجد کے سامنے بساط کی دوکان کھول لی تھی۔ یہاں بھی علم کے رسیا جمع رہتے۔ نت نئی گتھیاں سلجھتی رہتیں نہیں تو شطرنج ہوتی۔ کوئی دس سال ہوئے انتقال ہوا۔ انا للہ... الخ

اگر خواجہ صاحب دیکھے بغیر کوئی یہ کہے کہ میں لاٹھ پر ٹھہر اوپر گیا تو وہاں سے کھنڈرات کا یہ منظر تھا۔ یہی لاٹھ اگر دو چار کھنڈر اور اونچی ہو جائے تو یہ نہیں یہ بات ہو گی۔ "بھلا آپ ہی فرمائیے۔" ایسے بڑ بولے کو آپ کیا کہیں گے۔ نہیں تو خدارا بتائیے۔ عرش پر جانا کجا جیسے وہاں کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس کی یہ لن ترانیاں آخر کیا معنے رکھتی ہیں۔" اس پر ایک فرمایشی قہقہہ پڑا، اور میر صاحب بڑے تپاک سے بولے:۔ "خانصاحب! یوں کہو باہر والوں کا جادو آپ پر بھی چل گیا۔ مگر مشفق! تمہیں یہ باتیں سزاوار نہیں۔ تم دلی والے ہو۔ دنیا انگلی اٹھائے گی۔ یہ بھی کوئی عقلمندی ہے کہ شاعر عرش پر کب پہونچا۔ پہونچا یا نہ پہونچا؟ عرش کسی کے چچا جان کا گھر تو ہے نہیں! اماں۔ مجھ سے پوچھوں تو عرش اس کے پہلو میں ہے، جہاں اس کا ننا سا پہلو نشین خدائی کرتا ہے! یہ اور بات ہے:۔ راہگیروں کو اس کا دماغ نہ ہو۔ بھائی ایک بات کہتا ہوں۔ یاد رکھو گے۔ یاد کرو گے۔ شاعر پر الہام ہوتا ہے۔ یہ تلامذۂ رحمٰن ہیں۔ اس کی باتوں پر اسی کو زبان کھولنی چاہیے، جسے حضرت حق یہ مرتبہ نصیب کرے۔ نہیں تو چپکا بیٹھا آدمی سنتا رہے۔" دوسرے بولے:۔ "میر صاحب! مگر یہ تو فرمائیے استاد ذوق پر بھی الہام ہوتا ہے؟ انہیں تو قصیدے کی صورت میں ہوتا ہوگا؟" یہ سن کر میر صاحب مسکرائے اور کہنے لگے:۔ "بھئی اس پر نہ جاؤ یہ اس زمانہ کا عام رنگ تھا۔ مگر ان کی جو چیزیں واقعی الہامی ہیں ——— کیونکہ رطب و یابس دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر کے ہاں ہوتا ہے ——— تو یقین مانو وہ لاجواب ہیں۔ آپ یہ کہیں۔ میں تو انہیں شاعر سے زیادہ استاد سمجھتا ہوں۔ میر صاحب ہنسنے لگے اور کہا:۔ بھئی تم جو چاہو سمجھو۔ مگر عرش تک ان کی رسائی بھی دیکھ لو:۔

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اسکی فروتنی ہے
وگرنہ قندیل عرش میں بھی اسی کے جلوہ کی روشنی ہے

یوں نا سمجھ حضور بہادر شاہ کے کلام کو جو استاد کا نتیجۂ فکر کہتے ہیں۔ مگر استاد استاد ہیں، بادشاہ بادشاہ۔ ان میں ایک ذوق کیا، شاہ نصیر، غالب، میر، درد، اکثر کا رنگ ہے۔ زبان گھری ہے۔ سادگی تازگی، پاکیزگی، جذبات۔ احساسات۔ اثر و گداز ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ مگر اظہار ذات میں وہ اچھوتے رہیں یہ رہے ہیں۔ اسو طیکہ صورت کی طرح انسان کے شمائل نفسی بھی ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔ خارجی اثرات کے بعد بھی ظفر کا طرز، رنگ، شوق رہنا اٹل ہے۔ یہ شاعر ہیں، کسی دن دیوان لے آؤ تو دکھاؤں:۔ انہوں نے بھی تخیل کی نگری بسائی ہے! جو اول اول تو حسن و عشق کا آئینہ خانہ تھی! جہاں شوخی مزاج نوبہار ناز چاہتی، اور عشق و محبت مزہ دیتی رہی مگر بعد کے کلام پر آتی رنگ رچتا جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ خدا کی بستی میں پہونچ گئے ہوں۔ جہاں انوار کی برکت سے وساوس دو بوث کا جہنم خلوص کی جنت بن جاتا ہے۔ روح بیدار ہو جاتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں، بس یہی مکمل حیات ہے۔ یہی ذہنی جیت کا تاج۔ اسی کی تلقین شاعری کا اصلی پیغام! جسے پہونچانے سے پہلے منشار ایزدی کا رضوان کیف و اثر کے بہشتی پھولوں میں بسا دیتا ہے۔

خیر تو اگلے زمانہ میں دلی کی گھریلو زندگی ہو یا یہاں کا عام طور پر ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا ہنسنا بولنا، چلنا پھرنا، سب کلچر میں ڈوب گیا تھا۔ یہ ایک ایسا روشن ہیرا تھی! جس کے کئی پہل ہوں اور ہر پہل نئے رنگ، نئی جوت والا ہو، اس نے غالب، داغ، ذوق، شاہ نصیر، مومن سے شاعر۔ شاہ ناصر وزیر سا بین نواز۔ مرزا کالے، مرزا چڑا، مرزا گوہر سا ستار باز، اسمٰعیل شہید سا تیراک۔ میر پنجہ کش سا

خوش نویس محمود خاں سا حکیم۔ حکیم مومن خاں سا وضعدار اور ماہر علم ہیئت۔ مولوی صدر الدین، مولانا نظیر حسین سا عالم۔ خانم کے بازار والوں سے دستکار اور کاریگر بھی تو مرتے مرتے پیدا کئے۔ یہ علم و فن کا گویا یونان تھی، تو نفاست پسندی اور نازک مزاجی کا جاپان مگر افسوس آج یہ ان معنون خانہ بے چراغ، چراغ بے نور ہے، اور ہائے! ان "ہنگاموں" میں سے آج ایک بھی نہیں جو بقول کسے اس کے عناصر حیات اور اجزائے ہستی تھے۔ نہ قلعہ رہا۔ نہ چاندنی چوک رہی۔ نہ بازار جامع مسجد، اور نہ سیر جمنا جی ہے اور پھول والوں کی سیر!

یادش بخیر! پھول والوں کی سیر کا نام آیا تو جی نہیں مانتا کہ چپ ہو جاؤں، اسے حویلی کی خاص الخاص مغلانی کی زبانی ذرا تفصیل سے سناؤں گا، یہاں ان کی میٹھی باتوں کا اصلی مزہ تو کیوں آنے لگا، ہاں جو جو سین انہوں نے دکھائے، کوشش کرتا ہوں کہ انہیں آپ بھی دیکھ لیں۔ البتہ اچھے برے کا ذمہ نہیں لیتا۔ ان مغلانی کو آغائی بیگم کہوں تو کون پہچانے گا۔ ہاں نانی تجن کہوں تو دلی کے اکثر گھرانے جان جائیں۔ چاندنی ڈھل رہی ہیں۔ بوڑھی پھونس، پلکیں تک سفید۔ بیچاری چند روز کی مہمان ہیں۔ مگر کھایا ہوا ہاڑ ہے۔ اب بھی حواس بجا ہیں۔ چلتی پھرتی ہیں۔ وہی پہلی سی ہمت۔ وہی حوصلہ۔ وہی تعلقہ۔ وہی وضعداری۔ وہی مہر و محبت۔ وہی غمخواری۔ وہی یگانگت، بات بات سے ٹپکتی ہے۔ باتوں میں منہ سے وہ پُر بہار پھول گرتے ہیں کہ آدمی میٹھا منہ تکا کرے۔ جو بات منہ سے نکلے، دل میں اترے۔ اگلے زمانے کا حسین منظر آنکھوں کے سامنے کھل جائے۔

برکھا رت میں دلی کی آب و ہوا خاص طور پر گل و گلزار دکھاتی ہے! گویا پہلی سی بات آج نہیں۔ پھر بھی سیر تماشے، میلے ٹھیلے ہوتے ہیں! جہاں امیر، غریب پر نخوت و حقارت کی نظر ڈال کر خوش ہو لیتا ہے۔ عام طور پر بھی دل صاف نہیں۔ ان میں جانے کہاں کی کیٹ آن ٹھنسی ہے کہ ہندو مسلمانوں کے ہاں، مسلمان ہندوؤں کے ہاں جاتے لرزتے ہیں۔ بات بات پر کٹم کٹا۔ ناحق کو دھڑ سے مرتے ہیں۔ کہیں میلہ لگا، یا تہوار آیا تو سمجھو غضب الٰہی آگیا۔ جو ہے ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر۔ وہ پتھر چوتھ ہوئی، وہ لکڑی چلی، دم کے دم میں بیسیوں کے سر لال ہو گئے، مشین گنیں آگئیں۔ پہر بندی، ناکہ بندی ہو گئی۔ جیل خانے بھرنے لگے۔ کسی کو جنم قید ہوئی۔ کالے پانی گیا۔ کوئی پھانسی پہ ٹنگا۔ بچے یتیم۔ بہو بیٹیاں بیوہ ہوئیں۔ تو صاحب! برس کے برس خوشی، خوشوقتی کی جگہ یوں سوگ چھا گیا۔ ان باتوں کے کارن شرفا نے تو سیر تماشے چھوڑ ہی دیئے۔ مگر وقت و موسم کب گھر بیٹھنے دیتا ہے۔ غریب الگ پھر پھرا لیتے ہیں۔ ایک دن صبح میں نانی تجن کے ہاں بیٹھا ہوں۔ گھٹا چھائی ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔

سب نے سلطان جی کی ٹھہرائی۔ پکڑ دھکڑ بڑی بی کو بھی ساتھ لیا۔ پہلے درگاہ شریف پہونچے۔ فاتحہ دی۔ پھر ہمایوں کے مقبرے جا کے پکی روٹی۔ بری پراٹھے۔ آم۔ سہال۔ اندرسے کی گولیاں۔ پھینیاں چٹ کیں۔ یہاں سے صفدر گنج کی ٹھانی۔ یہ عمارت کیا ہے؟ سنگ سرخ کا ایک گلاب ہے، جس میں سنگ مرمر کی سفید دھاریاں نازک نازک پنکھڑیوں کی گویا نسیں ہیں۔ گنبد نرا سنگ مرمر کا ہے، اور اپنے حسن و نزاکت سے خدا کی قدرت کے دریا کا ورشا ہوا معلوم ہوتا ہے! مدرسے آئے۔ یہاں موتی محل۔ جنگلی محل، بادشاہ پسند کو جڑاؤ دیکھا! اور ایسا معلوم ہوا،

---

۱؎ منصور کے مدرسے کو صفدر جنگ اور صرف مدرسہ بھی کہتے ہیں۔

جیسے صفدر جنگ، شجاع الدولہ۔ اور شیدی بلال کی پاک روحیں ہمارے احساسات دیکھ رہی ہوں، حوض اور نہروں میں برسات کا پانی بھر گیا ہوتا۔ لہلہاتے سبزے پر انگریزی پھولوں کی ہنسی کھیل رہی تھی۔ کیاریوں میں رنگ برنگ تیتریاں، درختوں پر پیاری پیاری چڑیاں اس طرح اڑتی پھرتیں، جیسے چوتھی میں گل اندازی ہو رہی ہو! یہ بھی عجیب سیر تھی! اس سمے بڑی بی پر بھی کیفیت طاری ہوئی۔ کہنے لگیں بچوں آؤ! "تمہیں آج پاشاہی زمانے کی پھول والوں کی سیر کا حال سناؤں۔ سیر میں حضور بہادر شاہ جب آتے تو یہاں خاصہ نوش کرتے تھے، کہتے ہیں:۔ حضرت اکبر شاہ بادشاہ ثانی کو یاں کی آب و ہوا موافق (موافق)، اور سیر پسند تھی۔ سدا برسات میں آ کے رہتے، حضور کے بیٹے نواب مرزا جہانگیر نظر بند ہو کے الٰہ آباد گئے، تو ان کی والدہ نواب ممتاز محل نے منت مانی" یا حضرت خواجہ صاحب! دعا کیجئے، میرا بچہ اصل خیر سے چھٹ کے آئے! تو مزار مبارک پر بڑی دھوم سے پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھاؤں گی"۔ خدا کرنا کیا ہوا۔ کچھ دنوں میں مرزا جہانگیر چھیٹ آئے۔ پاشاہ بیگم نے منت پوری کی۔ تمامی کا غلاف، پھولوں کا چھپر کھٹ چڑھایا۔ اس میں شہر کے پھول والوں نے بھی ایک پنکھا لٹکا دیا ہوتا۔ بس بھئی! یوں خوب میلہ لگا۔ حویلی اور شہر کی ساری خلقت ٹوٹ پڑی۔ حضور کو یہ میلہ بہت بھایا۔ سال بسال پھول والوں کو دو سو روپیہ امول باندھ دیا۔ وہ ساون میں پنکھا چڑھاتے تھے۔ مگر اللہ بخشے دادی حضرت کہتیں "حضور بہادر شاہ بادشاہ کے پڑدادا یا سکڑ دادا کا وزیر بڑا جائیا اور نمک حرام تھا۔ سدا اپنے آقا کی کاٹ میں رہتا۔ ایک دن جانے کیا فریب گانٹھ کے بادشاہ کو شہر سے دور لے گیا۔ اور جان سے گزار دیا۔ میت بے گور و کفن پڑی تھی کہ خدا کی قدرت ادھر ایک ہندنی آن نکلی۔ اس نیک بخت کا بھلا ہی سا نام تھا۔ کہیں اسکی نظر پڑی۔ پاس جا کے دیکھے تو بادشاہ سلامت لہولہان ہوئے مرے پڑے ہیں۔ یہ وہیں ہو بیٹھی۔ ادھر بادشاہ کی ڈھنڈیا پڑی۔ کہیں شام و شام میت ملی۔ میت اور ہندنی کو شہر لائے۔ حضور میں پیش کیا۔ اس دن سے ولی عہد بہادر نے اسے اپنی بہن بنا لیا۔ بادشاہ ہوئے تو برس کے برس مہرولی اس کی سسرال جاتے۔ اس نیک بخت کی وفاداری کی یاد تازہ کرتے۔ لے لو یوں اس میلے کی شروعات ہوئی۔ ہندو مسلمانوں کے پیار و اخلاص کی مثال بنی۔ آگے چل کے پھول والوں کی سیر ہو گئی"۔

خیر بھئی، مہینوں پہلے پنکھے کی تیاریاں ہوتیں۔ قلعہ سے لگا سارے شہر میں رنگ برنگ جوڑے، اُن پر طرح طرح کے مصالحے ٹک رہے ہیں، فراش، سپاہی، نوکر چاکر، خواجہ صاحب روانہ ہوئے۔ شاہی محل۔ دیوان خاص، جھاڑ بہار کر فرش فروش، جھاڑ فانوس سے دلہن بنایا۔ دنوں پہلے مہمانداری شروع ہوئی۔ محلات میں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ بچوں کی ایک چیخ چاخ مچی ہے۔ ایک کہتی ہے، لے بی اماں جان۔ اے بی بھابھی جان! اللہ ان حرافیوں کو رکھوائیے۔ دوئی بیوی کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ اماں جان بولیں۔ لے بیٹا۔ بچے ہیں۔ کھیلتے ہیں، کھیلنے دو۔ بچپنے میں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بچّا کہتے کسے ہیں۔ بچے ہیں کہ کہیں اٹکن بٹکن کاٹ کٹول بانسلی۔ کوڑی زخن مخن کھیل رہے ہیں۔ ایک اودھم مچی ہے۔ کہیں پانی کھیلا جا رہا ہے۔ لڑکی بالیاں ایڑی سے چوٹی تک شور بور ہیں ایک جو پانی سے بچکر دوئی دوئی کرتی ادبدا کر بھاگیں تو مرمر کا گیلا فرش، پیر پھسل گیا یہ دھڑام سانی آن پڑیں۔ اب کیا تھا۔ تو دوڑ ہیں دوڑ۔ سب گرتی پڑتی آن جمع ہوئیں۔ سارا محل سر پر اٹھا لیا۔ نانی حضرت۔ دادی حضرت کہتیں "ہے ہے خدا نے میری بچی کی جان بچائی دو قدم پہ حوض تھا، دو یا ایسی ویسی ہو جاتی۔ تو وہ بندی کس کی ماں کو ماں کہتی ـــــ دونوں وقت اچھے سے اچھے کھانے۔ پان زردہ۔

بن ڈلیا۔ الائچیاں۔ صبح ناشتے میں حلوا پوری کچوریاں۔ مٹھائیاں خوانوں میں لگائے۔ سبز[1] سبز خوان پوش ڈالے جسولنیا بانٹتی پھرتی ہیں۔ دن رات گانا بجانا۔ آپس میں چہل۔ پچھے ہو رہے ہیں۔ دو دن پہلے مشاطاؤں نے سنگار وان سنوارے۔ زر و زیور۔ سرمہ۔ مسّی۔ لاکھہ۔ قرینے سے رکھا۔ چاندی کی لگنوں میں مہندی بھگی۔ انا چھوچھو۔ انا ہیو۔ الگی ڈھلکی مبارکبادیاں گاتی جاتی ہیں۔ مہندی لگاتی جاتی ہیں۔ سب نے پور پور مہندی لگائی۔ لال لال مہندی بند باندھا کچھ نانی حضرت، دادی حضرت کو گھیرے بیٹھی ہیں۔ پچھے دار باتیں سن رہی ہیں۔ کچھ الگ بیٹھی باتیں ملکا رہی ہیں۔ نیند اڑا رہی ہیں۔ ہنسی، ہجولیوں میں کوئی شامت کی ماری پیچھے سے اٹھ کونے کھدرے پڑ جاتی تو سمجھو غضب آ جاتا۔ بڑی بری گت بنتی۔ دوسری غیر نفسیاں ٹالم ٹول ٹال مٹول کر جا دھمکتیں۔ وہ خیر، کامنی مورت، پیاری صورت ڈیڈبہ تانے سوتی ہے۔ نیم باز آنکھیں۔ گورے گورے گالوں پر تندرستی کی لالی۔ یہ مہین ڈوپٹہ سے ایسی جھمکتی جیسے آب رواں کی صافی سی گلاب! انہوں نے توے کی کالک، تیل خوب سا بچاری کے منہ پر تھیٹر ہزاروں پھبتیاں اڑائیں۔ وہ کھسیانی ہو کر کہتی ،، دیکھو بھئی! یہ ہنسی ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ واہ! یہ بھی کوئی بات ہے۔ میکے منھ کالا کر دیا۔ اب ہم سے کوئی کلام نہ کرے۔ اس پر سب کھلکھلا ہنستیں اور اور چٹکیوں میں اڑاتیں۔ آپا جی! ہم تو جلوں کو جلائیں گے۔ نون مرچیں لگائیں گے۔ صبح میں کوئی کہتی۔ بولی انا چھوچھو نے تو میرے بائیں ہاتھ میں خاصے چور ڈالدیئے۔ میں آگے ہی کہتی تھی۔ اس ہاتھ کی مہندی ٹھیک نہیں۔ مگر ان اللہ کی بندی نے ایک نہ مانی۔ اپنا ہی کرنا کیا۔ نا بھئی! ایسی بھی ہٹ کس کام کی۔ لو بوا دیکھنا۔ ان کا کیا گیا۔ میرے ہاتھ تو کچے لہو ہو گئے۔ دوسری بولی، مجھے تو یہ موئی مہندی ہی دو کوڑی کی معلوم دیتی ہے۔ نگوڑے میرے ہاتھ جو پھیکے پڑے۔ تیسری بولی:۔ لو اور سنو۔ ابھی فرید آباد کی رچی مہندی بھی اب ایسی ہی ہونے لگی۔ چوتھی نے تنک کر کہا،، ان کی تو ناحق کی باتیں ہیں۔ آپا بیگم! قسم خدا کی قسم۔ ذرا دیکھنا۔ کیسی شاہانہ تو مہندی رچی ہے بیر بہوٹی ہاتھ ہو گئے۔ اس پر بھی چین نہیں۔

ایک دن پہلے محل کا تانتا روانہ ہوا۔ خاصگی رتھوں میں تورٹے[2] داریں۔ حرم۔ سریت۔ ناموس۔ تصرفی میں لونڈیاں، باندیاں کارخانے والیاں چلی جاتی ہیں۔ فوج سپاہی ساتھ ساتھ ہیں، خبریاں رتھوں سے لگی لگی دوڑ رہی ہیں۔

اللہ خیریں ہیں خیریں رہیں گی
. . . . . . . . . رہیں گی
تیرے من کی مرادیں ملیں گی
. . . . . . . . . ملیں گی
تجھے حق نے دیا ہے
. . . . . . . . . دیا ہے

[1] سبز رنگ بادشاہی رنگ تھا۔ [2] عزت دار۔

یہ تیرے بٹوے میں پیسا دھرا ہے
.......... دھرا ہے
تجھے اللہ نوازے دئے جا
.......... دئے جا
تجھے مولے انوازے دئے جا
.......... دئے جا

دوسرے دن دھن سے فجر کی توپ چلی۔ ساری حویلی میں جاگ ہوگئی۔ خوابگاہ میں حضور بہادر شاہ بھی بیدار ہو کلمہ پڑھتے مسہری پر اٹھ بیٹھے۔ جسولنی نے آواز دی۔ خبردار ہو۔ نقیب چوبداروں نے جواب دیا۔ اللہ رسول خبردار ہے۔ سب نے تپاک سے مجرا کیا۔ دعائیں دیں ترت دھانی مخمل کی زیرپائی رکھ دی۔ بادشاہ سلامت اٹھے۔ چاندی کی طشت چوکی پر گئے۔ ادھر زری کے زیرانداز پر چلمچی آفتابہ لگا دیا رومال خانے والیاں رومال، پاؤں پاک، بینی پاک لئے حاضر ہیں۔ جسولنی نے صندلی چوکی پر ایرانی مصلے بچھا دیا۔ حضور تشریف لائے۔ وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ وظیفہ پڑھتے ہو بیٹھے۔ اتنے میں فجر کی دیوی کا نورانی چہرہ اور روشن ہوگیا۔ جسولنی نے عرض کی۔ حضور حافظ جی حاضر ہیں۔ فرمایا۔ ہوں۔ لو وہ پردہ ہوگیا۔ آگے آگے جسولنی۔ پیچھے پیچھے منھ پر رومال ڈالے حافظ جی چلے آتے ہیں۔ مجرا کیا۔ پاؤ پارہ کلام اللہ کا سنا، بادشاہ سلامت نے اس تعلق سے پڑھا کہ جی تڑپ گیا۔ وہ گئے نہ گئے کہ بکڑی[1] والے آئے۔ مجرا کیا۔ نبض دیکھی۔ خیریت کی مبارکباد دی۔ رخصت ہوئے۔ شاہی دواخانہ سے سبز کمخواب کے کسنے میں کسی مہر لگی تبرید[2] بھجوائی۔ دواخانہ والیوں نے سامنے مہر توڑ نوش جان کرائی۔ عرض معروض سنی۔ ٹھنڈا نوش کیا۔ حمام کا حکم دیا۔ یہاں توشہ خانے والیوں نے مخمل کا دست بقچہ۔ حمام خانے والیوں نے چاندی کی بیسندانی۔ کھلی دانی۔ ابٹنادان۔ لوٹے۔ آبخورے۔ کنگال۔ کنگی۔ جھانوا۔ رومال خانے والیوں نے چھوٹے بڑے رومال۔ پاؤں پاک، بینی پاک جواہر خانے والیوں نے جواہرات حاضر کئے۔ روشن چوکی بجنے لگی۔ ایلو! جہاں پناہ حمام تشریف لے آئے۔ اس میں تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ کمرہ نما۔ اجارہ تک سنگ مرمر۔ اس پر منبت کاری ہوئی ہے۔ مشرق میں جالیاں اور آئینے لگے ہیں۔ اس میں سے دریا، جنگل، اور سبزے کی بڑی بہار دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے درجہ میں شمال کی جانب مرمریں شہ نشیں ہے۔ اس پر بہت تحفہ منبت کاری اور پچکاری ہے۔ آگے نراسنگ مرمر کا ایک چوکور درجہ ہے۔ طرح طرح کے بیل بوٹے، پھول پتے بنے ہوئے ہیں۔ بیچوں بیچ پر حسین کام خوشنما مربع حوض ہے۔ اسی کے گرد نہر ہے۔ جس میں جب چاہو گرم اور جب چاہو ٹھنڈا پانی آتا ہے۔ یہ درجہ بھی بڑی بہار کا ہے۔ جہاں پناہ غسل سے فارغ ہوئے بیٹھک آئے۔ محلوں میں بیگماتیں، شاہزادیاں کیا ہیں، گویا نور سرور کی تیریاں پڑی پھرتی ہیں۔ ایک ایک کامنی کومل۔ کوکتی کویل۔ سب کی سب ملی جلی۔ گلناری۔ گل شفتالو۔ دھانی۔ سرمئی۔ اودا۔ گیندئی۔ بھاری بھاری سا جوڑا پہن رہی ہیں۔ کسی نے رادھا نگری کی تہ پوشی پسند کی۔ جس پر کھجور چھڑی۔ لہر بیچ بیل کا بدر دم۔ چنبیلی یا ماہی پشت کا سندر جال بنا ہوا ہے۔ کسی نے کمخواب، گلبدن، مشروع، اطلس یا زربفت کا غرارے دار یا تنگ موری کا پاجامہ پہنا۔ جس پر کارچوبی گلدستے۔ گیندے کی بیل اور دکھت بھولی کا نازک مہکتا جال

---

[1] حکیم جی۔ [2] حقہ

پڑا جگر جگر کر رہا ہے۔ بنارسی زری بوٹی۔ مقیشی تاروں کی کریب۔ گلشن۔ آب رواں۔ شبنم کے دوپٹے نکلے۔ ان پر مرمرے کی توئی یا چوڑی لیس۔ کپڑے پر کی توئی۔ موتیوں کی توئی۔ نئی جان چھپا۔ پیک یا سلمے ستارے کی توئی ٹکی ہے۔ بھئی یہ کپڑے لتّے تمہاری سمجھ میں کیوں آنے لگے تم ٹھہرے چودھویں صدی کے۔ نئی روشنی کے۔ برا نہ ماننا۔ یہ اس لئے کہتی ہوں۔ اب کچھ ہی ہوا چل گئی ہے۔ کوئی برس بھر ہوتا ہے، میں نام تو لیتی نہیں۔ ایک شریف گھرانے کی لڑکی نے جو بھرے جلسے میں اگلے لوگوں کو توم ڈالا۔ بات بات میں باپ دادا کی فی نکالتی! ایک منہ میں ہزار صلواتیں سناتی تھی۔ مگر بیٹا! مجھ سے پوچھو تو گریبان چاک۔ بن آستینوں کے کرتے۔ اونچی ایڑی کی جوتیاں انہیں کو مبارک ہو۔ ہم چار کو منھ پر ناک رکھیں اور چوٹی کٹا بیٹھیں۔ ہے ہے بھلا یہ بھی موا کوئی پہناوا ہے کہ ہوٹیوں کا سینہ، بغلیں دکھائی دے رہی ہیں۔ آج وہ ہدڑا گیا ہے کہ یہ بڑی عزت کا پہناوا گنا جاتا ہے۔ باپ دادا کے پہناوے میں تو جہان کے کیڑے پڑ گئے۔ اس میں کچھ ایسے لعل لگ گئے ہیں کہ سب مٹے جاتے ہیں۔ اے میں کہتی ہوں "کیوں تمہاری عقل پہ ٹکی پڑ گئی۔ کیوں تمہارے دماغ میں خنّاس سمایا ہے۔ ہوش کے ناخن لو۔ کیوں صدقے کے کپڑوں پر اتراتے ہو۔ یاد رکھو ان باتوں سے تم ان کی نظروں میں بھی گر گئے۔ جن کی ریس پر جان دیتے ہو۔ وہ نئے نہیں اتنا وہ بھی سمجھتے ہیں، جب تم نے باپ دادا کی پت نہ رکھی تو وقت پر ان کیا رکھو گے۔ تم رہے بن پیندی کے بدھنے، تمہیں قرار مل چکا۔ تو صاحب! یوں یہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ اب جیسا جس کا پہناوا، ویسی اس کی باتیں۔ اور تو اور دیکھا دیکھی میاں بیوی کا رشتہ جو دنیا دکھاوے کا رہ گیا، شام ہوئی میاں نے اپنی راہ لی۔ بیوی نے اپنا رستہ دیکھا۔ اُن کو اِن کی خبر نہیں۔ اِن کو اُن کی خبر نہیں۔ یہ کیا تو خیر سے آجکل کا فیشن ہے (میں نے دیکھا، بڑی بی کا پارہ تدریجاً چڑھا جاتا ہے۔ یہاں رات کم۔ سانگ بہت ہے۔ جھٹ پٹاری اور پن کی آگے سرکا دی یہ ٹھہریں پان کی رسیا! ادھر جھک گئیں۔ اور پان بناتے بناتے پوچھنے لگیں۔ ہاں تو بیٹا میں کیا کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا، نانی! آب رواں شبنم کے دوپٹوں پر نئی جان نکلتی ہے) ہاں! سیر کی نفیری کبھی کی دن ہوئے بج چکی۔ سارا شہر خواجہ صاحب امڈا جاتا ہے۔ امیر بگھیوں، فٹنوں میں، رنڈیاں رتھوں، غریب غربا پیدل، بہلیوں میں تختیں مچاتے چلے جاتے ہیں۔ آج حضور بہادر شاہ بھی سدھار رہے ہیں۔ لال پردے[1] سے حویلی کے صدر دروازے تک کہیں دربان، مردھے، چوبدار کھڑکی دار گڑیاں۔ نیچی نیچی سبز بانات کی چپکنیں۔ سرخ شمالی رومالوں سے کمر باندھے دست بستہ کھڑے ہیں۔ کہیں قلار، ڈھلیت، خاص بردار لال بانات کے انگرکھے۔ سبز پگڑیاں۔ کالے پھینٹے سر پر کسے۔ کندھوں پر بندوقیں۔ پیٹھ پہ ڈھال۔ کمر میں تلوار لگائے۔ بت بنے کھڑے ہیں۔ دیوان خاص کے صحن میں، اعتبار الملک، عمدۃ الحکما، وزیر شمس الدولہ بخشی۔ معین الدین ناظر۔ سیف الدولہ اور بھی انیس الدولہ وکیل۔ راجہ مرزا بہادر۔ راجہ بہادر۔ میر عدل۔ میر منشی۔ میر تزک اور جانے کون کون امیر امرا اپنے اپنے مرتبے مودّب کھڑے ہیں۔ قلعہ کے دروازے سے دلی دروازہ تک دائیں بائیں سوار۔ پیادے جدا بنے سنورے پرا جمائے ہیں۔ بازار میں دوکانداروں نے پیاری پیاری محرابیں بنائی ہیں۔ ان میں کوئی زری پھولوں کی ہے، کوئی زربفت کی ہے۔

---

[1] دیوان خاص کے دروازے پر لال بانات کا بڑا سا پردہ کھنچا ہوتا تھا۔ یہ تیسری آداب گاہ کہلاتی تھی۔ نقار خانہ کا دروازہ پہلی اور دیوان عام میں جا بمدار دروازہ جس میں سونٹی سی لوہے کی زنجیر ہے دوسری آداب گاہ کہلاتی ہے۔

کوئی مشجّر کی ہے۔ کسی میں یاں سے واں تک سبز گوٹے لگے ہیں۔ کسی میں آئینے ہیں، سڑکوں پر پیا پے چھڑکاؤ ہو رہی ہے، دوکان مکان دلہن بنے ہیں۔ سڑک کے رُخ کی ساری چھتیں شہر کی بہو بیٹیوں سے بھرپور ہیں، کہیں چلمنیں پڑی ہیں۔ کہیں چادرے تنے ہیں، یاں سواری دیکھی جا رہی ہے۔ خیر تو ایک کیفیت آ رہی ہے۔ محلات میں الگ دھوم مچی ہے۔ مشاطائیں سنگار دان کھولے بیٹھی ہیں۔ سر سری جھومر ہالے۔ جھپکے۔ بالے۔ بجلی بالے۔ کرن پھول۔ موتی پاک۔ سیس پھول۔ جھمکے۔ کھٹکے۔ چھڑے۔ کڑے۔ حباب۔ مگر جودانیاں، مٹھیاں، چوہے دنتیاں۔ پہونچیاں۔ پٹڑیاں۔ نوگریاں۔ جہانگیریاں۔ چوڑیاں۔ ٹیکہ۔ پتے۔ بالیاں۔ چاند۔ جگنی۔ چمپاکلی۔ گجرے کا توڑا۔ موتیا کا توڑا۔ گلوبند۔ بھوج بند۔ کنٹھی۔ تیپ۔ دولڑی۔ ست لڑی۔ دہگدھی۔ ہیکل۔ چندن ہار۔ کیری۔ جوشن۔ نورتن۔ نونگے۔ اِٹّے۔ توڑے۔ لچھے۔ پازیب۔ چوراسی۔ جھانجن۔ نکال رہی ہیں۔ ان میں جسے جو جو چیز بھاتی۔ مشاطائیں پہناتیں۔ بال بال گج موتی پروتیں۔ کوئی زر و زیور پہن رہا ہے۔ کسی کے ابھی جوڑے بھی بھاویں نہیں۔ ایک نکالا جاتا ہے۔ دوسرا نکالا جاتا ہے، ایک بیٹھی کہہ رہی ہے "اری گلشن! اری سوسن! اری مان کنور! اری چنچل کنور! دیکھ تو میری لال مخمل کی بنچی تو دے آ۔ میں تو لاری پھلکاری کی انگیاں کرتی پہنے لیتی ہوں۔ سوسن جو بھونچال بن کے چلی تو اڑا دھول دندھے منہ، چھن چھن ساری چوڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں۔ لو وہ کونے میں کھڑی ہو منہ میں بڑبڑا رہی ہے۔ زبان چلا رہی ہے۔ شہزادی بیگم نے دیکھا فضیحتاں کیں۔ لو اور سنو چڑیل کی عقل ماری گئی ہے۔ اری تجھے کسی نے گرا دیا ہے جو منہ تھتائے بڑبڑا رہی ہے۔ موئی بھونچال کہیں کی۔ سو بار جتایا۔ مگر کیا مجال جو ہڑدنگی اپنی چال چھوڑ دے اب سر کے گئی بھی یاد ہیں گڑ گئی۔ دیکھ! بوندسا دن ہے۔ یہ جاتا ہے! آتا نہیں۔ مرلی اور چوڑیاں پہن لے۔ وہ ایسی کہاں کی شہانی تھیں کہ میسر نہ آئیں گی۔ دوسری کہتی "اچھی آپا بیگم! ذرا ادھر بھی دیکھ لو۔ دوئی! ایسی بھی کا ہے کی آپا دھاپی پڑ گئی۔ ہائے اللہ! میری کوئی سنتا ہی نہیں۔ سب آپ آپ کو ہو گئے" آپا بیگم بولیں۔ بیٹی بنو! ناحق الاھنا دیتی ہو۔ تمہیں تو کہتی تھیں الاچی بہن سے صلاح لیکر پہنو گی۔ لو آؤ شوق سے پوچھو۔ میں نے منع کیا ہے۔ بھلا آنکھوں پر کہیں پلکوں کا بھی بوجھ ہوتا ہے" تیسری بولیں "اے بی زناخی! ذرا بولو۔ دد دکو آواز دینا۔ وہ تو جاکے بیٹھ گئیں۔ میں نے رات ہی کو سمجھا دیا تھا۔ مگر وہ کسی کی مانتی ہیں۔ ایسی تو مغلانی جی اب ان کے لئے بیٹھی ہیں، جو یہ کرتی ٹکوا لائیں گی" بی زناخی بولیں "ہاں بی آغا مینا! سچ کہتی ہو۔ نوج ان کا سایہ شعور خدا کسی کو کرے۔ اچھی میں کہتی ہوں۔ رات ہی کو یہ چلی جاتیں تو ان کے پاؤں کی کونسی مہندی گھس جاتی۔ اچھا! کپڑے لئے زر و زیور پہن چکیں تو یہ الٹھرا بیلیاں۔ ہمسن انلیتیاں بسم اللہ کے گنبد سے نکل چھم چھم، چھم چھم، چھم چھم پادشاہ بیگم کے حضور آئیں۔ تپاک سے کورنش بجا لائیں۔ پادشاہ بیگم کسی کو کہتیں "ہزاری عمر۔ نیک نصیب۔ دلہن بنو" کسی کو کہتیں "عمر دراز۔ بوڑسہاگن۔ سائیں جئے۔ چاند سا بیٹا ہو" یوں دعائیں لیتی باری باری نذر دے قاعدے قرینے سے ہو بیٹھیں۔ یہاں بھی نت نیا سجاؤ ہے۔ ملکہ زمانی چندے آفتاب چندے ماہتاب، نک سے سک تک سونے میں پیلی۔ موتیوں میں سفید۔ گوندنی کی طرح لدی، چندی زردوزی مسند پر گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی ہیں۔ سامنے گنگا جمنی سنک لگی ہے، جس میں سے خمیرہ کی سوندھی سوندھی مہکار چلی آتی ہے۔ بازو میں چاندی کی تپائی پر زردوزی زیر انداز، اس پر سونے کا بڑا عمدہ جالیدار خاصدان تپائی کے نیچے چاندی کا اگالدان رکھا ہے۔ ایک طرف بڑے انداز سے سہاگ سیج بچھی ہے، جس کے کرکری تاش کے پلنگ پوش،

تاش تمامی کے پردے پر جوہی۔ چنبیلی۔ مولسری کا جال گجرے۔ لڑیاں۔ پڑی مہک رہی ہیں۔ صحن میں خواجہ سرا۔ نوکر چاکر۔ ماما اصیلیں لونڈیاں باندیاں ادب سے ہاتھ باندھے حکم کی منتظر کھڑی ہیں۔ لے لو! بادشاہ محل میں داخل ہوئے۔ جسولنی نے آواز دی۔ خبردار ہو۔ ادب سے۔ نگاہ روبرو بیگماتیں سروقد کھڑی ہوگئیں۔ مجرا کیا۔ حضور نے سب کو ساتھ لے کے ناشتہ فرمایا۔ بھنڈا نوش کیا۔ گھنٹہ بھر بعد آب حیات مانگا۔ پانی پیا تو سب کھڑے ہوگئے۔ پی چکے تو سب نے مزید حیات کہا۔ اشارے کے ساتھ کہاریاں ہوادار لے آئیں۔ حضور نے کھڑے ہو کر تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی۔ خیر سوار ہوگئے۔ چڑھی بڑھی بیگماتیں اور شاہزادے بھی نالکی اور عماریوں میں ساتھ ہوئے۔ جسولنی نے آواز دی: خبردار ہو۔ مہابلی بادشاہ سلامت۔ نقیب چوبداروں نے جواب دیا۔ ”اللہ رسول خبردار ہے“ حضور عالم پناہ برآمد ہوئے۔ سب نے ادب سے مجرا کیا۔ چوبدار للکارے بسم اللہ الرحمن الرحیم اللہ رسول کی امان۔ دوست شاد۔ دشمن پامال۔ بلائیں رد۔ مگر اصل میں یہ دربار عدالت کا وقت ہے۔ اور اس وقت دربار ہوتا۔ حضرت پیر و مرشد تخت طاؤسی پر بیٹھے ہیں۔ امیر۔ امراء۔ وزیر۔ وکیل۔ میر عدل۔ میر منشی۔ بخشی۔ ناظر۔ محرر۔ متصدی ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ باری باری کاغذ پیش کرتے حکم احکام حاصل کرتے ہیں۔ عرضی بیگی بھی کھڑا عرضیاں پیش کر رہا ہے۔ مگر آج عدالت کے کام کی چھٹی ہے۔ اب مہرولی دربار بھرے گا۔ جب تک حضور رہیں گے وہاں کام ہوگا، ہاں تو حضور بہادر شاہ بادشاہ برآمد ہوئے۔ دبلے پتلے۔ میانہ قد۔ لمبی گردن، کتابی چہرہ۔ سانولی رنگت۔ ستواں ناک۔ آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ سفید بگلا سی ڈاڑھی۔ سر سے اوپر جیسے اللہ میاں کا نور، کہاروں نے جھٹ ہوادار لے لیا۔ لال حویلی کے صدر دروازے تک اردا بیگنیاں مردانے کپڑے پہنے۔ سر پر سبز سبز پگڑیاں۔ کمر میں لال لال دوپٹے باندھے۔ ساتھ ہیں۔ ترکنیں۔ قلماقنیاں بلم برچھی لئے ہیں۔ خواجہ سرا گنگا جمنی مورچھل کرتے جاتے ہیں۔ جسولنیاں پکار رہی ہیں۔ خبردار ہو حضرت جہاں پناہ سلامت۔ امیر امرا بھی ہوادار کا پایہ پکڑے اپنے اپنے رتبے سے چلے جاتے ہیں۔ جونہی سواری صدر دروازے کے آئی۔ امیر امرا پایہ چھوڑ الگ ہوگئے۔ توپیں دغیں۔ زنبوریں[1] چھوٹیں۔ درویاں بجیں۔ ساری فوج نے سلامی اتاری۔ شہدوں میں سے ایک نے آواز دی۔ الٰہی! ایک سال یہ ہزار او نصیب ہوں خدا کرے۔ باقیوں نے اس زور سے آمین کہی کہ خاصے گھوڑے بھی چمک اٹھے۔ بادشاہ بھر بھر مٹھیاں روپے۔ دوانیاں۔ چونیاں پھینک رہے ہیں۔ سواری رساں رساں آگے بڑھتی جاتی ہے۔ بھنڈا بردار بھنڈا لئے ہوادار سے لگا لگا جاتا ہے۔ بھنڈے کا پیچ بادشاہ نے لے لیا ہے۔ خاص بردار آب حیات کی صراحیاں شورے میں بجھی۔ سفید سفید آب ان کی صافیاں پڑی لئے ہیں۔ گڑیالی ریت کی گھڑیاں۔ کہار نگھا آفتابی حبشی قلار چاندی کے سشیر دہاں سونٹے۔ نقیب چوبدار گنگا جمنی عصا لئے پکارتے جاتے ہیں۔ ”بڑھے جاؤ صاحب۔ بڑھاؤ قدم کو جا بجا سے۔ حضور عالم پناہ بادشاہ سلامت“ ڈھلیت بندوق ڈھال۔ تلوار لگائے جا رہے ہیں۔ ان کے آگے خاصے گھوڑے گنگا جمنی ساز۔ پوزی۔ دمچی ہیکل۔ گنڈے۔ پٹھوں پر پاکھریں، پاؤں میں جھانجن۔ سر پر سنہری کلغیاں۔ مخمل کے کارچوبی غاشیے پڑے چھم چھم، چھم چھم کلائیاں مارتے چلے جاتے ہیں۔ اہلو پہلو دوکانوں۔ کوٹھوں سے رعایا برایا سلام کرتی۔ دعائیں دیتی۔ بادشاہ سر کے اشارے سے جواب دیدیتے ہیں۔ یوں سواری بادبہاری شہر کے

---

[1] اونٹوں پر کاٹھیاں کس کر جوڑی بڑی بندوقیں رکھتے تھے، انہیں زنبوریں کہتے تھے۔

باہر آئی تو بھئی یا جلوس ٹھیر گیا۔ سلامی اتاری اور حویلی چلا گیا۔ پھر دلی تک ہرکاروں کی ڈاک بیٹھ گئی۔ بادشاہ چہڑی سواری ہو چھ گھوڑوں کی گاڑی میں براجے۔ اس میں نالکی کا سا بنگلہ۔ سنہری کلسیاں۔ گنگا جمنی پچھجہ ہے۔ کوچبان ایک سی وردیاں پہنے گھوڑوں پر سوار ہانک رہے ہیں۔ آگے آگے سانڈنی سوار۔ پیچھے سواروں کا رسالہ۔ آبدار بھنڈا لئے۔ چوبدار عصا لئے گھوڑوں پر بگھی کے ساتھ ساتھ ہیں۔ بگھی پہلے سلطان جی۔ پھر ہمایوں بادشاہ کے مقبرے ٹھہری۔ سب نے فاتحہ پڑھی۔ پھول چڑھائے۔ یاں سے چلکر سواری باد بہاری سیدھی مدرسہ آگئی۔ یہاں راوٹیاں۔ یک چوبے۔ دو چوبے۔ پنچوبے خیمے کھڑے ہیں۔ ایک طرف بڑا سا شامیانہ ہے، جس کے بیچوں بیچ ایک چبوترہ چبوترے پر بادشاہ کی مسند لگی ہے۔ پیچھے دو زنانے سے خیمے کھڑے ہیں۔ ان کے ارد گرد بڑے بڑے سبز سراپچے کھینچ دئے گئے ہیں۔ مقبرے کے باہر بھی قناتیں[1] لگی ہیں۔ یہاں بیسوں چولھے گرم ہیں۔ پتیلیاں ٹھنٹھنا رہی ہیں۔ دیگیں کھڑک رہی ہیں۔ ان میں کہیں گیلانی ایرانی۔ نور محلی۔ زمردی۔ نرگسی۔ موتی پلاؤ دم ہو رہا ہے۔ تو کہیں مغلئی دو پیازہ۔ چاشنی دار مچھلی۔ خاصے کے کریلے۔ شاہ پسند دال قلیہ کندن۔ کوفتے۔ پرسندے۔ کئی طرح کا دلمہ۔ دوغ۔ بورانی۔ رائتا۔ سمنی۔ لوزانی حسینی۔ شامی کباب۔ شکم پر۔ مرغ سالم۔ سموسے۔ لقمیاں تیار ہو رہی ہیں۔ ایک طرف دیکھو تو ہوائی چپاتیاں۔ پرت کے پراٹھے۔ اتر رہے ہیں۔ دوسری طرف تندور (تنور) سے تر بتر باقرخانیاں۔ تافتانی۔ نان یزدی۔ نان تنک۔ نان گلزار نکل رہی ہیں۔ مٹھاس میں متنجن۔ یاقوتی۔ من سلوے۔ بنش۔ کھجلے۔ قتلمے۔ حلوا سوہن امرتی۔ پستہ مغزی۔ اندرسے کی گولیاں۔ سہال دربہشت۔ اور جانے کیا کیا بن رہا ہے۔ ادھر پکوان ہو رہے ہیں۔ ادھر بیگماتیں، شاہزادیاں شہزادے۔ سواریوں سے اتر مدرسہ کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ کوئی ہکا بکا پھر رہا ہے۔ کوئی کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ کوئی تھک تھکا کر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں لیٹا آرام لے رہا ہے۔ ایک کھڑی ہلسا رہی ہیں: "اے بی دشمن اِلے بی جانمن! اچھی، آؤ ہم تم سیڑھیوں پر سے اتریں۔ دیکھیں کون جلدی اترتا ہے۔" وہ کہتی ہیں "بوا ہوش کی لو۔ حواسوں کا صدقہ دو۔ کہیں کسی کا ہاتھ منھ تڑواؤ گی۔ انا دوا نے سنا تو بلبلا کے کہنے لگیں "میں واری۔ میں صدقے۔ کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔" انہوں نے جواب دیا "چلو بی تم چپکی بیٹھی رہو تمہارے بھسلاسٹرون میں کوئی نہیں آتا۔ تم یونہی پھپھیر ولالے کیا کرتی ہو۔ اتنے میں دوپہر بج گئی۔ نعمت[2] خانہ تیار ہوا۔ دسترخوان چنا گیا۔ کھانوں پر سونے چاندی کے ورق جھمک رہے ہیں۔ گلاب پاشوں سے مشک۔ زعفران۔ عنبر۔ گلاب۔ کیوڑے کا آمیز چھڑکا جا رہا ہے۔ خوشبوؤں کی لپٹوں پہ لپٹیں چلی آتی ہیں۔ دسترخوان سے لگی بیچوں بیچ صندل کی چوکی بچھی۔ چوکی سامنے تیک[3] پر آلتی پالتی مار حضور آن بیٹھے۔ رومال خانے والیوں نے کارچوبی زیرانداز پر پہلے گنگا جمنی چلمچی رکھ ہاتھ دھلائے۔ گھٹنوں پر زانوپوش ڈالے، دست پاک بینی پاک آگے رکھ دیئے۔ شاہی خاصے کے خوان بڑی پڑتال سے آ رہے ہیں۔ داروغہ جی بیٹھی حضور کے سامنے، مہر توڑ توڑ کے دیکھ بھال کرتی، خاصہ چنتی جاتی ہے۔ اہلو پہلو بیگماتیں شاہزادے۔ شاہزادیاں بیٹھی ہیں۔ حضور پر نور کبھی مرزا شبو۔ کبھی مرزا فخرو۔ کبھی مرزا جواں بخت کو

---

[1] قناتیں۔ [2] شاہی خوان کے چوطرف مہین جالی کا پردہ ڈال دیا جاتا تھا، تاکہ مکھیوں سے امان ملے۔
[3] گول گپہ۔

الش دیتے۔ یہ ادب سے سروقد کھڑے ہو کر مجرا کرتے۔ کبھی ملکۂ دوراں اور شاہزادیوں کو دیتے یہ بھی نچی نچی لجائی نظروں سے باادب اٹھتیں۔ آداب بجالاتیں۔ یہ تو خیر شاہی دسترخوان ہوا۔ اور سب بھی اچھا کھاتے۔ اچھا پہنتے۔ بڑی تمیز تہذیب سے رہتے تھے۔ یوں اب جس کا جو جی چاہے کہے۔ کیوں بھئی تم نے بھی سنا۔ ایک بچارے وکیل کی جورو کو تو دلّی برائی کی پوٹ ہی دکھائی دی۔ کھانا پینا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ بات چیت سب کو نوازا ہے۔ اس بڑھ بولی سے کوئی پوچھے۔ بیوی! دلی دلی تو بہت گاتی ہو۔ سمجھتی بھی ہو، "دلی تھا کس چڑیا کا نام"۔ دلّی دلّی والوں سے تھی۔ جو محبت۔ مروت والے۔ دکھ درد کے شریک۔ دشمن کو بھی دکھ میں نہ دیکھ سکتے تھے، جسے دیکھو شاہانہ دماغ۔ خود کو ئے دے۔ کسرتی سڈول بدن۔ نڈر۔ دل والے۔ ان کا چلنا پھرنا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ جو چیز تھی اپنے رنگ کی۔ سب سے الگ تھلگ بڑے ملنسار۔ سب سے جھک کر ملتے۔ بگڑتے تو لاٹ کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ جب دیکھو ہونٹوں پر ہلکی ہلکی ہنسی کھیل رہی ہے۔ باتوں میں منھ سے پھول گر رہا ہے۔ آج یہ لوگ ہیں جو دلی کی تمیز تہذیب کو اگٹا جاتا ہے؟ جس دن یہ تیلیوں کی طرح بکھرے۔ سمجھو "اسی دن" دلی کا سہاگ بھی اجڑ گیا۔ اب شہر دلّی نہیں دہلی ہے۔ باہر والوں کی بستی ہے۔ یاں نہ وہ پہلے سے باڑے ہے نہ عمریں رہیں۔ کل کے بچوں کو دیکھتی ہوں بوڑھے ہو گئے۔ تیس چالیس نگوڑوں کی عمر۔ چلتے بنے۔ اگر جیتے تو بسورر ہے ہیں۔ دیئے دیتے ہیں۔ کھانسنے چھینکنے ہی سے فرصت نہیں۔ جسے دیکھو واؤ[1] کی صورت بنا ہے۔ دوائیوں کے بل جیتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی جینا ہے زبردستی کو دن پورے کرتے ہیں۔ برکت ہے کہ ہر چیز سے اڑی جاتی ہے۔ جہاں دیکھتی ہوں ہاؤ ہاؤ ہے۔ سوؤں کی کمائی ہے۔ پھر بھی پیسہ پیسہ کو کاوڑے۔ ڈھونڈھتے پڑے پھرتے ہیں۔ اگلے وقتوں تھوڑی کمائی۔ زیادہ روٹی تھی۔ صبر سے کمایا۔ صبر سے کھایا۔ نہ ہے ہے تھی نہ پھٹ پھٹ۔ اب کچھ طور ہی دوسرے ہیں۔ چھاجوں پانی برستا ہے۔ منوں اناج ہوتا ہے۔ پھر دیکھو تو کال ہے۔ پیدا نہیں۔ موا اسدا کا کال ہی ہو گیا۔ کال کیوں نہ ہو۔ جو چیز ہے، بھر بھر بوریاں چلی جاتی ہے۔ لڑے کوئی، شامت ہماری آئے۔ کھانے کو ہم دیں۔ مرنے کوئی کرے۔ روپیہ ہم دیں۔ جب ہی تو ننگے بھوکے ہو کر رہ گئے۔ پہلے یاں کی چیز یہیں تھی۔ خیریت خیر صلاّ تھی، گھر کا پیسہ گھر ہی میں تھا۔ جتنا چاہا اٹھایا۔ اڑایا۔ کھی کہاں گیا؟ کھچڑی میں! کھچڑی کہاں (کہاں) گئی؟ پیاروں کے پیٹ میں! اسی کی برکت اور رونق تھی۔ خود ہی راجہ۔ خود ہی پرجا۔ خود ہی آقا۔ خود ہی غلام۔ برے تھے تو اپنے لئے۔ اچھے تھے تو اپنے لئے۔ یوں لالوں کے لال رہے دن عید رات شبرات رہی، مگر اب کیا ہے، "ڈھاک کے تین پات" "لے بیٹا! سنتی ہوں۔ آج کل علم بہت بڑھ گیا ہے۔ جاں (جہاں)، بڑھا ہو گا۔ بڑھا ہو گا۔ یاں تو موا اندھا علم پھیل گیا ہے۔ میاں افضل کو تو جانتے ہو گے؟ میری پڑنواسی کا دولہا۔ آٹھ نو سال میں ولایت سے ڈاکٹری پڑھ کے آیا ہے۔ بالکل کرستان ہے۔ جب دیکھو گدّامی[2] بنا پھرتا ہے۔ جن کا علاج کرنے کھڑا ہو تو کہتا ہے "ولایت سے عرق نہیں آیا۔ نسخہ کیا لکھوں"۔ میں نے پوچھا "بیٹا! عرق تم خود کیوں نہیں بنا لیتے"۔ کہنے لگا "واہ نانی حضرت تجھ کو کیا معلوم اس میں کیا کیا دوائیں پڑتی ہیں"۔ یہ سن کے تو بیٹا! تن بدن میں آگ لگ گئی۔ زہر تڑسے میں نے کہا "واہ لے تیری ڈکری

---

لہ یہاں خمیدہ پشت یا کبڑا ہونے سے انھوں نے مراد لی ہے۔ ۲ہ خدا جانے بڑی بی نے کس چیز کا خاکہ اڑایا ہے۔

واہ رے تیرا علم! پڑھے سے سوا ایسی پڑھائی پہ کہ پڑھ تو سب کچھ لیا۔ آتا جاتا خاک نہیں! تجھ سے تو ہمارے ہاں کے عطار ہی اچھے جو ٹکے کے جُشاندے۔ خیساندے میں وقت پر کام نکالدیں۔ تو بیٹا برا ماننے کی بات نہیں۔ پڑھ لکھ کے تم یوں ہاتھ سے گئے۔ لڑکیاں بالیاں تمسے چار ہاتھ آگے ہیں۔ کہتی ہیں "بے پردہ ہوکر ہم مردوں کی بیڑی کٹائیں گے"۔ اچھا بھئی! یہ بھی منظور۔ مگر میں ایک بات کہتی ہوں، وہ اپنے سہاگ کی تو پہلے خیر منالیں۔ کل کو چوڑیاں پہنچی بند کردیں۔ تو بیوی سونٹا سے ہاتھ لئے پھریں گی۔ اول یہ تو سمجھ لیں، آج ان کا سہاگ بھی تو دوسروں کے برتے قائم ہے!! سنا ہے، آزادی کے کارن ایک سٹرن کی تو لوگوں نے خوب گندہی کی۔ بھئی! یاد رکھو اس بے پردگی سے کچھ حاصل حصول نہیں۔ کام کی باتیں اور ہیں۔ دل چلے یہ آڑ بھی نکالدینی چاہتے ہیں۔ یہی رنگ رہا تو ہم تو ہوں گے نہیں اور نہ خدا ایسا وقت دکھائے، مگر تم سب کرسٹان ہوگے اور عورتیں مسیح کی چماریاں۔ بھلا جبس جانے عورت کا یوں ہباؤ کھلے۔ یوں دیدہ کا پانی مرجائے بھئی! اس کا تو بس اللہ والی ہے۔ وہاں مائیں تو آگے کو تو سانپ بچھو ہی جنیں گی!!" (بڑی بی اصلواتوں پر صلواتیں سناتیں۔ ہم بیٹھے مٹر مٹر دیکھتے۔ سنتے رہتے۔ ایک تو کہتی پتہ کی تھیں۔ دوسرے بول کون سکتا تھا۔ جو بولا اس کے سر بالوں کو آئیں۔ جھلاّ کی شیرنی کی طرح بپھر پڑتی تھیں۔ ناچار بیٹھے سنا کئے۔ مجھے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ اب کی دفعہ بھی سب نے پاندان۔ پن کٹی کی طرف اشارے کئے۔ مگر میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ جانتا تھا "یہ ریل گاڑی رکنے والی نہیں" اسوقت پن کٹی سرکا دی اور وہ الٹ کے سر پر آئی!! بارے خود ہی کہنے لگیں "وو نی بھئی! باتوں باتوں میں میں تو کاں (کہاں) سے کاں نکل گئی۔ جانے میں کیا کہہ رہی تھی" سب نے خوشی خوشی لقمہ دیا "حضور بہادر شاہ اٹش دے رہے ہیں، شاہزادیاں بجی بجی لجائی نظروں سے اٹھیں! آداب بجالاتی ہیں:") ہاں تو خاصے سے فارغ ہو کچھ دیر حضور نے سکھ فرمایا ظہر کی نماز پڑھ کے دم میں مہرولی آگئے۔ آہاہا بابا! یاں کا کیا پوچھنا۔ جی نکلے جاتا ہے۔ یاں بھی جالی محرابیں بنی ہیں، تاش تمامی کی جھنڈیاں اڑ رہی ہیں۔ اہلو پہلو پلٹنیں کھڑی سلامی اتار رہی ہیں۔ اختتام توپ خانے کی دھنا دھن توپیں چل رہی ہیں۔ زنبوریں چھوٹ رہی ہیں۔ سڑک پہ سپاہی انتظام کرتے پھرتے ہیں۔ ایک دھوم دھام ہے۔ شہر سے خلقت پہ خلقت امڈی چلی آتی ہے، جن کے مکان ہیں وہ اپنے اپنے سجے سجائے مکانوں میں آدھمکے۔ مقدور والوں نے سودوں سے کرائے بھرے۔ غریب غربا کو جہاں جائے مل گئی، وہیں اتر جاتے ہیں۔ شاہی محل سے لگا، جھرنہ۔ تالاب۔ ناظر کا باغ۔ امریوں میں بھی زنانہ ہوا۔ جابجا سبز سبز قناتیں لگی ہیں۔ بادشاہ کی سواری پہلے درگاہ شریف آئی۔ سلام ہوا، فاتحہ پڑھی۔ پھول چڑھائے۔ چراغی دی۔ وہاں سے محل ہو۔ جنگلی ڈیوڑھی سے باغ آگئے۔ بیگماتیں۔ شہزادیاں۔ حرم۔ سریت۔ ناموس۔ امیرزادیاں سیر کو نکل کھڑی ہوئیں۔ پچھیڑا پلٹنوں کے ننھے ننھے سپاہی تلنگوں نجیبوں کی سی وردیاں پہنے، منگنی بندوقیں توسدان لگائے۔ پہرہ دیتے پھر رہے ہیں۔ شاہزادیاں۔ امیرزادیاں۔ رنگ برنگ جوڑے پہنے۔ سونے موتی جواہرات میں ڈوبی چھم چھم کرتی پڑی پھر رہی ہیں۔ انا۔ مغلانیاں۔ ہیگا۔ ددا۔ مائی۔ جیا۔ لونڈیاں۔ باندیاں ہاتھوں چھاؤں اللہ۔ بسم اللہ کرتی، صدقے قربان ہو رہی ہیں۔ لو وہ سب جھرنے آگئیں۔ چھینٹم چھینٹ ہونے لگی۔ کوئی شور بور ہوگئی۔ کسی کا پاؤں کیچڑ میں پھسلا۔ ساری لت پت ہوگئی۔ ایک زنانیٹی قہقہہ پڑا۔ وہ بچاری خفت کی ماری کنیاتی کتراتی آنکھ چرائے

اپنا سا منہ لئے چلی آتی ہے۔ ہمجولیاں نکو بنا رہی ہیں۔ ایک کہتی "اجی! جی نہ کڑھاؤ ایسا ہوتا ہی ہے"۔ دوسری بولی "بوا تمہاری خفت سر آنکھوں پر۔ اچھی، یہ تو بتاؤ، تم نے اس موئی کچڑ میں ایسی کون سی انوکھی۔ اچرج۔ جانِ آدم چیز دیکھی جو یوں پچھاڑیں کھانے لگیں"۔ وہ کھسیانی ہو کر بگڑ رہی ہیں۔ "الٰہی کرے! تم بھی لٹ پٹ ہو۔ تمہاری شیخی بھی کرکری ہو"۔ یہاں سے نکل باغ اور امریوں میں جا دھمکیں کڑھائیاں چڑھی۔ پکوان ہو رہے ہیں۔ مالنیں دوکانیں لگائے۔ پھولوں کے کنٹھے گوندھ رہی ہیں۔ تنبولنیں پکے پکے دیسی پان کی گلوریاں بنا رہی ہیں۔ ترکاری میوے والیاں قرینے سے بیٹھی بیچ رہی ہیں۔ کبابنیں کباب۔ دہی بڑے والیاں دہی بڑے۔ ساد کاروں کی لڑکی بالیاں۔ جڑاؤ انگوٹھیاں۔ چھلّے۔ حلوائیوں کی چھوکریاں پوری۔ کچوری۔ مٹھائی لئے بیٹھی ہیں۔ سارا باغ گل نورنگ۔ گل طرہ۔ گلاب۔ گل مہندی۔ گیندا۔ گل شبو جوئی۔ مولسری۔ مدمالتی سے پڑا مہک رہا ہے۔ آم ہیں محمد شاہی لڈو۔ شہد کوزہ۔ شاہ پسند۔ بتاشہ۔ سفیدا۔ گلابی۔ سیندوریا۔ سردلی کا ٹپکا لگ رہا ہے۔ جامنیں پٹاپٹ گر رہی ہیں۔ لڑکی بالیاں دوڑ دوڑ اٹھا رہی ہیں۔ کھٹا نیبو۔ لیمو۔ شہتوت۔ نگترہ۔ فالسہ۔ کھرنی۔ گولر۔ کمرک۔ بیری۔ کٹھل۔ بڑھل۔ بالکھل۔ آڑو۔ شفتالو کے درخت پھل پھول رہے ہیں۔ جہاں نما میں سنگ سرخ کے سے پاؤں کی کرسی پر جس میں پشت پر سنہری پھول پتے کٹے ہیں۔ کاشانی مخمل کا زم زم گبہ بچھا ہے۔ حضور بہادر شاہ بادشاہ بیٹھے ہیں۔ بازو میں چاندی کے چاند سے تاش میں کارچوبی زیر انداز پر بھنڈا رکھا ہے، پچری کٹوری لگی ہے۔ جھوم جھوم گھٹا آ رہی ہے۔ مینھ کا جھمکا لگ رہا ہے۔ مور جھنکار رہے ہیں۔ بلبلیں چہک رہی ہیں۔ کوئل کوکتی ہے۔ جی میں ہوک اٹھتی ہے۔ پپیہوں کی پی کہاں کا جدا شور ہے۔ کیاریوں میں شاہزادیاں بھیگتی پھول پھول توڑتی پھرتی ہیں۔ اس سے ایسا معلوم دیتا، جیسے رنگ برنگ تیتریاں پھول پھول اڑتی پھرتی ہوں۔ کبھی یاں ٹھٹکیں۔ کبھی داں پنکھڑی پہ جھول لٹریں۔ یا ہریاول میں قمریاں جنگل میں ہرنیاں! رنگین جوڑوں سے چوطرف لالہ نافرمان کھل گیا ہے۔ مینھ کی پھوار سے رنگ کٹ کٹ کے رنگین پانی بہہ رہا ہے۔ کوئی بی دشمن۔ بی جانمن کے گلے بیاں ڈالے چلی آتی ہے۔ کوئی ٹھنک ٹھنک رہ گئی۔ کوئی سرک سرک کر جا پڑی۔ کوئی زیرپائی۔ کفش پائی۔ انی داؤ۔ اتار کھڑاؤں پہنے کھٹ کھٹ اتی چلی آتی ہے، کوئی آموں کے درختوں پر پتھر مار رہی ہے۔ کوئی کیلے کی گیل پکڑے کہہ رہی ہے، "اچھی میری اچپل۔ دلشاد۔ دردانہ ذرا اسے تڑا دیجو۔ لونڈیاں باندیاں کدکڑے لگاتی۔ سگڑے مارتی جھپ جھپ درختوں پر چڑھ گئیں۔ توڑ تاڑ وہیں بکر بکر کھانے لگیں۔ کسی کے کانٹا چبھا۔ کسی کے کھڑ سینچے گئے۔ کوئی گدے نیچے آن پڑی۔ بھوں بھوں بیٹھی رو رہی ہے۔ انا۔ دوا۔ بھیڑ اجلاتی۔ بلبلاتی پیچھے پیچھے ہیں۔ دیکھنا بلائیں لوں۔ بیچ میں چلو۔ سفید چادر اوڑھ لو۔ کہیں یاں منخنا ہوا چوتی والا نہ رہتا ہو۔ کیڑے مکوڑے کا بھی ڈر ہے۔ دوبار کہیں سایہ جھپٹا نہ ہو جائے۔ جو یہ لوٹ دھا جونڈا کورے استرے سے منڈ جائے۔ کچھ ہمجولیاں ہنڈولے ننھی جھول رہی ہیں۔ کچھ ایک پر ایک بولیاں ٹھٹھولیاں مار رہی ہیں۔ آپس میں چہل پہچے ہو رہے ہیں۔ شاباش بوا، یہ لال لال جو جیاتی کرتی یہ موا موبچھ کا بخیہ کیا ہے۔ کیا دشمنوں کے دیدے یٹم ہو گئے تھے۔ بوا بہنی تو خبر لو۔ کیسا سنہری جوڑا کا لی گوٹ سے کلیجی بھیڑا کیا ہے۔ اے بی کیا بتاؤں یہ ساری آغا مینا کی کارستانی ہے۔ ذرا انہیں تو دیکھو، تخت کی قسم۔ صدقہ کا ڈوپٹہ اوڑھے پھر رہی ہیں! ایک دوڑی چلی آتی ہے۔ اچھی ذرا یہ کچا لو چکھنا۔ کیا مٹھلونے بنے ہیں دسرا

---

۱۔ تجمہ و خرگاہ۔

آتی ہے، اچھی میری جانمن! تمہیں ہمارے سر کی قسم۔ اس رنگترے کی راحت جان کو تو دیکھو۔ کیا مزہ دے رہی ہے۔ امریوں میں جھولے پڑے ہیں، ریشمین رسیاں۔ گنگا جمنی پٹریاں۔ دو جھول رہی ہیں۔ چار جھلا رہی ہیں۔ رساں رساں پینگیں بڑھا رہی ہیں۔ جھنبیری آواز میں ملار گا رہی ہیں:۔

جھولا کن نے ڈالو رے امریاں
باگ اندھیرے تال کنارے مورلا جھنکارے بادر کارے
برسن لاگیں بوندیں پھنیاں پھنیاں
جھولا کن نے ڈالو رے امریاں
سب سکھی مل گئیں بھول بھلیاں۔ بھولی بھولی ڈولیں شوق رنگ سیّاں
جھولا کن نے ڈالو رے امریاں

لے لو وہ شام ہوگئی۔ دونوں وقت ملے۔ جھٹپٹا ہوا۔ شمسی تالاب کے کنارے کنارے بانسوں کے ٹھاٹھروں میں لال لال کنول انہیں دغدغے روشن ہیں، درختوں میں قمقمے جگنو کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ محلات میں جھاڑ۔ فانوس۔ فتیل سوز۔ ایک شاخی، دو شاخی سہ شاخی پنج شاخی۔ دیوار گیریاں، چینی لالٹینوں سے رات دن بن گئی ہے، دردیاں بج رہی ہیں۔ نوبت پر ٹکور پڑ رہی ہے۔ لے لو وہ روشن چوکی کا گشت طبلہ نفیری کے ساتھ ساتھ چلا آتا ہے۔ کہیں تان رس خاں سراینچے کے باہر تانیں لگا رہے ہیں۔ کہیں ناچ ہو رہا ہے، ناچنے والیاں اندر سازندے سراینچے کے باہر طبلہ سارنگی، تال کی جوڑی بجا رہے ہیں۔ یہ تمیز تہذیب کی گڑیاں ہوتیں، ان کا پہناوا، ادب قاعدہ کیا بتاؤں کہ دیکھنے سے جی خوش ہو، آنکھیں کھلیں۔ یہ ڈیرے دارنیاں کہلاتی تھیں۔ اگلے وقتوں ایسی ویسی رنڈی ہی نہ تھی۔ ان کی بات چیت۔ گانا۔ چال ڈھال۔ سگھڑاپا، وہ ٹھاٹھ لاکھوں عورتوں میں پہچان لو۔ کنواریں لڑکے لڑکیاں تو ان کے سامنے پڑتے ایسا جھینپتیں جیسے کوئی استانی جی سے سہم جاتا ہو۔ بات بات میں نئی نکالتیں۔ ٹوکتیں۔ ماں باپ کے سامنے نصیحتیاں کرتی تھیں۔ لوگ بچوں کو ان سے ادب قاعدہ سکھواتے ایک اس زمانے کی رنڈیاں ہیں۔ ایک دفعہ شادی میں دیکھا تھا۔ بالکل آغا تو بڑا پہلوان بنی تھی۔ یہ سراینچے کا بانس۔ ہتھنی کی ہتھنی۔ پنجابی پیجامہ۔ نہ زر زیور۔ رنڈاپا سا چھایا ہوا۔ گنوار زبان۔ بات کرے تو معلوم ہو جیسے کوئی لڑتا ہو۔ پھر خیر سے یہ وہ بی جان تھیں جو شہر میں ایک کہلاتی ہیں۔ خیر! شہزادیاں نواڑوں[1] میں بیٹھی شمسی تالاب کی سیر کر رہی ہیں۔ سفید سفید پھولوں کے کنٹھے گلے میں۔ کانوں میں پھولوں کی بالیاں۔ نک سے سک بناؤ سنگار کئے ہیں۔ نواڑوں میں روشنی جیسے تالاب میں چھلا دے۔ پانی میں یہ روشنی اور بہار دیتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے نور کی مچھلیاں تیرتی ہوں۔ کہیں ڈھولکی بج رہی ہے۔ گانا ہو رہا ہے۔ کہیں دس گھرا۔ پچیسی۔ قصے۔ کہانیاں۔ پہیلیاں۔ کہتیاں ہو رہی ہیں۔ کہیں۔ زرگری۔ فرفری۔ سرسری۔ مقلوب۔ کشٹولی۔ بکنی زبانیں بولی جا رہی ہیں۔ کہیں بین بادشاہزادی کا سانگ بن رہا ہے۔ دس بیس مل کے کھڑی ہوگئیں۔ آؤ بھئی۔ آنکھ مچولی کھیلیں۔ قطار باندھ اڑنگ بڑنگ۔ طوطی زیر تنگ، مائی جی کا تھان،

---

[1] چھوٹی کشتیاں، ڈونگے۔

کھیلنے چوغان۔ ہریا ہر بس۔ یہ تو۔ یہ دس۔ جس جس کے نام پر دس آتا گیا۔ اس کو نکالتی گئیں۔ اخیر میں جس کے نام پر دس آیا وہ چور بنی۔ لو ڈیڑھ پہر رات کی توپ چلی، دھائیں۔ سب نے خاصہ کھایا۔ ڈیوڑھیاں اماور ہوئیں۔ بادشاہ نے سکھ فرمایا۔ چپ۔ چپکی۔ داستان ہونے لگی، حبشنیں۔ ترکنیں۔ قلماقنیاں پلنگ کے پہرے پر۔ قلار حبشی۔ دربان، مردھے۔ پیادے۔ سپاہی باہر ڈیوڑھیوں میں اپنی اپنی چوکی پہرے پر کھڑے ہو گئے۔ حکیم۔ طبیب۔ خواص اپنی اپنی نشست میں موجود ہیں۔ کئی دن یوں ہی انوکھے کھیل تماشے، نرالی باتیں رہیں۔ تین دن سیر کے باقی رہے، جھرنے، امریوں کا زمانہ موقوف ہوا۔ جھرنے میں کودا کودی ہونے لگی۔ کوئی پھسلنے پتھر پر پھسل رہا ہے۔ کئی تھئی تھئی ناچ ہو رہا ہے، کہیں چہل پہچھے بے تخیدہ۔ دہبتیاں ہو رہی ہیں۔ کہیں پہلوانوں کے کماٹے[1] ہو رہے ہیں۔ کوئی امریوں میں جھولے پر کھڑا پینگ بڑھا رہا ہے، کوئی بنیٹ پٹا کی سیر دیکھتا ہے۔ کہیں کنکوے[2] بازی ہو رہی ہے۔ کوئی کھیم کر رہا ہے۔ کوئی ٹھمکیاں دے رہا، کسی کا ہتے پر سے اکھڑ گیا۔ کسی کا کنیانے لگا۔ کسی کا چکر ا رہا ہے۔ کسی کی دال چھوٹ[3] ہو گئی۔ کوئی کٹ گیا۔ کوئی دھیری پکار رہا ہے۔ کہیں تکلیں لڑا رہا ہے۔ ان میں کوئی کلیجہ جلی۔ کلجڑی۔ کنسری۔ دو پلکی۔ دو پٹی ہے تو کوئی لل ری، دو بازیوں دار۔ الغرض تیسرے پہر شمسی تالاب پر میلہ لگا۔ شہزادوں کی سواریاں آ رہی ہیں۔ ہٹو بڑھو کا شور مچا ہے۔ حضور بھی برآمد ہوئے۔ میاں شہیدؒ[4] کے شاگرد تیرنے کے کمال دکھا رہے ہیں۔ کوئی آلتی پالتی مارے تیر رہا ہے۔ کوئی چت ہے۔ کوئی ایسا تیرتا جیسے کرسی پر پاؤں پہ پاؤں رکھے بیٹھا ہو۔ الوا اسی نے بیٹھک کی۔ اور آرام کرسی کی طرح ہو بیٹھا۔ ایک ہے کہ مینڈک کی طرح ملاحی تیرتا چلا آتا ہے۔ آگے بڑھ کے اس نے کروٹ لگائی اور اس طرح لیٹ گیا، جیسے کوئی چارپائی پر لیٹا ہو۔ ایک پاؤں دراز ایک پاؤں خم کر کے تکیہ پر رکھ لیا ہے۔ ایک نے جوگیا آسن مارا۔ پھر شیر کی طرح اسدی تیرنے لگا۔ بعد میں استاد شہیدؒ پانی میں اترے۔ انہوں نے وہ وہ کرشمے دکھائے کہ کیا کوئی دکھائے گا۔ سیر کا دن آیا تو راتوں رات دکانیں، مکان سج گئے۔ سارے بازار باغیچہ دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں گملے رکھے ہیں گلاب۔ گیندا۔ گل شبو۔ سورج مکھی۔ گل نرگس کھلا ہے۔ کہیں ہندوؤں نے کیلے کے درخت لا کے شامیانے کی چوبوں میں باندھ دیے ہیں۔ حلوائیوں نے رنگ برنگ لوزاتیں تھالوں میں سجائی ہیں۔ کہیں گرم کچوریاں۔ سہال۔ اندرسے کی گولیاں اتر رہی ہیں کہیں پستہ۔ بادام کے نقل لگے ہیں۔ کہیں مٹھائی کے رنگترے۔ شریفے۔ امرود۔ جامنیں سجی ہیں۔ کہیں موتی چور۔ مونگ، بادام۔ پستے کے لڈو۔ پستہ مغزی۔ قلاقند۔ بالوشاہی۔ در بہشت۔ پھینیاں۔ برفی پر سونے چاندی کے ورق جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ کوئی مزعفری زردی کا حلوا لیے بیٹھا ہے۔ کوئی میوہ۔ رنگترے۔ ترنج کا مربا بیچ رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے مکھن ہے ملائی سے میٹھا۔ کوئی خطائی۔ گولے اور گولیوں کے کباب لونگچڑے اتار رہا ہے۔ لوہے کے چرخی پنکھوں کی جائیں جائیں کا اک شور مچا ہے۔ کوئی کچلے۔ شیرمال، قطب پر اٹھے بیچتا پھرتا ہے، کوئی تندور کی میٹھا آس ٹمک رہا ہے۔ کنجڑوں کی سہانی آوازیں الگ ستم ڈھا رہی ہیں، "قطب صاحب کے بھیجے ترمیوے ہی کھرنیاں لو۔ کالی کالی بھونرا سی جامنیں، نون رائی ہیں نمکین لو۔ جھرنے کا بتاشہ ہی گورہے۔ کیوڑے کی بیل کے

---

[1] داؤں کے پیچ۔ [2] پتنگ بازی۔ [3] آپس میں مل گئے۔ [4] میاں محمد اسمٰعیل شہید۔

سنگھاڑے، نرمل تلاؤ کے ہی دودھیا لو۔ پال[1] میں ڈالے ہیں جی کرانے کا لڈو والو۔ سیاہ لچھے ہیں ہاتھوں کے کھلونے ہیں بالے بھولوں کے۔" کہیں دیگیں کھڑک رہی ہیں۔ بریانی، تنجن، قورمہ پک رہا ہے۔ کہیں قہقہے چھچھے اڑ رہے ہیں۔ دودھ پھینیاں، حلوا پوری۔ ملائی کی برف کی چکوتھیاں ہو رہی ہیں۔ کوئی بارہ مصالحہ کی چاٹ اڑا رہا ہے۔ کوئی دہی بڑے کے چٹخارے لے رہا ہے۔ اے لو! وہ شکور گگرہ والا آیا۔ یہ جگت میں جواب نہیں رکھتا۔ کارچوبی ٹوپی۔ کارچوبی جوتی۔ چکن کا اونچی چولی کا انگرکھا بچوں کا غول پیچھے پیچھے۔ دولہا بنے چلے آتے ہیں۔ بڑا سا خوبصورت حقہ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو چار پانچ گز کی نے زرچیر تامی لپٹی ہوئی۔ گنگا جمنی مہنال۔ بجر سی چلم سے خمیرے کی مہکار چلی آتی ہے۔ سڑک پر سے کوٹھوں پر بلاتے انعام اکرام لیتے چلے جاتے ہیں جہاں ٹھیرے منھ سے پھول گرنے لگے۔ یہ شعر زبان پر بہت چڑھا ہوا ہے، لہک لہک کر پڑھا جا رہا ہے:—

حقہ نہیں ہے حضرت والا کے ہاتھ میں
گویا کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں!

مداری تماشہ کر رہے ہیں۔ کوئی ریچھ نچا رہا ہے۔ کوئی بندر۔ شہدے۔ امیر امرار کے مکانوں پر کھڑے اودھم مچا رہے ہیں۔ جابجا دونوں کانوں پر سونے چاندی کی انگوٹھیاں۔ اکے۔ نونگے۔ پوتھوں کے پچھے۔ موتیوں کے ہار۔ شیشوں کے ہار۔ لال سبز۔ زرد۔ اودے۔ پچرنگے، سوت ریشم کے ڈورے۔ پنکھیاں سجی ہیں۔ گندیوں[2] کے ہاں عطر۔ تیل پھلیل کے کنٹر پہ کنٹر خالی ہوتے جاتے ہیں۔ بازار مہک رہے ہیں دوکانوں پر بجر ٹے "چھلا دے رے مورے تا ئیں" گاتے مانگتے پھرتے ہیں۔ بےنوا[3] آزاد۔ خرے۔ رسول شاہی چار ابرو کا صفایا کئے اپنی اپنی صدا کہہ رہے ہیں "کچھ راہ خدا دیا جا۔ جا تیرا بھلا ہو گا۔ بھلا کر بھلا ہو گا۔ سوداگر نفع ہو گا۔ کیا خوب سودا نقد ہے۔ اس ہاتھ دے۔ اس ہاتھ لے رام رام کرلے پنچھی۔ یہ کایا نہیں پاوے گا۔ کنکر چن چن محل بنایا۔ مورکھ کہے گھر میرا ہے۔ نا گھر میرا نا گھر تیرا چڑیا رین بسیرا ہے۔ رام رام کرلے اچھے بندے یہ کایا نہیں پاوے۔ ماٹی اوڑھنا ماٹی بچھونا ماٹی کا سرھیانا رے۔ ماٹی کا کلبوت (قالب) بنا اوس میں کلب (قلب) کایا رے۔ رام رام کرلے گا فل وغافل، بندے یہ کایا نہیں پاوے گا۔" کہیں حسینی برہمن چادر اچھالے کہہ رہے ہیں "اعزیز وحق تعالی کبریا ہے شرف جس نے پیمبر کو دیا ہے۔" نوٹنکی والے الگ گا رہے ہیں "ہم پردیسی پاؤنے جو رین کیو بسرام۔ بھور بھئے اٹھ جائیں گے۔ بسے تمارو گام۔ ہم پردیسی رے کر جائیں ہم پردیسی رے۔" ظہر کے بعد بیرہ بندی ہوئی سڑک کے دونوں جانب پلٹنیں کھڑی ہو گئیں۔ کمروں میں اجلا اجلا براق سا فرش فروش ہوا ہے۔ چاندی کے پلنگوں پر دلائیش[4] گیر کھنچے ہیں۔ باناتی پردے پڑے ہیں۔ مہین چقیں، چلمنیں (چلونیں) پھولدار نگیرے لگے ہیں۔ برآمدے جھاڑ فانوس۔ رنگین گلاسوں۔ قمقموں۔ بڑے بڑے آئینوں۔ ابرک کے لال سبز کنول۔ ہنڈیوں۔ دیوارگیریوں سے۔ دلھن بنے ہوئے ہیں۔ مکانوں۔ دوکانوں کے آگے جنگی تخت ہیں۔ ان پر بیچ سجائے شامیانے تنے ہیں۔ کہیں اودی، کاشانی مخمل کے مسند تکیے لگے ہیں۔ کہیں صرف دودھ سی سفید چاندنیاں بچھی ہیں۔ گلناری تراش کے میز فرش رکھے ہیں۔ جابجی کلیاں۔ ستک۔ نقشین خاصدان۔ اگالدان رکھے ہیں۔

---

[1] آم۔ [2] عطر فروش۔ [3] فقیروں کے فرقے۔ [4] ایک قسم کا پلنگ پوش۔

اگرسوز روشن ہیں۔ سیلانی بیٹھے سیر دیکھ رہے ہیں۔ اے لو! وہ احتشام توپ خانے نے سلامی اتاری۔ دھنا دھن توپیں چلنے لگیں۔ حضور بہادر شاہ بادشاہ فاتحہ کو درگاہ شریف آتے ہیں۔ وہ جلوس شروع ہوگیا۔ پہلے نشان کے دو ہاتھی آئے۔ سر سے پاؤں تک نقش و نگار بنے ہیں۔ کرکری تاش کا پھریرا اڑتا چلا آتا ہے۔ تامی جھولیں پڑی ہیں۔ ریشمی ڈوریوں میں کلابتوں کے پھندنے جھول رہے ہیں۔ لو وہ چتر کا گراں بار[1] ہاتھی آیا۔ پہاڑ کا پہاڑ۔ جھومتا۔ پھنکارے مارتا۔ سونڈ سے سلام کرتا چلا آتا ہے۔ چتر میں سونے کے کلس۔ گنگا جمنی سہارا[2] ہے۔ نیچے اوپر کارچوبی کام میں لپا ہوا ہے۔ کرن کی جھالر جگر جگر کر رہی ہے۔ وہ ماہی مراتب کے ہاتھی آئے۔ یہ اگلے باشاہوں کے فتح کے نشان ہیں۔ سونے کے بنے سنہری چوبوں پر لگے۔ کوئی مچھلی کی شکل ہے۔ کوئی گھوڑے کا سر اور شیر کا کلہ ہے۔ تاش تامی ٹکے۔ قیطونی ڈوریاں، پھولوں کے سہرے بندھے ہیں۔ یہ خاص باشاہی نشان ہے۔ ان کے پیچھے نوبت نقارے کے اونٹ۔ زنبور کے اونٹ آئے۔ نوبت بج رہی ہے۔ زنبوریں چھوٹ رہی ہیں۔ خاصے گھوڑے سونے چاندی کے سازمیں ڈوبے بدک بدک کر مور بنے جاتے ہیں۔ کالی انگرکی بکھرا۔ تلنگوں کے تمن[3]۔ کمر میں تلوار۔ کندھوں پر دھماکے۔ بندوق۔ توسدان لگائے۔ دو دو کی قطار میں چلے آتے ہیں۔ امتیازی صوبہ دار کمیدان۔ اور جانے کون کون۔ منقشی توڑے، طرّے پگڑیوں میں لگائے۔ کارچوبی پرتلے حمایل کئے، ایک رنگ سفید گھوڑوں پر سوار ہیں۔ حضور بہادر شاہ بادشاہ کبھی سایہ دار تخت میں زربفت کے مسند تکیے لگائے بیٹھے ہیں۔ کبھی خسخانوں کے تخت میں برآمد ہوتے۔ اندر چھوٹا منکنا فراشی پنکھا کھنچ رہا ہے۔ کبھی ہودا میں ہیں۔ نہیں تو سدا اینگڈ مبر میں نکلتے۔ مولابخش[4]۔ خورشید گنج۔ چاند مورت۔ نقش و نگار سے سجے۔ ماتھوں پر فولاد کی ڈھال۔ کانوں میں سونے کے بالے۔ پھول پتے۔ ریشم اور کلابتوں کے گچھے۔ لڑیاں۔ بانات کی کارچوبی جھولیں پڑی ہیں۔ ان میں سے جس پر حضور ہیں۔ اسے فوجدار خاں مہاوت گوشوارہ کلغی لگائے۔ ایک ہاتھ میں گجباگ[5]۔ ایک ہاتھ میں شاہی بھنڈا ہولتے چلے آتے ہیں۔ ینگڈ مبر میں حضور عالم پناہ بڑی شان و شوکت سے بیٹھے ہیں۔ نیچے قبا۔ اوپر چارقب۔ دستار۔ گوشوارہ جیغہ۔ سرپیچ۔ تاج شاہی! جس میں بڑے بڑے موتیوں کا طرّہ آویزاں ہے۔ گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔ موتی مالا۔ جس میں ایک ایک موتی ایک ایک زمرد، اور دس دس دانوں پر یاقوت کی ہڑیں بندھی ہیں۔ بیچوں بیچ یاقوت کی تختی ہے۔ اسیر ہیروں کا ہار۔ یاقوت کا ہار۔ بازوں پر ہیرے کے بھج بند۔ نورتن۔ ہاتھوں میں سات جواہرات سمرنیں۔ داہنے میں چار بائیں میں تین، جھل جھل کر رہی ہیں۔ سامنے دو گنگا جمنی ترکش۔ ایک کمان آویزاں ہے۔ سر پر خوبصورت چتر کا سایہ ہے۔ ہاتھی کے سامنے روشن چوکی بج رہی ہے۔ اہلو پہلو خواص۔ سرسبز پگڑیاں کمر میں لال لال شالی رومال۔ چنی ہوئی چپکنیں پہنے، اپنے اپنے عہدے لئے جاتے ہیں۔ نقیب چوبدار خبرداری پکار رہے ہیں۔ خواصی[6] میں مرد اشبو بیٹھے ہما کے پر کا رنگین مورچھل کرتے جاتے ہیں۔ ہاتھی کے پیچھے جو ریشمی ڈوری پڑی ہوتی اسے دربان ناپتا اور جب کوس پورا ہو جاتا تو وہ جھنڈی لے کے سامنے آتا۔ مجرا کرتا۔ اس سے یہ مراد کہ سواری کوس بھر آئی۔ گھڑیالی

---

[1] ہاتھی کا نام۔ [2] ڈنڈی۔ [3] سو سو سپاہیوں کا ایک تمن ہوتا تھا۔ [4] ہاتھیوں کے نام ہیں۔
[5] آنکس۔ [6] یہ خدمت نظارت کہلاتی تھی۔

گھڑی بہر جاتا ہے۔ ایک جریب پیچھے ملکہ زمانی۔ شاہزادیوں کی عماریاں۔ ان کے پیچھے آرایش، اس کے ایک جریب پیچھے امیر امراء، نواب راجاؤں کی سواریاں۔ سوار۔ رسالے۔ طبل کے ہاتھی۔ بیلے کے ہاتھی بیلہ بانٹتے چلے آتے ہیں۔ سواری درگاہ شریف گئی۔ واں سے آ کر سب شاہی محلوں میں پنکھوں کی سیر دیکھنے آن بیٹھے۔ محلوں کے نیچے پہلے آرایش کے لٹنے کی ایک دھوم اس کی سیر دیکھی۔ مغرب کے بعد شاہی پنکھا آیا۔ یہ سونے کا بنا ہوا ہے۔ نیچے ساپنچے موتیوں کی جھالر۔ سچے آویزے۔ اوپر سونے کا مور جس کی گردن اور دُم میں رنگ برنگ جواہرات جڑے ہیں، پیٹ میں گلاب، کیوڑا، مشک، زعفران، عنبر کا آمیزہ بھرا ہوا ہے، جو پنجوں میں سے رس رس کے ٹپکتا جاتا ہے۔ کلاوے اور پھولوں کے سہرے پڑے ہیں۔ آگے پھولوں کی چھڑیاں۔ پھینک پٹا کے اکھاڑے۔ نفیری والے۔ سپاہیوں کے تمن باجا بجاتے چلے آتے ہیں۔ سقے کٹورے کا کمال دکھا رہے ہیں۔ چھڑکاؤ بھی ہوتا جاتا ہے۔ سبیل بھی پلا رہے ہیں "میاں پانی پلاؤں۔ برف کی طرح ٹھنڈا ہے، آب حیات کے دو گھونٹ" یہ اس مزے سے کہتے، باربد بھی کان پکڑے۔ کوئی کہتا "پیاسوں سبیل ہے مولا کے نام کی" "تیرے پاس ہے تو دے جا نہیں تو پی جا راہ لگ۔" پیچھے پیچھے شاہزادے۔ سلاطین۔ امیر و امراء رنگ برنگ کپڑے پہنے۔ نئی دھج۔ نرالی وضع سے گھوڑوں پر سوار ساتھ ساتھ ہیں۔ ہزارے چھوٹ رہے ہیں، خواص گلاب پاشوں سے آمیزہ[1] چھڑک رہے ہیں۔ کبھی میٹھی میٹھی پھوار پڑنے لگتی کبھی پھیا پھیا برس رہا ہے۔ خلقت کے کوٹھوں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔ کچے مکان بوجھ کے مارے ٹوٹے پڑتے ہیں۔ نیچے بھی یہ عالم ہے کہ میں تجھ پہ۔ تو مجھ پہ۔ کھوے سے کھوا چھلے۔ تھالی پھینکو تو سر ہی سر ہے۔ شاہزادے۔ سلاطین کے پیچھے قلعی گر، زردوزوں، آتشبازوں اور پھول والوں کے پنکھے کی دھوم دھام ہوتی۔ مگر یہ میں اپنے بچپنے کا ذکر سنا رہی ہوں۔ بعد میں حضور بہادر شاہ بادشاہ کو کچھ ادھر کی لو زیادہ لگ گئی تھی۔ یہ بات ان کے گیتوں میں بھی اجاگر ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا معلوم دیتا ہے، جیسے دل میں بیٹھے کوئی چٹکیاں لیتا ہو۔ مگر اور پنکھے برس کے برس اسی ٹھاٹھ سے نکلتے تھے۔ بس یوں سمجھو، ایک شاہی پنکھا نہ ہوتا۔ نہیں تو ساری باتیں ہوتیں۔ حضور خود بھی ضرور آتے تھے۔ ہاں تو بڑی دھوم دھام سے پنکھے آ رہے ہیں۔ بازاروں میں جا بجا ٹھاٹھر بندی ہے، جنہیں ابرک کے کنول ان میں شمعائیں روشن ہیں۔ بانس میں کھپچیوں کی ٹٹیاں اون میں بھی کنول دغدغے روشن ہیں۔ کہیں رنگ برنگ گلاس قمقموں۔ چینی قندیلوں کی بہار ہے۔ کہیں جھاڑ فانوس۔ ہانڈیوں دیوارگیریوں سے آنکھوں میں چکا چوندھ آ رہی ہے۔ دوکانوں مکانوں پر ابرک ملا کر جو سفیدی کی گئی ہے، اس سے سارے بازار جھم جھم کر رہے ہیں۔ رات میں دن نکلا ہوا ہے، اے لو پنکھے شاہی محلات کے نیچے آ گئے۔ خوجے اوپر سے چھنا چھن روپے پھینک رہے ہیں۔ نفیری والا کس مزے سے بجا رہا ہے:۔

میرا پیا گیا ہے بدیس، موری چونری کون رنگا رے۔ بیری ساون آیو ری۔ مور پیا گیا ہے بدیس ـــ

آتشبازوں نے آتشبازی چھوڑنی شروع کی۔ انار۔ پھلجڑی۔ چھچھوندر۔ مہتاب۔ چکر۔ گنج۔ چرخیاں۔ ہت پھول۔ جائی جوئی۔ ہوائیاں ٹٹاخے۔ آسمانی گولے۔ زمینی گولے۔ تخنگ۔ چادر۔ کوٹھی۔ پنکھیاں۔ سانپ۔ درخت ہاتھی اور جانے کیا کیا چھوڑا۔ کچھ دیر میں سب

---

[1] یہ پانچ خوشبوؤں گلاب۔ کیوڑا۔ مشک۔ زعفران۔ عنبر کا بنایا جاتا تھا۔

انعام اکرام لے یہاں سے رخصت ہوئے۔ مسلمانوں نے درگاہ میں اور ہندوؤں نے جوگ مایا میں پنکھے چڑھائے۔ رات بھر ناچ رنگ کی محفل گرم ہوئی۔ شاہ ناصر وزیر کے شاگرد بین بجا رہے ہیں، مرزا گوہر مرزا کالے کے شاگرد ستار کے کمال دکھا رہے ہیں۔ کہیں ڈھولک۔ طنبورہ۔ کھڑک رہا ہے۔ صبح کو سونے چاندی کے چھلے۔ انگوٹھیاں۔ نونگے۔ اِکے۔ پوتھوں کے پنچھے۔ موتیوں کے ہار۔ شیشوں کے ہار۔ رنگ برنگ ڈورے۔ پنیر۔ پراٹھے۔ کھوے کی سوغاتیں لے لوا۔ سب شہر چل کھڑے ہوئے۔ بادشاہ ساری برسات یہیں گذاریں گے۔ سیر و شکار۔ کل سلطنت کا کاروبار یہیں سرانجام دیں گے۔

لو بھئی! یہ ہمارے زمانہ کا شہر اور یہ میلے تھے۔ اس میں ہندو بھی ہوتے، مسلمان بھی۔ مگر میاں کیا مقدور جو برائی نکلے، بہت کچھ اجڑ گیا تھا۔ پھر بھی مغلئی باقی تھی۔ مسلمان ہندوؤں پر جان چھڑکتے۔ یہ مسلمانوں کی آنکھ دیکھتے گذارتے، ایک تو شاہ تھا تو دوسرا شاہ بالا! اب وہ زمانہ الٹا ہو گیا ہے کہ اینٹیں دب رہی ہیں، روڑے اچھل رہے ہیں۔ وہی شہر آج شہر شہلہ ہے۔ وہ بیر اکھیری ہے کہ ایک ایک کو کچا نگلے جاتا ہے، ایک ایک کے سایہ سے بھاگتا ہے۔ ایسا سی کا کانٹا گڑھا ہے کہ موا روز اک جھگڑا اوٹھتا ہی نہیں جانے کس نے اتنا بیر بسا دیا۔ کس کا یہ کرشمہ ہے۔ کیوں ہماری عقلوں پر ٹپکی پڑ گئی۔ ان روز روز کے جھگڑوں کو دیکھکر تو اب اللہ جانے یہ جی چاہنے لگا ہے، زمین پھٹ جائے اور ہم سب سما جائیں تو اچھا ہو۔ ہمیش کو قصہ چکے۔ رسوائی اور جگ ہنسائی سے تو نجات ملے۔ مجھے تو دونوں آنکھیں برابر ہیں۔ صاف کہتی ہوں۔ ہم میں جو نہیں سنتا نہ سنے۔ ایسی تیسی میں پڑے۔ تم روٹھے، ہم چھوٹے۔ خودسری رنگ لائے پر لائے۔ تیلیوں کی طرح بکھر کر اور مزہ چکھ لیں گے۔ ہم اپنا دل صاف رکھیں۔ کسی کے درپئے نہوں نہیں تو ان باتوں سے بہت سے غارتی گو لے لوٹ لوٹ کے اور کھائے جاتے ہیں۔ جو بیچارے ہمدرد ہیں وہ تو خیر ہیں ہی۔ مگر ان کے برن میں اور بہت سیانے لیڈر گیڈر نکل پڑے ہیں۔ موؤں کی حالت یہ ہے۔ بر سہ دو کعبہ اور مندر ڈھوا لو۔ مگر تیس مار خاں بنے پھرتے ہیں۔ جسے دیکھو سر خرد چونڈا ایمان بھونڈا۔ لے میں تو سمجھتی ہوں، یہ موئے کام کے نہ کاج کے یونہی میٹھے شیخیاں بگھارتے ہیں، چندے پہ چندہ لئے جاتے ہیں۔ برس بھر ہونے کو آیا۔ دو چار غارتی کے مارے آ، مجھ بڑھیا کی چیز بست بھی تو لے گئے۔ کہنے لگے "ہندو مسلمانوں کا ملاپ کرائیں گے روپیہ دو۔ بیٹا میں بھی ان کی باتوں میں آگئی۔ وہ دن اور آج کا دن نہ ملاپ ہی ہوا۔ نہ اون کی میں نے پھر شکل دیکھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کھاپی بیٹھ گئے۔ میں بھی کوس کوس کے کھیر الکڑی کروں گی:" آئی اچھریاں کٹا دن۔ زہر مار۔ انتی سارا!"

یہاں یہ پیارے احساس، خوبصورت جذبات کی نظم تمام ہو گئی۔ ہائے وہ سریلے بول جو پیا شاہ رنگیلے کی پر ترنم ٹوری اور بہادر شاہ بادشاہ کا ملار ہوں!! اب یہ باتیں اسواسطے سہانی سمجھی جاتی ہیں کہ وہ زمانہ گذر گیا۔ تخیل کی سیر بن گزرے زمانے میں نت نئے کرشمے دکھاتی ہے۔ یا واقعی میں وہ سہانی بھی تھیں تو یہ ہر شخص بساط بھر طے کر سکتا ہے۔ البتہ اس نظم زندگی کی آواز ہے جس میں دلی پیامی کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہو میرے انجان ( S.bconcions mind. ) میں تو سدا یادِ ایام کی ایسی گھڑیاں جاگ جاتی تھیں جو توریث کی اکسیر بنکر رگوں میں، رگوں کے دوڑتے خون میں گھل مل گئی ہوں۔ میں نے اکثر دیکھا ایک نور کی نگری ہے۔ جہاں اس ظاہر باطن کی سج دھج والی خاتون کے پاک صاف تخیل کی نازک نازک پتریاں دلی کے آڑے بیچا مے آڑے ڈوپٹہ میں

گلے بیّاں ڈالے پھرتی ہیں۔ محلات میں کہیں تاج محل ہے تو کہیں لال حویلی۔ گویا کہیں بغداد ہے تو کہیں الحمرا! ان میں اکبر اعظم جہاں گیر، شاہجہاں، اورنگ زیب۔ نور جہاں۔ ممتاز محل۔ زیب النسا کی بستی ہے، یا یہ لایق احترام بادشاہ اور بیگمات ہیں یا وہ بزرگ رفتگاں جو پاشاہت کی گودیوں پلے، بڑھے اور پاشاہت ہی کے زانو پر جنہوں نے دم توڑا۔ دلیر۔ وضعدار۔ ہنس مکھ۔ ملنسار۔ علم دفن کے دُلارے۔ تیز تہذیب کے پیارے۔ مرنجاں مرنج، جس میں ایران کی خوش باشی، ہند کے بھولے پن نے عرب کی اساسی سادگی، پاکیزگی اور بلندی سے میل کھا کر اک انوکھی روح پھونکدی ہے، اور جو دلّی میں آکر تو یہ شباب نازنین بنی مشرقی یادگاروں کے گیت گاتی پھرتی ہے۔ چہرہ صبح بہار کی طرح شباب سے روشن۔ پیارے پیارے احساسات اور جذبات کے خوش رنگ پھول نک سے سک تک ہنس رہے ہیں اور دولت اور خوشی کے مینہ برس رہے ہیں! اس سَمے میری نظروں میں ماضی۔ حال۔ مستقبل ایک ہو جاتا، اور دل کی آنکھ وہ وہ سندر نظارے دیکھتی کہ جن کے آگے چاندنی کرنوں سے جگمگاتی رات میں تاج محل کا خوبصورت منظر بھی ماند سا پڑ جاتا۔ اب کے بھی یہ آواز رکی تو نور سمٹ گیا۔ اور ایسا معلوم دیا، جیسے چمن کی نازک نازک شاخیں جھک جائیں، پھول کملا جائیں۔ بات کی بات میں افسردگی کا دھندلکا اس نورانی بستی پر بھی چھا گیا۔ دیکھتے دیکھتے اگلے زمانے کی روح رنگیں قوس و قزح کی طرح گم تھی! اس سے دل تڑپ اٹھا، آتما کلپ گئی، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور سامنے آسمان پر میری ٹکٹکی بندھ گئی! جہاں سورج کا روشن گردا مغلئی شان و شوکت کی طرح ڈوب چکا تھا!!

سیّد وزیر حسن عُلا (دہلوی)


# تذکرۂ خندۂ گل

یا

## ظریف شاعروں کا تذکرہ

جسمیں ۳۰۰ سو سے زاید اردو، فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات، انکے لطایف و ظرایف اور انتخابات کلام درج ہیں۔ یہ کتاب اردو میں اپنے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے اور ہر صاحب ذوق کی لائبریری میں اس کا رہنا ضروری ہے۔ تنہائی میں اس سے بہتر مونس، غمگینی میں اس سے زیادہ کامیاب ذریعۂ تفریح اور اہل تحقیق کے لئے اس سے زیادہ مواد اس موضوع پر اور کہیں نہیں مل سکتا۔ حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات۔

قیمت مع محصول ڈاک للعہ (چار روپیہ)

منیجر "نگار" لکھنؤ

# آہ، ظفر!

حصارِ رحمتِ پروردگار تھی دہلی　　　دیارِ شوکت و عزّ و وقار تھی دہلی
خوشا وہ وقت کہ فردوس زار تھی دہلی　　　خوشا وہ عہد کہ جانِ بہار تھی دہلی

فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا اسکو
اسیرِ نالہ و فریاد کر دیا اسکو

جہاں میں شاہدِ عشرت تھی ہمنشیں اسکی　　　تہِ فلک تھی فضا فرحت آفریں اس کی
برنگِ گلشنِ فردوس تھی زمیں اس کی　　　مثالِ مہر ضیا بار تھی جبیں اس کی

پڑے تھے حور و ملائک کے کارواں اسمیں
بچھا تھا تختِ سلاطینِ گورگاں اسمیں

لہو سے دجلہ کا پانی ہوا تھا جب گلگوں　　　رہی نہ تھی تہِ افلاک شوکتِ ہاروں
کہیں نہ ملتی تھی عبّاسیوں کو جائے سکوں　　　نشانِ ہیبتِ غرناطہ ہو گیا تھا نگوں

لُٹا رہا تھا متاعِ ضیا ہلال یہاں
نظر فروز تھا اسلام کا جمال یہاں

لگا رہی تھی یہ اوجِ سپہر پر زینے　　　دکھا رہی تھی رسومِ کہن کے آئینے
جلا رہی تھی اشوکا کی یاد سے سینے　　　مٹا رہی تھی دلوں کی فضاؤں سے کینے

ریاضِ ہند میں حورِ بہشت زاد تھی یہ
جہاں میں شیخ و برہمن کا اتحاد تھی یہ

بھرے ہوئے تھے متاعِ نشاط سے دامن　　　نوائے مومنؔ و غالبؔ سے مست تھے گلشن
زبانِ ذوقؔ سے جھڑتے تھے پھولِ وقتِ سخن　　　چراغِ تفتہؔ و سالکؔ سے بزم تھی روشن

ظفر کہ باغِ حکومت کا آخری گل تھا
اس انجمن میں نوا سنج مثلِ بلبل تھا

ریاضِ دودۂ تیمور کا ہزار تھا یہ — شکوہِ بابر و اکبر کی یادگار تھا یہ
جہاں میں برقِ جہانگیر کا شرار تھا یہ — گلِ بہار تھا یہ فخرِ روزگار تھا یہ
بلند و پست کا آئینہ دار تھا گویا
مآلِ ہیبتِ چین و تتار تھا گویا

دکھا رہا تھا تماشائے عالمِ فانی — چھپا رہا تھا فقیری میں شانِ سلطانی
غزل میں کرتا تھا اظہارِ دردِ پنہانی — سکندروں کو پلاتا تھا آبِ حیوانی
دمِ سحر جو گلستاں میں نغمہ سازی تھی
بہارِ رفتہ کے غم میں فغاں طرازی تھی

غضب ہے تیغِ فلک بے نیام ہو جائے — ریاضِ دہر میں جینا حرام ہو جائے
یہ عندلیب گرفتارِ دام ہو جائے — مہِ فرازِ شہی بے مقام ہو جائے
علاجِ درد جو چاہے کہیں دوا نہ ملے
مرے تو خاکِ وطن میں لحد کو جا نہ ملے

ازل سے گردشِ گردوں کا ہے یہی دستور — چڑھائے دار پہ اس نے ہزار ہا منصور
وہ قافلہ جسے لایا تھا سند میں تیمور — ہے اسکی خاک سے زنگون کی فضا معمور
طلسم کاریِ نیرنگِ آسماں دیکھو
مآلِ دولتِ صاحبقراناں دیکھو

خموش قصر، شکستہ سرائیں روتی ہیں — کنارِ گنگ و جمن کی فضائیں روتی ہیں
ہمالیہ کی بہشتی ہوائیں روتی ہیں — سحاب روتے ہیں انکو گھٹائیں روتی ہیں
رہے گی دہر میں تا حشر داستاں انکی
کبھی نہ بھولے گی ہندوستاں کو شاں انکی

اصغر حسین خاں نظیر (لودھیانوی)

# عہد ظفر مین دہلی کی شاعری

محمد شاہی دور تک اگرچہ دہلی مین اردو شاعری کا رواج ہو چکا تاہم شاعری نے ابتک کوئی سنجیدہ اور موزون قالب اختیار نہین کیا تھا۔ بلکہ وہ غلط، مکروہ۔ اور مبتذل الفاظ و معانی کا مجموعہ تھی اور اس حیثیت سے اُسکو قدیم دکنی شعراء کے کلام پر چندان تفوق حاصل نہ تھا۔ مثلاً اس دور مین شاہ مبارک آبرو سب سے زیادہ نامور شاعر ہین لیکن انکے کلام کا نمونہ یہ ہے

اُٹھ چیت کھوں جنوں ستی خاطر نچنت      اے کچھ بہار تجھکو خبر ہے بسنت کی

یارون ڈر دکھ سے مڑوڑو نہ بھر کے انگ      آجا کہین لچک تو لاگ جائے لنگ

اس دور کے اساتذہ مین ایک اور بزرگ شاکر ناجی بھی ہین لیکن اُنکی وقعت جعفر زٹلی سے زیادہ نہ تھی چنانچہ میر صاحب انکی نسبت لکھتے ہین۔

"مزاجش بیشتر مائل بہ ہزل بود      معاصر میان آبرو بود

بندہ بہ یک دو بار ملاقات کردہ شعر ہزل خود می داند، و مردمان را بہ خندہ می آرد"

اگرچہ شاہ حاتم اس دور کے شعراء مین ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہین اور زبان کی سلاست اور صفائی مین بہت کوشان رہے۔ مگر تذکرہ قدرت اللہ مین انکے کلام کے متعلق جو آبرو اور ناجی کے طرز مین لکھا تھا۔ لکھا ہے۔

"بطرز آبرو ناجی حرف می زند۔ اکثر اشعارش از لطف خالی یافتم"

غرضکہ محمد شاہی دور تک شاعری کا جو رنگ تھا۔ وہ بہت کچھ اصلاح طلب اور ترمیم کا محتاج تھا۔ محمد شاہ کے بعد شاہ عالم کا زمانہ آیا۔ انکے بارے مین آزاد فرماتے ہین۔

"بہر حال عالمگیر کے عہد مین ولی نے اس نظم (ریختہ) کا چراغ روشن کیا۔ جو محمد شاہ کے عہد مین آسمان پر ستارہ ہو کر چمکا۔ اور شاہ عالم کے عہد مین آفتاب ہو کر اوج پر آیا" شاہ عالم خود ایک پُر گو اور مشاق شاعر تھے۔ آفتاب تخلص کرتے تھے۔ اُنکے چار دیوان اُردو مین موجود ہین۔ اس دور مین درحقیقت خواجہ میر درد۔ فقیر۔ مرزا سودا۔ میر تقی میر۔ میر حسن جیسے اساتذہ اور مصلحین فن نے اردو شاعری کے اکثر عیوب مٹا ڈالے۔ سوقیانہ شاعری۔ مبتذل اشعار۔ ایہام گوئی۔ اور بھاشا، سنسکرت اور دکنی الفاظ سے کنارہ کشی اختیار کی۔ زبان کی صفائی۔ سلاست۔ بشستگی۔ مضمون آرائی اور اصلاح الفاظ پر خاص توجہ کی اور ایرانی شعراء کے نقش قدم پر چل کر اردو کو فارسی رنگ مین رنگنے کی کوشش کی۔

سخن کو ریختی کے پوچھے تھا کوئی سودا      پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھے

میر فرماتے ہین:۔

دل کس طرح نہ کھینچین اشعار ریختی کے          بہتر کیا ہے بین نے اس عیب کو ہنر سے

باوجود اسکے زبان کی صفائی اور صحت مین پوری کوشش کی، اور بہت سے الفاظ اور روابط جنکو دکنی اور انکے ہمعصر بے تکلف استعمال کرتے تھے نکال ڈالے۔ تاہم کچھ الفاظ ایسے رہگئے جو انکے زمانہ مین فصیح سمجھے جاتے ہون مگر آج ہمکو اجنبی اور نامانوس معلوم ہوتے ہین مثلاً

| | | |
|---|---|---|
| کیا کیا | بجائے | کس کس |
| ان سنے | // | ادس سنے |
| مجھ آنسو | // | میرے آنسو |
| ایدہر اودھر | // | ادھر ادھر |
| کہنے لاگا | // | کہنے لگا |
| سجن | // | معشوق |
| دم کھا رہے | // | سانس نہ لو |

اس طرح اور بہت سے اشعار مین جو زیادہ جستجو کرنے سے مل سکتے ہین۔

ان تمام باتون پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہین کہ اگرچہ میر اور سودا نے اردو زبان اور شاعری کو قعر مذلت سے نکال کر بہت کچھ سنوارا اور نہایت آب و تاب دی۔ تاہم اردو ابھی تک ترمیم اور اصلاح کی محتاج تھی۔

شاہ عالم کے بعد محمد اکبر شاہ ثانی تخت دہلی پر جادہ افروز ہوئے یہ بھی اکثر شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ اور شعاع تخلص کرتے تھے ۱۸۳۷ء مین انکے وفات پر بہادر شاہ ظفر بادشاہ ہوئے

ظفر کو اوائل عمر ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا، زمانہ ولیعہدی مین بھی دربار ظفر مین اساتذہ فن کا جمگھٹا رہتا تھا، اور شعر و شاعری کے چرچے رہتے۔ اور مشاعرے بہت دھوم دھام سے منعقد ہوتے تھے۔ مگر جب یہ بادشاہ ہوئے تو ان کا شوق شاعری حد عشق تک پہونچ گیا۔ اور انکی حکومت چونکہ فقط نام کی تھی اور صرف دہلی اور اسکے گرد نواح تک محدود تھی اور اونکو کار ہائے حکومت سے کچھ سروکار نہ تھا بدین وجہ یہ ہر لحہ شعر و سخن مین منہمک رہتے تھے۔

ظفر کی سخن پروری کی بدولت عوام مین شاعری نے اسقدر زور پکڑا کہ دہلی کی گلیون کا ہر طفل دبستان اپنے آپکو میر، سودا۔ اور مصحفی کا ہمسر سمجھنے لگا۔ دہلی کا بچہ بچہ شعر و شاعری کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خاک پاک دہلی صہبائی۔ اور آزردہ جیسے فضلاء فارسی و عربی اور شیفتہ جیسے ناقد فن سے مشرف تھی۔ دہلی کی ادبی فضا مین غالب۔ ذوق اور مومن جیسے کاملین فن سانس لیتے تھے۔ دتی کا ہر جوان پیر اس بادہ ادب سے مخمور اور سرشار تھا۔

## شعرائے سلف کا عہد ظفر کی شاعری پر اثر

سب سے پہلے یہ بات تحقیق طلب ہے کہ عہد ظفر کے شعراء نے کون سے اساتذہ سلف کے طرز کا تتبع کیا؟

اس ضمن مین ہم صرف اس عہد کے اساتذہ فن کے طرز کو پیش نظر رکھکر ایک صحیح نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کرینگے۔

اس مین شک نہین ذوق۔ مومن اور غالب ابتدا مین مختلف شعراء قدیم کے کلام سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ کچھ عرصے بعد انھون نے الگ الگ اپنے مخصوص رنگ اختیار کرلئے۔

شاہ نصیر کے کلام مین ناسخ کی تمام خصوصیات کثرت سے پائی جاتی ہین۔ مثلاً انکا یہ شعر خاص ناسخ کے رنگ مین ہے۔

بوسہ نہ کیونکہ شیرے میرے مزار کا — مین ہون شہید آہوے چشم نگار کا
عالم تو دیکھ بکھرے ہوے زلف یار کا — رکھتا ہے لطف ابر سے پڑنا پھوار کا

علاوہ ازین شاہ نصیر نے ناسخ کی طرح جابجا اخلاقی مضامین تمثیل کے ساتھ باندھے ہین۔ کہتے ہین

کیا کوئی سر بلند کرے دعوی عروج — سایہ ہے پائمال سدا کوہسار کا
شکل حباب حبس نفس گر کیا تو کیا — ہر دم مجھے خیال ہے دم کے شمار کا

ذوق کا ابتدائی کلام بھی ناسخ کے رنگ مین ہے مگر اسکے ساتھ ساتھ درد کا تصوف۔ میر کی سادگی۔ سودا کی شوکت اور جرأت کی شوخی بھی انکے کلام مین پائی جاتی ہے۔

ناسخ کا رنگ حسب ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

تیرے دندان مسی زیب کی دیکھی جو بہار — اوس سی پر گئی گلشن مین گل سوسن پر
تن رہا یون ہی تپ غم سے اگر گرم میرا — شیخ آہن کی طرح ہونگے بدن پر مو گرم

درد کے رنگ مین یہ شعر ملاحظہ ہو۔

دانہ خرمن ہے ہمین قطرہ ہے دریا ہمکو — آئے ہے جز و مین نظر کل کا تماشہ ہمکو

علاوہ ازین انکے کلام مین جذبات اور تاثرات کی آمیزش کافی ہے زمانہ کے ماحول۔ کثرت مشق۔ اور طبیعت کی تیزی اور طراری سے ایک خاص رنگ پیدا کرلیا جس مین زبان کی صفائی اور سلاست محاورون کی برجستگی اور افراط کا عنصر غالب ہے۔ انکی غزلیات نے عوام کے دلون پر سحر سامری کا کام کیا۔

مومن خان نے بھی ابتدا مین ناسخ کا تتبع کیا۔ چنانچہ اونکے دیوان مین اس رنگ کے کثرت سے اشعار ملتے ہین۔ مثلاً کہتے ہین۔

بن تیرے اے شمع رو آتش کدہ تن ہوگیا — شمع قد پر تیرے پروانہ برہمن ہوگیا
آخر اشکون کے بھر آنے نے ڈبویا مجھکو — چشم کا سوراخ لوکشتی کا روزن ہوگیا
نعش کا ہمدم کفن لانا کہ بس مین مرگیا — جلوون سے جلوہ خورشید سیما دیکھکر

لیکن یہ رنگ انکی افتاد طبع کے خلاف تھا۔ انکی وارفتگی اور شوخی نے انکو جرأت کی معاملہ بندی کی طرف رجوع کیا۔ لیکن اس رنگ مین جو انکا کلام موجود ہے وہ متین اور سنجیدہ ہے۔

غالب نے کن اساتذہ فن کا تتبع کیا؟

اسکا جواب وہ خود دیتے ہین۔

"اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی۔ لیکن آزادروی کے سبب زیادہ ان لوگون کی پیروی کرتا رہا ہون جو راہ صواب سے نابلد تھے۔ آخران لوگون نے جو اس راہ مین پیشرو تھے دیکھا کہ باوجودیکہ اون کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہون اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہون۔ ادنکو میرے حال پر رحم آیا اونھون نے مجھپر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزین نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجکو جتائی طالب آملی۔ اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ مجھ مین تھا اوسکو فنا کردیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تعویذ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھکو سکھایا۔"

جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہوتا ہے۔ غالب نے بھی تناسخ کے بہت سے دور کے بعد ایک خاص قالب ختیار کیا ابتدا مین بیدل کے رنگ مین اشعار کہے۔ اسکا خود اعتراف کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے  مجھے رنگ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

بعد ازین مثل دیگر اساتذہ دوران انھون نے بھی ناسخ کی روش اختیار کی۔ جیسا ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

یون بعد ضبطِ اشک پھرون گرد یار کے  پانی پیٔے کسو پہ کوئی جیسے وارکے

ظاہر ہے ہم سے کلفت بخت سیاہ روز  گویا کہ تختہ مشق ہین خطِ غبار کے

رفتہ رفتہ جب سادگی کی طرف طبیعت کا میلان ہوا۔ تو میر کا رنگ ختیار کیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خوب نبھایا۔ مثلاً

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی  اب کسی بات پر نہین آتی

میری قسمت مین غم گر اتنا تھا  دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

آخر کار غالب نے بھی اپنا ایک خاص رنگ اختیار کرلیا۔ انکا کلام بہ ظاہر جدت طرازی۔ مضمون آفرینی۔ پرواز تخیل۔ ندرت ادا۔ چستی بندش۔ اور فلسفیانہ خیالات بے مثل ہے

ظفر نے ابتدا مین جرات کے رنگ مین شعر کہنا شروع کیا۔ مگر بوجہ کہنہ مشقی۔ دیگر شعرا کی صحبت۔ اور ذاتی مصائب اپنا ایک خاص رنگ پیدا کرلیا جسمین سوز وگداز اور درد وغم کا عنصر غالب ہے۔

**عہد ظفر مین شاعری کے دو جداگانہ اسکول**

اس عہد سعید مین دہلی میں اردو شاعری کے دو جداگانہ اسکول قائم ہوگئے۔ شعرا کا ایک وہ گروہ تھا جو قدما کی روش کو تو چھوڑنا نہین چاہتا تھا مگر اسلوب بیان اور تازگی مضمون سے کلام مین ایک دلکشی پیدا کرتا تھا یہ گروہ زبان کی سلاست اور شستگی مین کوشان رہتا تھا۔ یہ شعرا اردو محاورات کے چٹخارون عام فہم تشبیہات اور استعارات سے اشعار کو پر زور کرکے عوام سے داد سخن لیتے تھے۔ مشکل بحرون اور سنگلاخ زمینون مین اشعار کہہ کر سامعین کے دلون پر اپنی قادر الکلامی کا سکہ بٹھاتے تھے۔ یہ عامیانہ شاعری سے پہلوتہی کرتے اور حقیقی جذبات اور سچے عاشقانہ تاثرات سے

سننے والون کے دل گرماتے تھے۔ یہ وہ گروہ تھا جو شیرین زبانی پر جان دیتا تھا اور پرواز تخئیل کا دامن ہاتھون سے نہ چھوڑتا تھا انھون نے قدماء کے محاسن کی سچی قدر دانی کی اور انکی کمزوریون سے واقف ہوکر اپنے کلام کو اُن سے یکسر معرا رکھنے مین ایک حد تک کامیاب رہے شاہ نصیر۔ ذوق اور ظفر اس گروہ کے سرگروہ تھے۔

دوسرا گروہ غالب کا پیرو ہے۔ غالب اردو شاعری مین ایک طرز خاص کے موجد ہین۔ انھون نے اپنے کلام مین فلسفہ کے نکات کا حل اور تصوف کے رموز کا انکشاف اس خوبی اور آزادی سے کیا ہے کہ قدماء اور متوسطین کا کلام اس سے یکسر خالی معلوم ہوتا ہے۔ انکی دقت پسند اور جدّت طراز طبیعت نے اردو شاعری کو نادر تشبیہ اور استعارہ دل آویز فارسی ترکیب اور دلچسپ بندش سے مالامال کردیا۔ مومن اور شیفتہ اس خدمت ادب مین انکے دوش بدوش ہین

عہد ظفر نے اردو شاعری کو خصوصاً اور اردو ادب کو عموماً اسقدر بلند ار فع متین اور سنجیدہ کردیا تھا کہ جسکی مثال کسی اور دور مین ملنا امر محال ہی نہین بلکہ ناممکن ہے۔ اس دور کے شعراء نے میدان شاعری مین وہ حیرت انگیز ترقی کی کہ جسکا ہر وہ شخص جو ذوق سلیم رکھتا ہے معترف ہے۔ ظفر کی فیاضانہ سرپرستی عوام کی تعجب خیز دلچسپی۔ اور شعراء روزگار کی باہمی مروت اور دوستی۔ امراء کی سخن فہمی اور سخن سنجی نے اردو شاعری کے لئے وہ قدرتی سامان پیش کردیتے تھے کہ جسکی مثال کوئی دوسرا عہد دینے سے قاصر ہے

علاوہ ازین ان دو اسکولون کی مختلف روش اختیار کرنا اور دوسرے کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنا بھی اردو شاعری کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ ہم کو متاخرین مین ایسے اساتذہ فن نظر آتے ہین جنکے کلام مین ان دو مختلف روشون کے اجتماع سے وہ قدرتی اور اصلی رنگ پیدا ہوگیا جسکی زمانہ کو ضرورت تھی۔ مثلاً۔ سالک۔ مجروح۔ حالی۔ انور۔ ظہیر۔ کے کلام مین ذوق اور ظفر کی سلاست اور فصاحت مومن اور غالب کی مضمون آفرینی پرواز تخئیل اور دیگر محاسن کلام کو یکجا پایا جاتا ہے۔

## ظفر کا اثر اردو شاعری پر

مل کے نزدیک شاعری عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے جب وہ تنہائی سے نکلکر امراء اور سلاطین کے دربار مین قدم رکھتی ہے اپنے اصلی مرکز سے دور ہوجاتی ہے۔ بالخصوص عاشقانہ شاعری پر جو تمامتر واردات قلبیہ کا مجموعہ ہوتی ہے درباری تعلقات کا سخت مضر اثر پڑتا ہے۔ اور دربارون کے مادی تکلفات اوسکی روحانی لطافت کو بالکل فنا کردیتے ہین

اگرچہ عام خیال یہ ہے کہ عاشقانہ شاعری کے لئے محاسن اخلاق سے زیادہ رندی اور اوباشی کی ضرورت ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عاشقانہ شاعری سے زیادہ کوئی چیز اوصاف حمیدہ کی محتاج نہین۔ قناعت۔ خودداری۔ بلند حوصلگی۔ فراخ مشربی۔ آزادی اور پاکیزگی غرض وہ تمام اوصاف جو ایک صوفی منش شخص کے لئے درکار ہین۔ عاشقانہ شاعری کا عنصر ہین۔ اور انہی سے وہ لطیف جذبات اور بلند خیالات پیدا ہوتے ہین جو عاشقانہ شاعری کا آب ورنگ ہین۔ لیکن جو شاعر دربار شاہی مین قدم رکھتا ہے اُسکو لازمی طور سے ان اوصاف سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے اسکی شاعری درد، جوش اور سوز وگداز سے بالکل تہی دامن ہوجاتی ہے

اگرچہ مندرجہ بالا خیالات کا اطلاق لکھنؤ کی شاعری پر پورے طور سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ اردو شاعری کی خوش قسمتی ہے

کہ جب اوس نے دہلی مین نشو ونما پائی تو آخرکار اُسکو بہادر شاہ جیسا بادشاہ مل گیا جس کے دامن تربیت مین یہ خوب پھُولی پھلی۔ بذات خود ظفر ایک درویش صفت بادشاہ ہے۔ اِنکی فقیری اور فقیر دوستی کی سینکڑون مثالین دہلی اور اکناف دہلی مین مشہور ہین۔ بہادر شاہ کا کلام ابتدا سے تصوف آمیز اور حسرت خیز ہوتا تھا جس مین سوز و گداز درد اور عبرت غالب ہے۔ یہانتک کے اُونکے شگفتہ مضامین مین بھی مایوسی اور نا امیدی کی جھلک نظر آتی ہے

ظفر کو اس بارے مین دیگر سلاطین اور امراء سے تفوق حاصل ہے کہ اوسنے شعراء عصر کو گمراہ نہین کیا۔ اور اونکو عامیانہ اور مبتذل شاعری کے قعر نکبت اور مذلت مین نہ گرنے دیا۔ بلکہ شعراء عصر کو اصناف سخن کے محاسن پر رجوع کیا۔ نہ تو دہلی مین شعراء لکھنؤ کی طرح اساتذہ فن نے اپنے معاصرین کا سوانگ بھروا کر استہزا اور تمسخر کیا اور نہ بہادر شاہ کو آصف الدولہ کی طرح ننگ زمانہ اور ننگ ادب مجادلون سے کوئی دلچسپی تھی۔ آزاد ایک مقام پر فرماتے ہین

"ایک شعر پر سید انشا اور شیخ مصحفی مین شکر رنجی ہو گئی۔ اور طبیعت کی شوخی نے زبانون کی بیباکی کے ساتھ ملکر بڑے بڑے معرکے کئے اسوقت آصف الدولہ شکار مین تھے۔ چنانچہ اونھون نے اپنے لکھنؤ نہ ہونے پر ہزارون افسوس کئے اور بڑے اشتیاق سے ہجو ون کو منگاکر سنا اور انعام بھیجے"

اس دور مین شعراء دہلی کے کلام مین جو متانت اور سنجیدگی بلند خیالی اور مضمون آفرینی پائی جاتی ہے۔ وہ لکھنؤ کے درباری اور دیگر شعراء مثلاً جرات۔ انشا۔ آتش۔ ناسخ۔ رنگین اور رند کے کلام مین نہین پائی جاتی۔ یہان ہم اس بات کو واضح کر دینا چاہتے ہین کہ ہمارا یہ مطلب نہین ہے کہ انشا، یا دیگر شعراء لکھنؤ کی شاعری یکسر متانت اور سنجیدگی۔ درد و غم کی چاشنی اور سچے جذبات اور تاثرات سے خالی ہے۔ بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ان اساتذہ فن کے کلام کا بیشتر حصہ حقیقی شاعری سے بے تعلق ہے۔ دربار لکھنؤ اور نوابان لکھنؤ کی بد مذاقی کا اثر شعراء وقت پر اچھا نہین پڑا۔ جیسا کہ آزاد سید انشاء کے بارے مین لکھتے ہین

"نواب مصطفےٰ خان کا گلشن بیخار دیکھتا ہون تو خار نہین کٹار کا زخم دل پر لگتا ہے۔ سید موصوف کے حال مین لکھتے ہین "ہیچ صنف را بطریقہ راسخہ شعر نہ گفتہ، یہ بھی کہہ سکتے ہین کہ انہون نے اس راستہ مین قدم کیون رکھا۔ جو ایسی کیچڑ مین آلودہ دامن ہوئے لیکن شہرستان تجارت کے سیر کرنے والے جانتے ہین کہ جب رواج عام کا راجہ ہولی کھیلتا ہے۔ تو بڑے معقول و وضعدار اشخاص اسکی چھینٹین فخر سمجھکر سر و دستار پر لیتے ہین۔

غرضکہ بہادر شاہ نے سلاطین لکھنؤ کی طرح شعراء وقت کو غلط راستہ پر نہین ڈالا۔ ظفر کی نکتہ شناس اور سخن فہم طبیعت اس آلودگی سے پاک رہی۔ دہلی کی علمی اور ادبی فضا فحش اور گندہ اور شہوتیانہ شاعری سے ایک حد تک پاک تھی اس عہد مین دہلی کے مشاعرونکی یہ حالت نہین تھی جسکا ذکر مصحفی اپنے اس شعر مین کرتے ہین۔

ان لوگون کی مجلس مین یہ شور نہین دیکھا
بزم شعراء ہے یہ یا مرغون کی پالی ہے

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ایسی پست شاعری کا ملزم ایک بڑی حد تک لکھنؤ کے نواب اور امراء کو قرار دیتے ہیں، ورنہ انشاء مصحفی، جرات، قتیل، ناسخ، اور آتش سے کیا کیا امیدیں تھیں جو وابستہ نہ تھیں۔

دہلی چھوڑنے سے قبل انشاء نے ایک غزل لکھی تھی جس کا مطلع تھا۔

چشم و ادا و غمزہ شوخی و ناز پانچوں	دشمن ہیں میرے جی کے بندہ نواز پانچوں

دربار سے قطع تعلق ہونے کے بعد انشاء نے وہ معرکۃ الآرا غزل لکھی جس کا مطلع تھا۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں	بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

اور یہ شعر بہت مشہور ہے۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

ایسی اکثر غزلیں انشاء کے دیوان میں ملتی ہیں۔ اسی غزل کو دیکھئے کس قدر حقیقی شاعری سے لبریز ہے۔ لیکن لکھنؤ کے زہریلے ماحول نے بھی ان کے اس رنگ کو خاک میں ملا دیا۔

**عہد ظفر میں دلی کی شاعری کا لکھنؤ کی شاعری سے موازنہ**

سب سے بڑی بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ شاعری کے اس فطری جذبے کو جس کا تعلق تہذیب اور تمدن سے اس قدر مضبوط ہے کہ جس قوم میں کوئی روشن خیال اور باریک بین شاعر نہ ہو متمدن نہیں کہی جا سکتی اسکو ضلع جگت کے ساتھ فحش اور گندے مضامین سے شعراء لکھنؤ پاک نہ رکھ سکے۔ عشق کو فسق اور آوارگی کا مترادف بنا دیا۔ قوم کا مذاق سرے سے بگڑ گیا۔ قبول عام حاصل کرنے کو جامہ عریانی حاصل کر کے بے پردہ مضامین، سوقیانہ محاورے، اور مبتذل الفاظ سے کلام کو ناپاک کر دیا۔ آزاد آب حیات میں ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

"مصحفی، جرات، میر قتیل وغیرہ شاعروں اور شعر فہموں کے جلسے رہتے تھے۔ جو محفل ایسی گلشن فصاحت سے سجائی جائے وہاں کی رنگینیاں کیا کچھ ہونگی۔ جی چاہتا ہے کہ انکی باتوں سے گلزار کھلا دوں مگر پھول ایسے فحش کے کانٹوں میں الجھے ہوئے ہیں کہ کاغذ کے پرزے ہوئے جاتے ہیں۔"

لکھنؤ کے تمدن اور معاشرت میں عام طور پر جو زنانہ رنگ پیدا ہو گیا اس کا اثر وہاں کی شاعری سے واضح طور سے نمایاں ہوتا ہے۔ اگر لکھنؤ کے دواوین کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جاوے تو ان سے عورتوں کے زیورات، پوشاک، اور سامان آرائش کی مفصل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جا بجا اس کا لہجہ بھی زنانہ ہوتا ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| رند | یہی کہہ کہہ کے رند روتا ہوں | آنکھیں پھوٹیں جگا دیا کس نے |
| " | مر گیا منتظری میں تری او وعدہ خلاف | موت آئے ملک الموت ترے آنے کو |
| " | او پری تجھ کو خدا نے دی ہے صورت نور کی | تیری ایڑی پر کروں صدقے میں چوٹی حور کی |

ہم نے جن محاورات کے اوپر خط کھینچا ہے وہ سب زنانہ محاورات ہیں۔ شعراء دہلی عورتوں کے محاورے استعمال نہیں کرتے تھے۔

اساتذہ لکھنؤ کے یہاں جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں فحش الفاظ کے انبار نظر آتے ہیں جس کی مثال دینے سے ہم ہچکچاتے ہیں۔ ان کے یہاں معاملہ بندی نے حد اعتدال سے بڑھکر بازاری روش اختیار کرلی تھی۔ برخلاف اس کے شعراء دہلی نے جب کبھی معاملہ بندی کی تہذیب اور سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مثلاً مومن کی حسب ذیل غزل پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا میرے حال پر
مجھے سب ہیں یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تمام غزل پڑھ جائیے۔ ایک شعر بھی اخلاق سے گرا ہوا نہ ملیگا۔

شعراء دہلی کے مقابلہ میں شعراء لکھنؤ کے کلام میں روحانی اور رکیک جذبات بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اس کے بجائے ان کے خیالات معشوق کے خارجی اوصاف و لوازم مثلاً کنگھی چوٹی۔ سرمہ مسی۔ اور زلف و کاکل میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔

شعراء لکھنؤ نے مراۃ النظیر اور رعایت لفظی کی بہت زیادہ رعایت کی ہے۔ برخلاف اس کے شعراء دہلی نے سلاست زبان اور مضمون آفرینی اور جذبات نگاری میں کمال پیدا کیا۔

مندرجہ بالا حصہ میں ہم "دہلی کی شاعری عہد ظفر سے قبل" ناظرین کرام کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ اس کے محاسن اور عیوب پر تنقید کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ عہد ظفر کی شاعری کا لکھنؤ کی شاعری سے اجمالاً موازنہ کر چکے ہیں۔ اب مندرجہ ذیل سطور میں دلّی کی شاعری کی ان خصوصیات کا تفصیل سے ذکر کرنا مقصود ہے جس کی وجہ سے یہ عہد ممتاز ہے۔

## زبان کی اصلاح

اس دور میں نصیر مجنوں، ذوق، ظفر۔ غالب، مومن، اور شیفتہ کا سب سے بڑا کارنامہ زبان کی اصلاح اور درستی ہے۔ جو نامانوس الفاظ دور دوم تک رہ گئے تھے انکو انہوں نے دور کرکے روزمرہ اور محاورں کے ساتھ فارسی ترکیبوں کی نہایت لطیف اور خوشنما ترکیبوں سے اردو میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کردی۔ جو دیکھنے کے قابل ہے۔

اگرچہ شاہ نصیر کی شاعری پر متوسطین کا اثر بہت غالب ہے۔ ان کے کلام میں آئیاں۔ جائیاں۔ ٹک۔ نت اور بعض جگہ اسی طرح کی اکھڑی اکھڑی بندشیں موجود ہیں۔ جو مصحفی اور انشاء کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ مگر آخر کار ان کا کلام بھی صاف ہوگیا۔

اس عہد میں ذوق اور ظفر محاورہ بندی میں تمام شعراء دہلی سے فائق ہیں۔ ذوق کی زباندانی پر کون انکار کرسکتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ذوق نے اپنی کہنہ مشقی۔ تیزی طبع اور محنت کے سبب زبان کو بمقابلہ عہد گذشتہ بہت زیادہ صاف سلیس اور پاکیزہ کیا۔ اگرچہ فارسی اور عربی الفاظ ان کے کلام میں ضرور ملتے ہیں مگر کانوں پر گراں نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ذوق نو بندی وضع

کے سخت اور کرخت الفاظ اور محاورات کی بیخ کنی کی اور اس طرح زبان کو شیریں کیا۔

ظفر بھی اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ انکی غزلیات میں سلاست اور شیرینی روانی اور فصاحت بدرجہ اتم موجود ہے۔ حالی مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں:۔

"ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے"

مومن اور غالب کے یہاں خیال آفرینی کے ساتھ فارسی ترکیبیں زیادہ داخل ہوگئی ہیں۔ اور زبان کا لطف ذوق اور ظفر کی نسبت انکے یہاں کم پایا جاتا ہے۔ تاہم ان لوگوں کے کلام میں کسو۔ کبھو۔ تیئیں۔ آن کے سمیت۔ مست آئے۔ جائیے ہے۔ دیکھیو۔ کیجیو۔ سیجیو۔ نہایت بے تکلفی سے کام میں لائے گئے ہیں۔

اس عہد میں سلاست اور صفائی زبان اسقدر مقبول عوام ہوئی کہ غالب اور مومن کے انتقال کے بعد انکی مشکل پسندی کو کسی نے فروغ نہ دیا۔ سلاست اور روانی کو زیادہ عروج ہوا۔ جیساکہ سالک۔ حالی۔ ظہیر۔ انور۔ داغ۔ اور مجروح کے کلام سے پایا جاتا ہے۔

ذیل میں نمونتاً اس دور کے شعرا کے کچھ سلیس اشعار پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ ناظرین خود اندازہ کر سکیں۔

ذوق

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
یہی ہر دم ہے زخم دل کو رونا — دہن پایا لب گویا نہ پایا
لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام — خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا — تم وقت پہ آ پہونچے نہیں ہو ہی چکا تھا
آنے سے میرے ٹھیر گئے آپ دگر نہ — جانے کا ارادہ تو کہیں ہو ہی چکا تھا

ساتھ آہ کے شب دل سے وہ پیکاں نکل آیا — تھا کام تو مشکل مگر آساں نکل آیا

یانی طبیب دیگا ہمیں کیا اچھا ہوا — ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا
ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو — سینے میں ہم نے ذوق نہ پایا بجھا ہوا

غالب

ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب — کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر　　کچھ تو پیغام زبانی اور ہے
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام　　ایک مرگ ناگہانی اور ہے

جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم　　سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا　　چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت　　میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف سے طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے　　بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

مومن

تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے　　ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس　　ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے
عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن　　آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے　　کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

شاہ نصیر

تسلی دم واپسیں ہو چکی　　ہم ہی ہو چلے جب نہیں ہو چکی
نصیر اس کج ادا کی کج ادائی کوئی جاتی ہے　　مثل مشہور ہے رسی جلی لیکن نہ بل نکلا

سر مژگاں سے وقت نالہ آنسو کو ترستے ہیں　　یہ سچ ہے جو گرجتے ہیں وہ بادل کم برستے ہیں

شیفتہ

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　ہے آگ سی جو سینہ کے اندر لگی ہوئی
یوں وفا اٹھ گئی زمانے سے　　کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں

ممنون

اس مرگ پہ سو جان مری صدقے کہ دم نزع
گھبرا کے کہے تو کہ بس اب دیکھئے کیا ہو

ظفر

ہے تو انسان خاک کا پتلا　　لیک پانی کا بلبلا دیکھا
تو نے تیری خاک پا ہم نے　　خاک میں آپ کو ملا دیکھا
اے ظفر کیا پوچھتا ہے بے گناہ و بر گناہ　　اٹھ گیا اب تو جدھر کو دست قاتل اٹھ گیا

بھڑکی ہے بے طرح یہ ظفر آج دل کی آگ
آگے تو شعلہ سا کبھی بار اٹھ کے رہ گیا

رفتہ رفتہ ہمیں ظالم روش نقش قدم
خاک میں ہے تری رفتار ملائی جاتی

اے مسیحا نفس آنے کی تری سنتے خبر
رہ گئی جاں ترے بیمار کی آتی جاتی

سر ملک دست ستم جونہی ترا قاتل بڑھا
خونِ جسمِ ناتواں تل تل گھٹا تل تل بڑھا

## استعارات اور تشبیہات کی نزاکت اور جدّت

عہد ظفر میں فارسی شاعری کا رنگ اردو شاعری پر غالب۔ مومن اور ان کے متبعین کی بدولت بہت زیادہ حاوی ہوگیا تھا۔ شعراء کی جدت طراز طبیعتیں ایسے ایسے مناسب نادر اور نازک تشبیہ اور استعارے اشعار میں اس حسن وخوبی سے استعمال کرگئے کہ آجتک زمانہ داد دے رہا ہے۔

جس طرح بعض اوقات سلاست، صفائی اور برجستگی شعر کو دلکش اور دلچسپ بنا دیتی ہے اس طرح اکثر جب تک شعر تشبیہ یا استعارے موزوں اور دیدہ زیب جامے سے مزین نہیں ہوتا۔ دیدۂ دل کو منظر حسن وخوبی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ معمولی اسلوب بیان اور سلیس زبان بسا اوقات اس روحانی کیفیت اور وجدانی لطافت اور قوت جو کہ شاعر کو مدنظر ہے، پیدا کرنے سے قطعی معذور ہے۔

علاوہ ازیں یہ ذہن نشین کرلینا بھی ضروری ہے کہ جب شاعر کو استعارہ۔ تشبیہ۔ اور تمثیل سے کام لینے کی ضرورت پڑے تو اس کو اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ تشبیہ اور استعارہ قریب الماخذ ہو تاکہ شاعر کا مطلب بعید الفہم نہ ہو جائے۔ لہذا جس چیز کے ساتھ تشبیہ دی جائے یا استعارہ کیا جائے وہ اس خاص صفت میں جس میں تشبیہ یا استعارہ مقصود ہے کمال رکھتا ہو۔ ساتھ ساتھ تشبیہ اور استعارے میں معنی آفرینی بلاغت اور اختصار کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔

ایرانی شعراء کے آخری دور میں تشبیہات کی نزاکت اور استعارات کی لطافت حد کمال کو پہونچ گئی تھی۔ عرفی۔ نظیری۔ طالب آملی۔ صائب اور قاآنی کے کلام میں ان کا چمن زار نظر آتا ہے۔ قدما نے فارسی شعراء کے کلام کو پیش نظر رکھا تھا۔ اس لئے ولی۔ میر۔ سودا کے کلام میں اس قسم کی لطیف تشبیہیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن عہد ظفر میں شعرائے دہلی نے تشبیہات اور استعارات میں اور زیادہ نزاکت وجدت پیدا کی اور ان کے انبار کے انبار لگا دئے۔ ذوق نے خیال آفرینی کے ساتھ اچھی اچھی تشبیہیں اور استعارے پیدا کئے، ان سے بہت زیادہ مومن خاں اور مرزا غالب نے اس میں کاوش کی۔ اور بہت زیادہ جدت سے کام لیا۔

اساتذہ لکھنؤ میں ناسخ کا کلام سراسر استعارات اور تشبیہات سے لبریز ہے، مگر یہ زیادہ تر مبتذل اور غیر قدرتی اس کے علاوہ ثقیل الفاظ بری طرح چسپاں کرگئے ہیں۔ اکثر فارسی اشعار کا سرقہ یا ترجمہ کرتے تھے۔ آتش کے کلام میں تشبیہ اور استعارے ذرا کم ہیں مگر جہاں جہاں زلف وکاکل کے جال سے آزاد ہو کر نظم کرگئے ہیں کمال دکھا گئے ہیں۔ شعراء لکھنؤ نے تشبیہ اور استعارے سے کلام میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر وہ حد اعتدال سے گذر گئے اور ان کی کثرت اور فراوانی نے اشعار کو گورکھ دھندا کر دیا۔ بقول آزاد "یہ رنگ اگر اس حد تک رہے جیسے چہرہ پر غازہ یا آنکھوں میں سرمہ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید ہے اور اگر حد اعتدال سے گذر جائے تو اس کی شدت سے زبان فقط خیالی باتوں سے توہمات کا سوانگ بن جاتی ہے۔"

عہدِ ظفر میں شعراء نے تشبیہ اور استعارے کے راز کو خوب اچھی طرح سمجھا اور اعتدال کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ انہوں نے صفت در صفت اور استعارے در استعارے سے کلام کو ثقیل اور بعید الفہم نہیں کیا بلکہ ان کے استعمال سے کلام کو آراستہ اور پیراستہ کیا۔ علاوہ غالب کے اس دور کے شعراء کی تشبیہات اور استعارات کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق نہیں ہیں۔

غالب کی تشبیہات اور استعارات میں جدت۔ ندرت اور پرواز تخئیل پایا جاتا ہے۔ پامال تشبیہ اور استعارے بہت کم استعمال کئے ہیں۔ حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں۔

"عام اور مبتذل تشبیہیں جو عام ریختہ گویوں کے کلام میں متداول ہیں مرزا جہاں تک ہو سکتا ہے ان تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں"

مرزا نے موئے آتش دیدہ کو زنجیر سے۔ دانہ ہائے تسبیح کو دلِ عشاق سے۔ خانۂ مجنوں کو گردِ دروازہ سے۔ بہار کو حنائے پائے بستہ سے۔ جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل سے۔ دامِ موج کو حلقۂ صد کام نہنگ سے۔ تارِ اشکِ یاس کو رشتۂ چشمِ سوزن سے۔ صبحِ وطن کو دندانِ خنداں نما سے۔ سانس کو موج سے۔ گرداب کو شعلہ جوالہ سے تشبیہیں دی ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

۱۔ ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گذارِ بادیاں
۲۔ غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

۳۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
۴۔ دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

غالب کی بعض تشبیہات میں میر کی عظمت اور سادگی بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی — دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

علاوہ اس کے جیسا کہ علامہ طباطبائی نے لکھا ہے غالب کو متحرک تشبیہات کے پیدا کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا مثلاً:-

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ — ورنہ ہے چرخ و زمیں یک ورقِ گردانده
رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے — نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

مومن نے اکثر مقامات پر تشبیہ اور استعارہ کی خوبی سے کلام حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ اور اثر کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا ہے۔ جیسے:-

کیا کیا شکن دیئے ہیں دلِ زار کو مگر — اس کے خیال درق انتخاب تھا
ہم رنگ لاغری سے ہوں گل کی شمیم کا — طوفانِ باد ہے مجھے جھونکا نسیم کا
چھوڑا نہ کچھ بھی سینہ میں طغیانی اشک نے — اپنی ہی فوج ہو گئی لشکر غنیم کا
آتش آہِ بے اثر سے مری — آسماں گلشنِ خلیل ہوا
ہر دم رہینِ کشمکش دست یار ہیں — چلمن کے تار کس کے گریباں کے تار ہیں

بعض مقامات پر مرکب اور مسلسل تشبیہات اور صائب کی طرح اخلاقی تمثیلات بھی لکھی ہیں۔ مثلاً

ہے صبر کو کہاں تپ داغ جگر سے فیض
گلچین کو کب ہوا شجر بارور سے فیض

ذوقؔ کی تشبیہات اور استعارات عموماً بمقابلہ مومنؔ اور غالبؔ سلیس۔ سادہ اور عام فہم ہیں۔ مگر اکثر جدت اور ندرت سے بھی کام لیا ہے۔ محاوروں کے ساتھ ذوقؔ کی تشبیہ اور استعارے بہت لطف دیتے ہیں اور ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً

موئے سر ہاراں سیہ کا ایک اسر لشکر ہے
مانگ جو ہے مار سفید اس لشکر کا سر لشکر ہے

دل کا یہ احوال ہے غم میں تجھے اے مست ناز
جیسے مرجھایا ہوا دانہ کوئی انگور کا

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

سینہ ہمارا داد دی وحشت سے اے جنوں
ہر داغ پر تصور چشم غزال کر

مردمک کے پاس ہے یہ اشک خونیں کا ہجوم
یاد سے یاقوت ہیں یہ دانہ نیلم کے پاس

تجھ میں سب میں ربط ہے گویا مثال رنگ و بو
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

ریش سفید شیخ میں ظلمت فریب
اس مکر چاندنی پہ نہ کر نا گمان صبح

ہر داغ معاصی میرا اس دامن تر سے
جوں حرف سر کاغذ نم اٹھ نہیں سکتا

ظفرؔ کی تشبیہات اور استعارات بھی مثل ذوقؔ کے سادہ اور دلکش ہیں مثلاً:۔

تاراج یوں کیا جو مرا ملک دل تمام
مژگاں تھی تیری یا کوئی لشکر غنیم کا

دولت سے عشق کی میرا ہر قطرہ سرشک
تکمہ ہے میری جیب میں دُرّ یتیم کا

لالہ کہسار نے جوش چراغاں کی طرح
خوب تربت پر ترے اے کوہکن کی روشنی

موئے سر میں خط فرق سیمتن کی روشنی
ابر میں ہے ایک برق شعلہ زن کی روشنی

ٹکڑے نہیں آنسوؤں میں دل کے چار پانچ
سرخاب بیٹھے پانی میں ہیں ملکے چار پانچ

نہیں ڈرتے اگر ہوں لاکھ زنداں یار زنداں سے
جنوں اب تو مثال نالۂ زنجیر ہم نکلے

جوں بوئے گل رفیق نسیم چمن ہیں ہم
اے ہمدموں وطن میں غریب الوطن ہیں ہم

دیگر شعرائے عصر نے بھی اپنے کلام تشبیہ اور استعارہ خوبی سے استعمال کئے ہیں، مثلاً:۔

زکیؔ
اپنا فسانہ موج آب گہر ہوا
دل تھام بیٹھے جوش تمنا اگر ہوا

آرزو میں بھری بے معنی
دل بغل میں ہے یا کتاب غلط

مجروحؔ
اہل نظارہ نہ کیوں ملیں فسردہ ہو کے آج
وہ تبسم کی طرح زیر لب بام نہیں

چاک ہو جائے جامۂ ہستی
نہ مدد دے جو تار بود نفس

## دل آویز فارسی ترکیبیں اور چُست بندشیں

عہدِ ظفر میں شعرائے دہلی کے کلام میں فارسی زبان کی دل آویز ترکیبوں اور چست بندشوں کی فراوانی ہے، غالب مومن اور ان کے دیگر متبعین کی وجہ سے فارسی کا رنگ اردو شاعری پر بہت حاوی ہوگیا۔ وہ الفاظ فقرے محاورے اور ترکیبیں جو اساتذۂ سلف نے استعمال نہیں کی تھیں اس عہد میں ایک امتیازی شان سے جلوہ گر ہوئیں۔ خصوصاً غالب اور مومن چونکہ فارسی کے جید عالم تھے اردو کو فارسی ترکیبوں سے ایسا مالامال کردیا کہ آج تک مشاہیر شعراء اور سخن فہم اصحاب سے خراجِ تحسین وصول کر رہے ہیں۔ لیکن یہ فارسی ترکیبیں عوام کے مذاق کے ناموافق تھیں، اس لئے پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھی گئیں۔ وہ مقبولیت جو غالب کو اس خصوصیت کی وجہ سے دورِ حاضرہ میں حاصل ہے اس کا عشرِ عشیر بھی ان کو اپنے عہد میں حاصل نہ ہوئی

اگرچہ فارسی ابتدا ہی سے اردو کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اور قدماء میں سب نے بہ اقتضائے چند فارسی الفاظ۔ محاورے اور ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ مگر جس زیادتی اور حسن و خوبی سے غالب نے فارسی الفاظ۔ اور ترکیبوں سے اپنے کلام کو آراستہ کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ غالب نے اس باب میں جس جدت اور ندرت کا ثبوت دیا ہے وہ بھی سب پر ظاہر ہے۔ ڈاکٹر بجنوری لکھتے ہیں:۔

"مرزا نے اپنے فلسفیانہ خیالات کے لئے موزوں الفاظ کی تلاش کی تو اردو کے ذخیرۂ الفاظ کو بہت محدود پایا (چنانچہ کہتے ہیں:۔ بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے) ......... مرزا نے اپنے اظہار کے لئے خود الفاظ تیار کر لئے ......... الفاظ سازی کے فن میں مرزا اجتہادِ کامل کا درجہ رکھتے ہیں"

غرضکہ فارسی تراکیب کے اختراع اور ایجاد میں شعرائے اردو سے سبقت لے گئے۔ انکی ترکیبیں ملاحظہ ہوں:۔

دامِ شنیدن۔ خمارِ رسوم۔ آتشِ خاموش۔ جوہرِ اندیشہ۔ تگ بانگ تسلی۔ خانہ زادِ زلف۔ موجِ نگاہ۔ نبضِ خس۔ خودداریِ ساحل۔ موجۂ گل۔ گذرگاہِ خیال۔ برگِ ادراک۔ طالعِ خاشاک۔ آئینۂ انتظار۔ لذتِ سنگ۔ مژگانِ تبسم۔ شہرِ آرزو۔ معاشِ جنوں۔ جنتِ نگاہ فردوسِ گوش۔ داماںِ خیال۔ کالبدِ دیوار۔ گلستانِ تسلی۔ دعوتِ مژگاں۔ محشرِ خیال۔

علاوہ ازیں غالب نے ان ترکیبوں کو اشعار میں بہت خوبصورتی سے بٹھایا ہے اور وہ وہ معانی پنہاں کئے ہیں کہ اہلِ ذوق کو وجد میں لاتی ہیں مثلاً:۔

۱۔ نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا — حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
۲۔ یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا — جادہ اجزائے عالم دشت کا شیرازہ تھا
۳۔ آتشیں پا ہوں گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا
۴۔ ہوئی جسکو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی — برنگِ لالہ جامِ بادہ بر محمل پسند آیا

چستی بندش کی مثالیں بھی دیوانِ غالب میں بکثرت ملتی ہیں اس شعر کے بارے میں

کہاں تم نے کہ کیوں غیر کے ملنے میں رسوائی — بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

علامہ طباطبائی لکھتے ہیں "بندش اس کی سحر کے مرتبہ تک پہونچ گئی ہے" غالب کی بعض غزلیں حسنِ بندش کی بہترین مثال ہیں، مثلاً

یہ غزلیں ہیں جن کے مطلع یہ ہیں :-

کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو ۔ نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے ۔ جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

مومن نے بھی عمدہ ترکیبیں استعمال کی ہیں، جو کہیں کہیں بقول آزاد اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ مومن کی مجتہدانہ اختراعوں میں ذیل کی چند بندشیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں :-

دمِ خونابہ ریز۔ خوابِ تمنا۔ خموشی اثر۔ آشوب گاہِ حشرِ غم۔ جراحت رار۔ گرم پائی برق تپاں۔ نگریزِ تکلم۔ عفریت ربا۔ آہوئے نیمخواب۔ جانِ نہفتہ راز۔ میکدہ آشام۔ قدم فرسا۔ شوق پرزہ کار۔ چشمِ ستارہ بار۔ نالہ رخنہ ساز۔

ترکیبیں نظم بھی خوب کر گئے ہیں، مثلاً :-

سب گرمیٔ نفس کی ہیں اعضا گداز یاں ۔ دیکھو نہ زندگی ہے سراپا زبانِ شمع

تشبیہہ دی تھی میں نے کہیں انگبین سے ۔ تلخا لرخیز ہے لبِ شیریں دہاں ہنوز

ذرا ہو گرمیٔ صحبت تو خاک کر دلے چرخ ۔ مرا سر در ہے گلخندۂ شرر کا سا

واں طعنہ تیر بار۔ یہاں شکوہ زخم خیز ۔ باہم ہے کس مزے کی لڑائی تمام شب

ذوق کے کلام میں فارسی ترکیبیں ملتی ہیں، مگر کم اور جدت سے خالی ہیں، دیگر شعرائے دہلی کا کلام بھی فارسی ترکیبوں کا مخزن ہے۔ مثلاً :-

ذوق ۔ ہوا پر سینہ یکسر خارزارِ دشتِ غم میرا ۔ کہ آیا یا بخونِ آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا

" ۔ میں وہ ہوں گیسوئے موجِ محیطِ عظم وحشت ۔ کرے ہے گھیرے رہے روئے زمیں کو پیچ و خم میرا

" ۔ دیکھنا زہر آب پیکانِ محبت کا اثر ۔ چشمِ افعی بن گیا روزن ہر ایک ناسور کا

" ۔ ذوق اس بحرِ جہاں میں کشتیٔ عمرِ رواں ۔ جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارہ ہو گیا

" ۔ فیضِ برہنہ پائیٔ مجنوں سے دشت میں ۔ ہر آبلہ بنے ہے دُرِ گوشِ نقشِ پا

" ۔ جوشِ مستی ہے عجب قابلِ فلک جیسے کہ نہیں ۔ بے شکستِ ایک صدائے جرس جامِ شراب

" ۔ پھرتا ہے چمن میں ہے دیوانہ پن مجھے ۔ زنجیر پا ہے موجِ نسیمِ چمن مجھے

زکی ۔ رواں تھی بزم میں فوارہ ساں موجِ رواں پر در
بہارِ موجِ مے سے اور ہی کچھ رنگ مینا تھا

" ۔ سازِ نیرنگِ فریبِ دلِ غمگیں پایا ۔ رازِ امید وفا ہم نے سراسر جانا

" ۔ خامشی سے جو زباں محرمِ دمساز نہیں ۔ دلِ سوداز دہ شورش کدۂ راز نہیں

رو کش پردۂ تمکینِ نظر کو اسباب ۔ مقصدِ شوق تنگ ظرفیٔ اعجاز نہیں

**ذکی**
مل گئی واہ ہوا بزم خموشاں محشر — کون افسوں زدہ جادوے گفتار نہیں

**مجروح**
یاد وعدہ کوئی آیا کہ یکایک تم نے — عزم جانے کا کیا برزدہ داماں ہوکر
کب شعلہ خیز نالۂ آتش فشاں نہیں — کب دجلہ ریز دیدہ دریافشاں نہیں

**قلق**
غیر نے پہلے ہی سب پردہ اٹھا رکھا ہے — تم نے کیوں رخ سے نقاب شکن آرا اٹھا
جسکا ترانہ سینہ گداز بہشت تھا — اس بزم گاہ عیش کا ماتم نشاں ہے اب
ہر کوئی خمیازہ آرا ہے فراغت ہی پہ لیلے — موج دریا اٹھتی ہے آغوش ساحل دیکھکر

## عربی فقرات کا استعمال

شعرائے دہلی کے کلام میں کہیں کہیں مثل خواجہ حافظ اور دیگر اردو شعرائے سلف کی طرح عربی فقرات بھی نظر آتے ہیں، مگر شیفتہ اور ذوق کے کلام میں یہ فقرات بہت ملتے ہیں، مثلاً۔

**شیفتہ**
یا مرسل الریاح ادھر کو بھی بھیجدے — وہ بوئے خوش کہ جیب نسیم یمن میں ہے
سو خوف کی ہو جائے مگر رند نظرباز — دل جلوہ گہ ولا تشف وشق نہیں کرتا
کیا کچھ وہاں سے منزل مقصود پاس ہے — یا ایہا الذین سکنتم علے الجبال
ہم اگلے عشق والوں کی تقلید کیوں کریں — اے خوردہ گیر نحن رجال و ہم رجال
کیا مزہ تم سے آشنائی کا — ماشر بتم مدامتہ الاخلاص
شیفتہ نے ہماری داد نہ دی — سچ ہے القاص لایحب القاص

---

**ذوق**
میری صورت کے معنی ہیں نفخت فیہ من روحی — حدوث بے ثبات اثبات کرتا ہے قدم میرا
ہم تو سنتے تھے سدا کل ممحوص باردا — ذوق ہوتا ہے وہ کیوں موتر سن بر دگرم
پڑھ کے بسم اللہ مجریہا دم سہا دلا — جوں شناور پھر ہوا ہیں دست و پا زآب میں
گر ترا نور نہیں چشم میں کیا ہے اس میں — کنہا فیہ نظر عین خطا ہے اس میں
مجھے آتا ہے رشک اس ندمے آشام پہ ساقی — نہ جو وع ما کدر جانے نہ جو خذ ما صفا سمجھے
الٰہی کس بگناہ کو مارا سمجھکے قاتل نے کشتنی ہے — کہ آج کوچہ میں اسکے شور بائی ذنب قتلتنی ہے
نفخت فیہ من روحی نے دی انسانکو عزت — نہ تھا اس خاک کے پتلے کا تو کچھ بھی وجود اول

## سنگلاخ زمینیں اور مشکل بحریں

اگرچہ شعرائے لکھنؤ نے مشکل بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں غزل گوئی کا آغاز کیا مگر شاہ نصیر کی بدولت شعرائے دلی نے ایک مدت تک اسمیں خاک بیزیاں کیں۔

شاہ صاحب نے ایک موقع پر شعرائے لکھنؤ کی فرمائش سے ایک غزل کہی جسکا مطلع تھا:۔

ہم پھڑک کر توڑتے ساری قفس کی تیلیاں　　پر نہ تھیں اے ہمصفیروں اپنے بس کی تیلیاں

جب شاہ صاحب دلی واپس آئے تو ایک مشاعرہ میں یہ غزل بھی پڑھی۔ شعرائے دلی نے بھی اس ردیف اور قافیہ میں غزلیں لکھیں کئی مہینے تک جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں یہی طرح ہوتی تھی۔ ذوق کے دیوان میں اس ردیف اور قافیہ میں غزلیں موجود ہیں اور اس طرح دیگر شعراء کے دواوین میں بھی مگر اس قافیہ پیمائی کو اہل دلی نے جس نظر سے دیکھا اس کا اندازہ صاحب تذکرہ "گلستان سخن" کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے۔

"ان عاشقان سخن کو ایسا سودا ہوا کہ زمین سخن میں مدت تک تنکے چننے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ اور کثرت خس و خاشاک کا غذ نے کوڑے کا حکم پیدا کیا۔ غالب ہے کہ اس طرح تازہ کے طفیل سے کسی شاعر کے گھر جاروب میں بھی کوئی تیلی باقی نہ رہی ہوگی" نصیر، ظفر اور ذوق کے مجموعہ کلام میں بیشتر غزلیں مشکل بحر اور سنگلاخ زمینوں میں مل سکتی ہیں مگر ان شعراء کے علاوہ غالب۔ مومن کے دیوان میں بھی غزلیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً یہ غزلیں:۔

مومن　وہ جو زندگی میں نصیب تھا دہی بعد گور با قلق　　یہ قلق ہے کیسا کہ ہے کم ہوئی جان پر نہ گیا قلق

"　ہر غنچہ لب سے عشق کا اظہار ہے غلط　　اس مبحث صحیح کی تکرار ہے غلط

غالب　پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب　　دے بط مے کو دل و دست شنا موج شراب

"　دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیمتن کے پاؤں　　رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

**مسلسل نویسی اور قطعہ گوئی**

اکثر شعرائے دلی نے مسلسل گوئی اور قطعہ نویسی پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً:۔
غالب نے ایک نہایت پر لطف قطعہ کہا ہے، کہتے ہیں:۔

منظور ہے گذارش احوال واقعی　　اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

اے دل نا عاقبت اندیش ضبط شوق کر　　کون لا سکتا ہے تاب جلوہ دیدار دوست

غالب کی یہ مسلسل غزلیں بھی بہت مشہور ہیں:۔

۱۔　پھر کچھ ایک دل کو بیقراری ہے　　سینہ جویائے زخم کاری ہے

۲۔　وہ فراق اور وہ وصال کہاں　　وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

ذوق کا یہ قطعہ جس میں شب ہجر کی کیفیت بیان کی ہے خوب ہے:۔

کہوں کیا ذوق احوال شب ہجر　　کہ ہے ایک ایک گھڑی سو سو مہینے

نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اندھیرا　　مرے بخت سیہ کی تیرگی نے

**غزل گوئی**

عہد ظفر میں شعرائے دلی نے یوں تو اصناف سخن میں سب پر طبع آزمائی کی مگر غزل گوئی پر کافی اور خاص طور سے توجہ کی۔
سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غزل گوئی میں کون سے اصول کی پابندی ضروری ہے؟

۱۔ غزل کو بے خودی و فریفتگی۔ شوق و حسرت۔ رنج و غم اور سوز و گداز کا مجموعہ ہونا چاہیئے۔

۲۔ شعر کو جذبات اور احساسات کا سچا مرقع ہونا چاہیئے۔

۳۔ زبان کا شیریں۔ صاف اور پاکیزہ ہونا ضروری ہے۔

۴۔ فحش گوئی اور محبت کے راز و نیاز کی رسوائی نازیبا ہے۔

ان قائم کردہ اصول غزل گوئی میں سے نمبر ۲ اور ۴ پر ہم پیچھے کافی تبصرہ کر چکے ہیں۔ اور یہ بتا چکے ہیں کہ دلی ان اصولوں کی کہاں تک پابند رہی، اب ہم کو باقی ماندہ اصول پر بحث کا آغاز کرنا مقصود ہے۔

**جذبات نگاری** ناقدان فن کے نزدیک شاعری کے دو رخ ہیں اول خارجی اور دوم داخلی۔ خارجی شاعری میں معشوق کے خد و خال نمایاں کئے جاتے ہیں اور شاعر صرف نمایاں چیزوں کی تصویر کھینچتا ہے اور جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں اساتذہ لکھنؤ نے غزل کو خارجی اوصاف سے روشناس کیا اور اس طرف اپنی توجہ مبذول کی۔

شاعری کا دوسرا رخ داخلی ہے۔ جس میں شاعر کا کلام اس کے اندرونی کیفیات اور جذبات سے لبریز ہوتا ہے اور قدماء کے کلام کا امتیازی وصف یہی ہے کہ اونھوں نے شاعری کے دونوں حصوں کو جدا جدا رکھا۔ یعنی قصاید میں ممدوح کی خارجی اوصاف کی نمائش کی اور غزل کو تمام تر کیفیات اور جذبات سے لبریز کر دیا۔

عہد ظفر میں اساتذہ دلی نے ایک بڑی حد تک قدماء کی اس تقسیم اور روش کو قائم رکھا۔ انکی بیشتر غزلیں جذبات کی وجدانی کیفیات سے معمور ہیں اور حالات عاشقانہ اور درد سے لبریز ہیں یہ شعراء عشق و محبت کے سچے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے رہے۔ یہاں ضرورت ہے کہ کچھ اشعار ناظرین کرام کے سامنے نمونۃً پیش کئے جائیں۔ غالب اور مومن کے تو دیوان ایسے اشعار سے بھرے ہوئے ہیں جو سچے جذبات اور احساسات کا مرقع ہیں، مثلاً :-

| | | |
|---|---|---|
| غالب | قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں | میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں |
| ” | نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں | جس کے شانے پر تیری زلفیں پریشاں ہوگئیں |
| ” | رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو | ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے |
| ” | ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد | یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے |
| ” | کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ | ہے یوں کہ مجھے درد تہ جام بہت ہے |
| ” | ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق | وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے |
| ” | قسمت ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو | کاش کے تم میرے لئے ہوتے |
| ” | نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو | یہ لوگ کیوں میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں |
| مومن | تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے | ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے |

| | | |
|---|---|---|
| مومن | بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں | کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے |
| " | تم میرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا |
| " | ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم | منھ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم |
| " | یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا | میں الزام اسکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا |
| " | اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا ذلیل | میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا |
| " | کچھ جی گرا پڑے تھا پر اب تونے ناز سے | مجھ کو گرا دیا تو میرا جی سنبھل گیا |
| " | پامال ایک نظر میں قرار و ثبات ہے | اس کا نہ دیکھنا نظر التفات ہے |
| ذوق | آنا تو خفا آنا جانا تو رلا جانا | آنا ہے تو کیا آنا جانا ہو تو کیا جانا |
| " | ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار | پر امید وصل میں برسوں گوارا ہو گیا |
| " | یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں | واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں |
| " | کنج تنہائی میں دیتا ہوں دلاسے کیا کیا | دل بیتاب کو میں اور دل بیتاب مجھے |
| " | عمر خضر بھی ہو تو ہو معلوم وقت مرگ | ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے |
| " | اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے | مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے |
| ظفر | جگر پر داغ لب پر دود دل اور اشک دامن میں | تری محفل سے ہم مانند شمع صبح دم نکلے |
| " | نہیں معلوم ظفر اس سے ہوئیں باتیں کیا | چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو |
| " | یہ کیا ستم ہے ہم کہیں رو رو کے اپنا حال | منھ اپنا پھیر پھیر کے وہ بے وفا ہنسے |
| " | ضبط فریاد کروں گریہ کو روکوں لیکن | دل بیتاب کو تھاموں یہ نہیں ہو سکتا |
| " | برسوں گذرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد | اب تو اس کوچہ میں لے باد سحر خاک نہیں |
| " | اُسے کیا کام تھا وہ بے خبر کیوں پوچھتا پھرتا | دل گم گشتہ کی اپنی خبر لیتے تو ہم لیتے |
| زکی | کہنے سے قبل چہرے کا رنگ اڑ گیا یہاں | سننے سے پہلے سمجھے وہ حال اضطراب کا |
| " | سو رنج و سو الم ہیں یہاں ہر نفس کے ساتھ | دم کا نہیں شمار تو غم کا حساب کیا |
| " | کافی ہے بزم غیر میں مجھ پر نگاہ لطف | ہاں نزع میں ہے پرسش بیمار دیکھنا |
| " | کیا اعتماد ہے نگہ ناز پر ادو نہیں | برہم ہیں اور ہاتھ میں خنجر نہیں ہنوز |
| " | بڑھا ذوق اسیری جب انہوں نے | کسا کمند و کہ یہ اب سے رہا ہے |
| مجروح | محفل طرازیاں وہ کہاں اب تو کام ہے | گھر میں پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا |

مجروح — سب باتیں نہیں کی ہیں یہ سچ بولیو قاصد — کچھ اپنی طرف سے تو تصرف نہیں کرتا

شیفتہ — روز غم میں کیا قیامت ہے شب عشرت کی یاد — اشک خوں سے آگئیں رنگینیاں صحبت کی یاد

" — ناصح جو کام ترکِ وفا سے لیا تو کیا — جو بات عیب کی ہے وہ ہرگز ہنر نہ ہو

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ — اک آگ ہے جو سینہ کے اندر لگی ہوئی

ممنون — آپ کو خاک کیا خاک کو برباد کیا — کوششیں کی ہیں دم مشق فنا کیا کیا کچھ

" — یہ بھی ظلم تو کہ لئے جور ناگہانی — ادل کرے مجھ کو وہ خوگر کرم کے ساتھ

انور — دل ہی کو بہلاتے ہیں تیری یاد میں ہم لوگ — اور دل کو تری یاد بہلانے نہیں دیتی

تزئین کچھ اور کہتی ہے دیکھو تو آئینہ — میں کیا کہ آج اپنے سے تم بدگماں ہو آج

شعرائے دہلی تمکین و وقار غیرت اور حمیت عجز و انکسار کے علاوہ عشق کی حرمت اور عزت کا بھی کافی خیال رکھتے ہیں۔ انکے کلام میں بہت کم اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے "بازاریت" ظاہر ہوتی ہے، شعرائے دہلی نے اصول تغزل کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کے اشعار ظریفانہ خیالات سے بھی خالی نہیں۔ ان کے یاں عاشق اور معشوق دونوں اپنی آن بان کے ساتھ قایم ہیں۔ مثلاً

غالب — واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائیں کیوں

" — نکالا چاہتا ہے کام تو طعنوں سے اے غالب — ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

مومن — معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری — واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

ذوق — ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے — اور اسپر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

ظفر — تم سے الفت نباہتا ہوں میں — باوفا ہوں کہ بے وفا کچھ ہوں

" — تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں — ہم نے تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا

باوجود اس کے شعرائے دہلی ایسے اشعار بھی کہہ گئے ہیں جن سے ان کے معشوق کا شمار بھی "شاہدان بازاری" میں کیا جاسکتا ہے مثلاً:-

غالب — غیر کو یارب وہ کیوں کر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

" — میں نے کہا کہ بزم ناز غیر سے چاہئے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجکو اٹھا دیا کہ یوں

ذوق — ہزار وہم ہیں اسے یاد تو نے دیکھا ذوق — گیا وہ غیر کے گھر تجھ کو ٹال کر کیا

ظفر — میں نے جانا تھا کرینگے غیر کو وہ تلخ کام — کیا خبر تھی غیر مجھ پر زہر کھاتے آئیں گے

" — غیر کی صحبت کا تم کو بھی ہوا آخر اثر — حاسد و قاتل میرے اب تم بھی پیارے بن گئے

ظفر　معلوم نہیں ہم سے حجاب ان کو ہے کیسا　اوروں سے تو وہ شرم و حیا کچھ نہیں کرتے

مومن　عاشق ہوئے ہیں آپ کہیں گو اسی پہ ہوں　شب حالِ غیر مجھ سے زیادہ خراب تھا

## خمریات

"عربی شعراء میں اخطل اور ابونواس اور ایرانی شعراء میں خیام اور حافظ نے اس صنف کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ قدماء میں دور تغزل کے بعد جب معاملہ بندی کے ساتھ رندی اور ہوسناکی کا دور شروع ہوا تو آتش اور تلامذۂ آتش نے اس قسم کے خیالات کو زیادہ شوخ کیا۔ غالب عملاً شراب نوشی کا شوق رکھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بھی اس صنف میں نہایت مستانہ اور پر جوش اشعار کہے۔"

جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس صنف میں آتش اور تلامذۂ آتش نے شعر گوئی کی ابتدا کی۔ لیکن قدماء کے کلام میں بھی اس قسم کے اکثر اشعار ملتے ہیں۔ عہد ظفر میں شعراء دہلی نے اس صنف میں نہایت پر جوش اشعار کہے۔ مگر غالب نے حافظ کی طرح اپنے اشعار میں اپنی مخصوص فلسفہ طرازی بھی کی ہے۔ علاوہ ازیں غالب نے اس صنف میں رندانہ خیالات کا بہت جوش اور خروش سے اظہار کیا ہے۔ اور اس لحاظ سے غالب اردو شاعری کے حافظ ہیں۔ غالب کے علاوہ دیگر شعرائے دہلی نے بھی اس صنف سخن میں اشعار کہے ہیں مگر بہت کم اور وہ اس درجہ کو نہیں پہونچتے ہیں۔

غالب　پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

〃　رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم　دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

〃　وہ چیز جس کے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز　سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

〃　بہت سہی غم گیتی شراب کیا کم ہے　غلام ساقی کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

ذوق　زہر آب با شراب یہاں سب ہے نوش جاں　ساقی پیالہ منھ سے ہم اب تو لگا چکے

〃　زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں　کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہ گیا

〃　مجھے آتا ہے رشک اس رند مے آشام پر ساقی　نہ جو دُرد ماکدر سمجھے نہ جو خمِ ما صفا سمجھے

〃　پی بھی جا ذوق نہ کر پیش و پس جام شراب　لب پہ توبہ ترے دل میں ہوس جام شراب

〃　دست بدمست سے کی ٹوٹ کے فریاد بہت　نہ ہوا کوئی بھی فریاد رس جام شراب

ظفر　میکدہ بھی مدرسہ مجکو ساقی ہے تحصیل کا شوق　جام پیالے میرے حق میں شرح جامی ہے

ذوق　کیا ہو دے گا دو چار قدح سے مجھے ساقی　میں لوں گا ترے سر کی قسم اور زیادہ

مومن　وہ رند خم کدہ کش ہوں کہ زہر دیتے ہیں　بہ تنگ آئے حریفان بادہ خوار مجھے

〃　حوض میخانہ پیے سے بھی مرا جی نہ بھرا　کیا تنگ ظرف ہیں جو خم سے سبو بھرتے ہیں

## فلسفیانہ شاعری

اردو شاعری ابتدا سے شعراء کرام نے اکثر اپنے خیالات میں فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس عہد میں دلی

کے شعرار کے کلام میں جا بجا ایسے اشعار نظر آتے ہیں جو فلسفیانہ خیالات کے حامل ہیں خصوصاً غالب نے اس صنف میں ایک امتیازی حیثیت پیدا کر لی ہے۔

غالب عالم حقیقت کی اس طرح شرح کرتے ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد     عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور     جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے
عالم غبار وحشت مجنوں ہے سربسر     کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

غالب کے نزدیک دنیا کی تمام رونق پست ہمت اشخاص سے ہے چنانچہ کہتے ہیں:۔

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے     بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

غالب رسم و رواج کی پابندی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ وہ یہ کہکر:۔

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں     پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

طبقۂ خاص کو طعنہ دیتے ہیں۔

غالب عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کو پسند کرتے ہیں۔ اور اس خیال کو کہ "ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را" کو یوں بیان فرماتے ہیں

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں     گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

موت اور زیست کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اسکو ذوق نے کس خوبصورتی کے ساتھ اس شعر میں بیان کیا ہے:۔

ہے مقام زندگی زیر دم شمشیر مرگ     ہو گیا جس طرح کوئی دم گذارا ہو گیا

ذوق نے انسان کی فطرت کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انساں     ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

موت جو عدم و وجود میں حائل ہے اس کا اثر تمام کائنات پر اسقدر گہرا ہے کہ جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا:۔

یہ حیات چندروزہ جو نہ سد راہ ہوتی     تو پھر ایک عرصہ گاہ عدم و وجود ہوتا

اس طور کے فلسفیانہ اشعار اور بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ مثلاً:۔

ذوق     ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں     جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا
"     منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے     گر نہیں آکے خدا ساری خدائی دیتا
"     یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے     زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے
ثبات کب ہے زمانہ کے عز و شاں کیلئے     کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کیلئے
کہاں خلقت عزیزو زیر چرخ پیر پھرتی ہے     یہ فانوس خیالی میں ہر اک تصویر پھرتی ہے

ظفر — آمد و شد سے نفس کی ہمیں معلوم ہوا — یعنی موجود ہو ہستی عدم ساتھ کے ساتھ

〃 — آواز طرب گوش دل محو فنا سے — جز نالہ و فریاد بجز آہ و فغاں ہیچ

〃 — پایا نہ بجز داغ سیہ کاری اک عمر — نقش قدم قافلہ عمر رواں ہیچ

ذکی — ہستی یکدم پہ اپنی تو جو ہنستا ہے شرر — تیری اس غفلت پہ ہنستی تیری ہستی اور ہے

〃 — دل سے جو موج اوٹھی اس سے کام کچھ ہم نے لیا — چین پیشانی بنایا یا خم ابرو کیا

〃 — تفرقہ کے لئے لازم ہوں میں — میں برا ہوں تو ہے اچھا کوئی

قلق — ہر ذرہ کو ایجاد سے تیری حرکت ہے — موجود ہوئے دہر میں کب ارض و سما آپ

〃 — عالم مگر فریب کے اندر فریب ہے — ہر تشنہ غرق آب ہے موج سراب میں

**صوفیانہ شاعری** | اردو شاعری میں ابتدا ہی سے صوفیانہ خیالات کی آمیزش تھی رفتہ رفتہ اسکو بہت زیادہ ترقی ہوئی متعدد شعرائے کرام نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی۔ مثلاً خواجہ حسن، کلیم، میر فضل علی شاہ دانا، میر فرحت اللہ فرحت۔ جب اردو شاعری مقبول عوام ہوئی تو خواجہ میر درد نے اردو زبان کو صوفیانہ خیالات سے آشنا کیا، خود فخریہ فرماتے ہیں:-

پھوٹے گی اس زبان میں گلزار معرفت — یاں میں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا

میر سودا، راسخ اور میر حسن کے دیوان بھی صوفیانہ خیالات سے لبریز ہیں۔

عہد ظفر میں بھی شعراء صوفیانہ شاعری کیطرف رجوع ہوئے اور قریب قریب تمام شعراء وقت کے کلام میں تصوف آمیز اشعار کثرت سے ملتے ہیں، غالب، ظفر، شیفتہ اس بادۂ حقیقت سے مخمور ہیں۔ غالب کے بارے میں حالی کی رائے ہے کہ متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے معاصرین میں بلکہ بارھویں صدی کے شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا۔

شیفتہ — یاں خار و خس کو بے ادبی سے نہ دیکھنا — ہاں عالم شہود ہے آئینہ ذات کا

〃 — سب اسمیں محو اور وہ سب سے علیحدہ — آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

〃 — فیض حق عام ہے افسردہ دل زار نہ ہو — دشت کیا جلوہ گہ لالۂ شاداب نہیں

〃 — فانوس شیشہ لگن زر سے کیا حصول — وہ ہے وہاں جہاں نہیں روغن چراغ میں

غالب — تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

〃 — طاعت میں تا رہے نہ مے انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

〃 — شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں — جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

〃 — لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

ظفر — ظاہر ہیں کیا ظہور کے مظہر نئے نئے — جلوہ ہیں اس کے پردے کے اندر نئے نئے

〃 — شراب عشق سے کیفیت بقائے ابد — وہ دیکھتے ہیں جو یاں فنا سمجھ کے پئے

ظفر — توبہ اے ساقی نہیں پینے کا میں جام شراب — مجکو اپنی بادۂ وحدت کی مستی خوب ہے
" — نہیں موقوف شیخ و برہمن پر دیر و کعبہ پر — ہر اک سو جلوہ گر ہے حق جدھر چاہو ادھر دیکھو

حیات و ممات کے کیا لاجواب اور صوفیانہ وجوہات بتاتے ہیں:۔

خواب عدم سے چونکے ہیں مشتاق ہم ترے — دیکھا نہ تجھکو اور اسی حسرت میں سو گئے
دیا اپنی خودی کو جو ہمنے اٹھا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا — رہے پردے میں اب وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اسکے سوا نہ رہا

فارسی کا ایک مشہور شعر ہے:۔ برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار + ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار۔ ظفر نے اسی خیال کو کس اچھی طرح واضح کیا ہے:۔

ظفر — سب رنگ میں اس گل کی مرے شان ہے موجود — غافل تو ذرا دیکھ وہ ہر آن ہے موجود
تم چشم حقیقت سے اگر آپ کو دیکھو — آئینہ حق میں دل انسان ہے موجود
ذوق — بشر جو تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اسکی فروتنی ہے — وگرنہ قندیل عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے
" — اوسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
" — کشتی سوار عمر ہیں بحر فنا میں ہم — جس دم بہا کے لیگیا طوفان بہ گیا
" — جلوہ ہو کیونکہ خاک پہ تاب عتاب کا — جلتا نہیں ہے برق سے دامن سحاب کا
" — جسے کہتے ہیں بحر عشق اسکے دو کنارے ہیں — ازل نام اس کنارے کا ابد نام اس کنارے کا
" — نہیں گوش شنوا باغ جہاں میں غافل — ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا
" — جو ہیں مرتے حسن صفات میں وہ رہینگے اپنی ہی بات میں — تو فنا ہو ذوق اسی ذات میں جو ہے ذات جملہ صفات ہو
زکی — راہ فنا میں آکے پر و بال شوق کھول — غافل پڑا ہے کشمکش جان و تن میں کیا
مجروح — ہے تو یہ سیدھی منزل مقصود — سنگ رہ ہیں یہ سبحہ و زنار
" — حصر ہے ظرف کی مقدار پہ بیشی و کمی — ہر عنایات فغاں سے کوئی ناکام نہیں
قلق — دیار یار کا شاید سراغ لگ جاتا — جدا جو جادۂ مقصود سے سفر ہوتا

## اخلاقی شاعری

اساتذہ سلف نے جا بجا اخلاقی مسائل کو مثلاً ترک دنیا قناعت توکل۔ تواضع۔ خاکساری۔ عفو۔ رحم۔ جود و سخا وغیرہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ ادا کئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے فارسی شعراء کا تتبع کیا ہے، بہادر شاہ ظفر کے عہد میں شعراء نے اخلاقی مسائل کیطرف کافی توجہ کی۔ شاہ نصیر۔ ذوق اور خود ظفر نے اخلاقی مضامین پر کافی روشنی ڈالی۔ غالب کے بھی وہ اخلاقی اشعار جو دقیق فارسی ترکیبوں اور جدید تشبیہوں کے جکڑ بند سے آزاد ہیں وہ بھی کافی موثر ہیں۔

ظفر — نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر — پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
ظفر آدمی اسکو نہ جانئیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا — جسے عیش میں یاد خدا نہ رہے جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

| | | |
|---|---|---|
| ظفر | غافلو اس اپنی ہستی پر کہ ہے نقش بر آب | موج کی مانند کیوں پھرتے ہو بل کھاتے ہوئے |
| " | راہ بہتر ہے رہ ہموار رہرو کے لئے | نہ بلندی ہے بہت اچھی نہ پستی خوب ہے |
| " | غنچہ کی مٹھی میں زر ہے پر نہیں دست کرم | تنگیٔ دل اور ہے اور تنگ دستی اور ہے |
| ذوق | کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا | جو آپ ہی مر رہا ہو اسکو گر مارا تو کیا مارا |

یہ تمام غزل اخلاقی اشعار سے پر ہے اس کے علاوہ اور بھی اشعار پائے جاتے ہیں مثلاً :-

| | | |
|---|---|---|
| ذوق | ہے پاک دامنوں کو خلشگر سے کیا خطر | کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار سے |
| " | اے ذوق ہوش گر ہے تو دنیا سے دور بھاگ | اس میکدہ میں کام نہیں ہوشیار کا |
| " | نہ پکڑیں دامن الیاس گرداب بلا میں ہم | کہ بدتر ڈوب مرنے سے یہاں جینا سہارے کا |
| " | حق نے تجھکو ایک زباں دی اور کان دو | اس کے یہ معنی کہے ایک اور سنے انسان دو |
| " | دیتے ہیں ثمر شاخ ثمر ور کو جھکا کر !! | جھکتے ہیں سخی وقت کرم اور زیادہ ! |
| " | خاکساری ہے عجب وصف کہ جوں جوں ہو سوا | ہو صفا اور دل اہل صفا یاد رہے ! |
| " | پھرتا ہے سیل حوادث سے کوئی مردوں کا منھ | شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں |
| غالب | آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلے نہیں | ایرا ہی دے کے ہمنے بچایا ہے کشت کو |
| " | دونو جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا | یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں |
| " | ہنگامہ زبونیٔ ہمت ہے انفعال | حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہو |
| " | نہ سنو گر برا کہے کوئی !!!! | نہ کہو گر برا کہے کوئی !!!! |
| " | روک لو گر غلط چلے کوئی | بخش دو گر خطا کرے کوئی |

## ندرت اسلوب بیان ذو معنی اشعار

غالب اور مومن کو ذو معنی اشعار کہنے میں خاص ملکہ تھا۔ ان کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے یہاں کم دیکھی جاتی ہے۔ اسکا کلام ایسا پہلودار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنے مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنیکے بعد ایک دوسرے ہی لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں، جسکی وجہ سے انکا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے۔ مثلاً

| | | |
|---|---|---|
| غالب | کوئی ویرانی سی ویرانی ہے !! | دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا ! |
| غالب | کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق | ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد |
| " | الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ | جو تم سے شہر میں ہوں دو چار ہوں تو کیونکر ہو |
| " | زندگی میں وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے | دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے |
| مومن | درد ہو جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری | چارہ گر ہم نہیں ہونیکے جو درماں ہوگا |

دیکھا اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا
مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

مومن اور غالب کے طرز ادا میں ایک خاص بات اور ہے اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والا کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں اگر اعتدال ہو جائے تو شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے:-

مومن
ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

"
اے روز حشر کچھ شب ہجراں بھی کم نہیں
بدنام ہو جہان میں تیری بلا عبث

"
ناصح کہاں تلک تیری باتیں اٹھا سکوں
سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں

غالب
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

"
گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

"
تجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی میرے خدا نے میری بیکسی کی شرم

"
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

"
رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

ذوق
ہاں تامل دم ناوک فگنی خوب نہیں
ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

ذکر کچھ چاک جگر سینے کا سن سن اپنے
کرکے میں ضبط ہنسی دیکھوں ہوں ناخن اپنے

تھا ذوق پہلے دلی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہ گیا

ندرت اسلوب کے تحت میں ایک نہایت ہی اہم نکتہ قابل گذارش ہے یعنی مومن کے کلام میں ایک خاص وصف ہے جسمیں کوئی استاد اس سے بہتر تو در کنار انکی ہمسری سے بھی عاجز ہے، مومن معاملہ بندی کے تحت میں اپنا مطلب اس طرح ادا کرتے ہیں کہ مخاطب اسمیں اپنا فائدہ تصور کرتا ہے۔ اگر مومن کا دل یہ چاہتا ہو کہ ان کا معشوق رقیب کی طرف نہ دیکھے اگر سیدھی طور منع کریں تو بیچارہ کی سنے کون لہذا اسطور سے کہتے ہیں کہ معشوق پر انکا جادو چل جاتا ہے۔

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

اس طرح کے متعدد اشعار ان کے کلام میں ملتے ہیں، مثلاً:-

سرمگیں آنکھوں میں تم سرمہ لگاتے کیوں ہو
خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

دربان کو آنے دینے میں میرے نہ کیجئے قتل
ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

"قدما اردو روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے، برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیب بیان میں نئے نئے تعجب انگیز لطیفے اور پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمال شاعری سمجھتے تھے۔ اور زبان کی صفائی

اور روز مرہ کی نشست کو محض خیالات کے ظاہر کرنے کا آلہ (نہ کہ مقصود شاعری) تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں، بھائی شاعری مضمون آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں"۔ (منقول از یادگار غالب)

القصہ ایسے اشعار جو مضمون آفرینی میں کمال کو پہونچے ہوئے ہیں۔ مومن۔ غالب۔ ذوق اور ظفر کے کلام میں متعدد پائے جاتے ہیں۔

**سہرا** سہرا گوئی عہد ظفر کی ایجاد ہے۔ اس عہد سے قبل کسی شاعر کے دیوان میں سہرا نظر نہیں آتا۔ سہرا اردو شاعری کی خاص چیز ہے۔ ذوق اور غالب نے حریفانہ حیثیت سے جو سہرے کہے ہیں انکو ایک سخن گسترانہ بات نے ایک تاریخی اہمیت دیدی۔ مولانا طباطبائی اور امداد امام اثر نے "کاشف الحقایق" میں ان دونوں سہروں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ذوق کے سہرے میں معمولی مضامین کو شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ اس طور پر موزوں کیا گیا ہے کہ ہر خاص و عام کو پسند آتا ہی برخلاف اسکے "غالب کا سہرا انکے مذاق غزلگوئی کا رنگ رکھتا ہے۔ الفاظ کی بندش کا انداز بھی وہی ہے، جو انکی غزلگوئی میں اکثر قایم رہتا ہے مثلاً حسن دل افروز۔ طرف کلاہ۔ رگ ابر گہر بار۔ باب گراں باری گوہر۔ اسلئے انکا سہرا، سہرے کے اقتضاء سے متعلق نہیں"۔

**قصیدہ گوئی** قصیدہ گوئی کا آغاز اردو شاعری میں قدماء کے ابتدائی دور میں ہو چکا تھا۔ لیکن قدماء کے دوسرے دور میں سودا نے قصیدہ گوئی میں خاص شہرت حاصل کی۔ سودا نے ایرانی شعراء کے قصیدوں پر قصیدے لکھے اور قصیدہ گوئی کے تمام اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ وہ تمام خوبیاں ان قصیدوں میں پائی جاتی ہیں جن کا التزام قصیدے میں ہونا ضروری ہے لیکن باوجود اسکے سودا کے قصائد میں اکثر کچھ کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً مبالغہ، غلو اور اغراق کے علاوہ ابتذال فحاشی اور بیحیائی بھی پائی جاتی ہے مثلاً:۔

گوبر کرے اس آن میں رستم کا گا دُمسہ — بیت الخلا کو یاد کرے سام بار بار

علاوہ ازیں اکثر بجائے واقعہ نگاری کے سودا نے تخئیل پر قصیدہ کی بنا رکھی ہے۔ مثلاً

قول پران کے تری ہمت جود کیسل — پوچھتا میں حکما سے ہے خلا کیونکر محال

ہاتھ تیرے کا اگر عکس پڑے دریا پر — در مکنون سے ہو مشت صدف مالا مال

عہد ظفر میں شعرائے دلی نے قصیدہ گوئی میں ایک امتیازی حیثیت پیدا کی۔ غالب۔ مومن۔ ذوق اور ممنون نے بہت برجستہ اور پرشوکت قصیدے کہے زبان کی صفائی۔ الفاظ کی شوکت اور نیچرل سادگی انہیں بدرجہ کمال ہے۔

ذوق کے قصیدوں میں آمد۔ روانی۔ سلاست، برجستگی اور متانت کے علاوہ سادگی زبان شیرینی اور الفاظ کی شان شوکت ترکیبوں کی دل آویزی اور بندش کی چستی نے ایک خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔ مثلاً یہ قصیدہ پڑھیئے

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر — عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

ذوق کے اکثر قصائد مشکل زمینوں میں بھی ہیں مثلاً یہ قصیدہ:۔

ہے آج جو یوں خوشنما نور سحر رنگ شفق — پرتو ہی کس خورشید کا نور سحر رنگ شفق

یا یہ قصیدہ:۔

ہیں مری آنکھ میں اشکوں کا تماشہ گوہر — ایک گھر دیکھو تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

موج گوہر میں کبھی ہے طرز تبسم پیدا — کوئی دم میں روش غنچہ ہنسے گا گوہر
رخ گلرنگ پہ ساقی کے عرق کا قطرہ — کیا تماشہ ہے کہ بن جاتے ہیں مونگا گوہر
قطرۂ آب لطافت سے ہے پڑکا پڑنا — گوش خوبان سمنبر میں مصفا گوہر
مدح حاضر میں کروں ہیں کوئی مطلع تحریر — آج ہے خامہ مرا منھ سے اگلتا گوہر
آج وہ دن ہے کہ لائے خسروا لاگوہر — کوہ دے نذر تجھے لعل تو دریا گوہر
صبح اقبال سعادت کا ستارہ چمکا — جو ترا طرۂ دستار کا چمکا گوہر  (کچھ اشعار چھوڑ دیئے ہیں)
عکس سے تیرا قبال کے دریا سے ترے — ق۔ اے محیط کرم و جود کے یکتا گوہر
آب گوہر ہو تو آب یہ اعجاز نما تر — کف دریا کو بنائے ید بیضا گوہر

ذوق کا یہ قصیدہ جو اکبر شاہ کی مدح میں ہے قابل تعریف ہے، تشبیب ملاحظہ کیجئے۔

سحر جو گھر میں بشکل آئینہ تھا میں بیٹھا زار و حیراں — تو ایک پری چہرہ حور طلعت بشکل بلقیس و ماہ کنعاں
پری کی صورت چمن کی نگہت گر اسکا شیوہ تو اسکا جلوہ — زبان شیریں بیان رنگیں کلام رنداں خرام مستاں

اس تشبیب کے اور گریز کے بعد دوسری بحر میں مدح اس طرح کرتے ہیں:۔ (اس قصیدہ میں قاآنی کیطرح ترنم پایا جاتا ہے)

شہنشاہ تیرے سر پہ دوراں ہے چتر بن کے ہوتا قرباں — کہ ہفت اختر بہ ہفت کشور ہیں آج یکسر مطیع و فرماں

آزاد ہی کے آگے اظہار ذوق کے قصائد کے بارے میں اس طرح کرتے ہیں "اردو نظم کی نقاشی میں مرزائے موصوف (سودا) نے قصیدے پر دستکاری کا حق ادا کردیا انکے بعد شیخ مرحوم (ذوق) کے سوا کسی اسیر قلم نہیں اٹھایا اور ہکو اس فقرہ سے اختلاف ہے غالب اور مومن کے دو ایک قصائد بھی اردو قصائد کی جان ہیں اور انہوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہونچا۔ انوری۔ ظہیر۔ ظہوری۔ نظیری۔ عرفی۔ فارسی کے آسمان پر بجلی ہوکر چمکتے ہیں لیکن انکے قصیدوں نے ہند کی زمین کو آسمان کردیا"۔ جب بہادر شاہ بادشاہ ہوئے تو ذوق نے یہ قصیدہ گزرانا:۔

روکش تیرے رخ سے کیا نور سحر رنگ شفق — ہے ذرہ ترا پر توئے نور سحر رنگ شفق

اس قصیدے کی فصاحت۔ بلاغت۔ پرواز تخیل۔ شوکت الفاظ۔ نزاکت خیال قابل داد ہے۔ مصنف صنمخانہ جاوید کی رائے ہے کہ "ذوق نے قصیدے بھی بڑی شان اور آن بان سے کہے اور مسلم الثبوت استادی کا سکہ تمام معاصرین کے دلوں پر بٹھادیا سوائے میر و حسنوں کے انکے معاصرین یا متقدمین میں کسی نے اس زور شان و شوکت کے قصائد نہیں کہے"۔ ذوق کا یہ دعائیہ مسدس بھی قابل تعریف ہے:۔

سریر آرائے گردوں جب تلک سلطان قادر ہو — قمر دستور اعظم صدر اعلیٰ سعد اکبر ہو
عطارد میر منشی زہرہ ناظر آسماں پر ہو — زحل میر عمارت ترک گردوں میر لشکر ہو
سر ہفت آسماں جبتک کہ دور ہفت اختر ہو — الٰہی یہ بہادر شاہ شاہ ہفت کشور ہو

شفق گلگونہ ہو جب تک سحر کے روئے نیکو کو — کرے آراستہ تا شام اپنے موئے گیسو کو

ثریا نورتن تا کہکشاں کے ہووے بازو کو — کرے وسمہ سے تا قوس قزح سبز اپنے ابرو کو

لب بانخوردہ دشمن کے ہووے تیرا خنجر ہو — سر بدخواہ فندق تیری انگشت حنا پر ہو

غرضکہ ذوق نے قدماء کے قصائد پر ایک حد تک ترقی کی اور اپنے فضل و کمال کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ انکے قصائد میں زبان کی صفائی اور سلاست مضمون اور الفاظ کی شان و شوکت اور روانی بحد کمال ہے، عامیانہ اور سوقیانہ اشعار سے انکے قصائد یکسر پاک ہیں، مشکل زمینوں میں جو دو چار قصیدے ہم تک پہونچے ہیں ان میں جو مضمون آفرینی کی ہے وہ قابل داد ہے۔ اس قصیدہ پر

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن — آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

خاقانی ہند کا خطاب ملا۔

مومن نے قصیدہ گوئی میں ایک خاص رنگ اختیار کیا، اگرچہ پختگی اور صفائی میں قصائد ذوق کا رتبہ کہیں ارفع ہے مگر جدت اور ندرت میں مومن کے قصائد لاجواب ہیں، انکی تشبیب عموماً نادر اور انوکھی ہوتی ہے۔ ایک قصیدہ منقبت جو سیدنا عمر فاروق کی مدح میں ہے اسکی تشبیب دیکھئے کیا عاشقانہ رنگ سے مملو ہے:-

جو اسکی زلف کو دوں عقدۂ مشکل — تو بوالہوس کا بھی ہرگز نہ چھوٹے مشکل

تم اور حسرت ناز آہ کیا علاج کرے دل — ہیں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل

فغان کہ دلبر خود کام سے پڑا مجھے کام — حصول کار ہے بیکار سعی لاحاصل

گریز میں فرماتے ہیں:-

وہ فتنہ گر بت ناحق شناس ناانصاف — کہ فرض عین گنے کین داور عادل

امام اہل یقیں شہریار کشور عدل — امام لشکر دین و مبارز مقتل

قصیدے میں تعلی اور شکایت زمانہ بھی پائی جاتی ہے نعت شریف اور منقبت خلفاء راشدین کے قصیدے والہانہ اور بیخودانہ عقیدتمندی سے لبریز ہیں، مومن کے قصائد میں علمی مضامین بکثرت ملتے ہیں، اور چونکہ خود رمل نجوم اور طب میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اس لئے مخصوص مصطلحات سے کلام کا اغلاق بڑھا دیتے ہیں، ملاحظہ ہو:-

حکیم وہ ہوں کہ جاتے رہیں حواس اگر — کرے معالجہ سر دفتر علوم و نفوس

طبیب وہ ہوں کہ ہو سوز سینۂ بلبل — نظارہ رخ گلفام سے بجھے محسوس

جو ہوں معالج مہلوں تو قابض ارواح — کرے دعا رواج طریق جالینوس

یہ بھی عرفی کیطرح اپنے علم و فضل پر مغرور ہو کر اکثر اپنی مدحت سرائی کرنے لگتے ہیں جیساکہ اشعار بالا سے ظاہر ہوتا ہے، مومن نے صلہ کی امید پر ارباب دنیا کی مدح میں کبھی قصیدہ نہیں لکھا راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ کی مدح میں جو قصیدہ ہے اسکا خاص سبب ہے، یہ اتفاقاً جا رہے تھے کہ کسی نے راجہ سے کہا کہ یہی مومن خاں ہیں راجہ نے آپکو بلایا بات چیت ہوئی، چلنے لگے تو راجہ نے کہا کہ ہتنی پر سوار ہو کر جائیے، غرضکہ مذکورہ مدحت سرائی بامید صلہ نہیں بلکہ شکریہ دوستانہ ہے

نواب وزیر الدولہ فرمانروائے ٹونک کی مدح میں بھی ایک قصیدہ ہے جسکا مطلع یہ ہے:-

یاد ایام عشرت فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

مگر یہ قصیدہ بھی صلہ کی امید پر نہیں لکھا

ماسوا ان قصائد کے ایک قصیدہ حمد و مناجات میں ہے، ایک نعت میں اور ایک خلفاء راشدین اور ایک امام حسین علیہ السلام کی منقبت میں ہے

ذوقؔ اور مومنؔ کے علاوہ غالبؔ نے بھی کچھ قصائد لکھے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اصول قصیدہ گوئی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اردو شاعری کا سرمایہ ناز ہیں - مثلاً یہ قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے :-

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اس قصیدے میں ایک بلند پایہ تشبیب کے بعد نہایت خوبصورتی سے گریز کا راستہ پیدا کیا ہے :-

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ اے پری چہرہ پیک تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن نام شاہنشہ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ مظہر ذوالجلال والاکرام

ماہ نو کی طرف خطاب کر کے کہا ہے :-

جب کہ چودہ منازل فلکی کر چکی قطع تیری تیزی گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر کوئے مشکوئے و صحن منظر و بام

اس قصیدے نے بلحاظ اپنی متانت و سلاست جزالت اور تشبیب ایک نئی روشنی پیدا کی - یہ قصیدہ رسمی محاسن ایشائی سے یکسر خالی ہے -

طباطبائی کی رائے ہے کہ اس قصیدہ کی تشبیب ایک کارنامہ ہے اور جب سے اردو زبان میں قصیدہ گوئی شروع ہوئی ہے اس طرح کی تشبیب کم کہی گئی ہے، اس قصیدے کے علاوہ غالبؔ نے اور بھی قصائد کہے ہیں جو دیگر شعرا کے قصائد سے کئی باتوں میں ممتاز ہیں مثلاً انہیں مثل قدماء کے بے جا مبالغہ نہیں ہے - جیسا کہ سوداؔ کے قصیدے سے ظاہر ہوتا ہے - مطبخ کی تعریف میں سوداؔ یوں فرماتے ہیں -

اللہ اللہ ترے مطبخ کا تجمل جس کا طبق روئے زمیں سے ہو سرا خوان خشک

برخلاف اس کے غالبؔ بادشہ کی مدح اس طرح کرتے ہیں جس طرح کہ ایک بادشہ کی مدح کرنا چاہیئے :-

بادشہ کا نام لیتے ہیں خطیب اب علوئے پایۂ منبر کھلا

مثل مومنؔ کے غالبؔ نے بھی عاشقانہ مضامین استعمال کئے ہیں لیکن غالبؔ نے اس کا خیال رکھا ہے کہ وہ غزل نہیں کہہ رہے ہیں لہذا انہوں نے ایسے عاشقانہ اشعار کہے ہیں جن کا تعلق مدح سے مل جاتا ہے - غالبؔ نے حسب ذیل قصیدے میں عاشقانہ اشعار کہے ہیں، مگر ان اشعار کا لب و لہجہ قصیدے سے میل کھا جاتا ہے -

ہو جہاں گرم غزل خوانی نفس لوگ جانیں طبلہ عنبر کھلا

بلحاظ اسلوب بیان اور طرز ادا بھی غالب کے قصائد اس صنف سخن کے اصول کے پابند ہیں۔ مثلاً ممدوح کی مدح اس طرح کرنی چاہئے کہ اس کی ذات تمام خصوصیات کے ساتھ مجسم ہو کر سامنے آجائے۔ مثلاً:۔

بزم سلطانی ہوئی آراستہ کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

علاوہ ازیں غالب نے اپنے قصائد کے اخیر میں دعائیہ اشعار اس قدر اختصار اور خوبصورتی سے کہے کہ مثال ہو کر رہ گئے:۔

کاتب حکم نے بموجب حکم اس رقم کو دیا طراز دوام

ہے ازل سے .......... ہے ابد تک رسائی انجام

دیگر۔ تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

غالب و مومن و ذوق کے علاوہ دیگر شعرائے وقت نے قصیدہ گوئی پر طبع آزمائی کی مگر سوائے نتنون کے اور کسی کے قصیدے زیادہ مقبول نہ ہوئے۔ ظفر کے دیوان میں بھی نعتیہ قصائد موجود ہیں۔

**مثنوی** دلی میں مثنوی کی طرف بہت کم توجہ کی گئی چنانچہ اس دور میں مومن نے چند اچھی مثنویاں لکھی ہیں جو ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ ان کی مثنویاں بلحاظ صفائی زبان اور اسلوب ادا اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ چونکہ جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی ہیں اس لئے خاص درد اور اثر رکھتی ہیں، لیکن بعض اشعار عریاں ہیں۔ انکی وہ مثنویاں جو مذہبی رنگ میں لکھی گئی ہیں وہ بہت پُر جوش ہیں۔ ذوق اور مومن کے یہاں مثنویوں کا وجود بمنزلہ عدم ہے۔ ذوق نے ایک مثنوی نامہ جانسوز لکھی تھی جو پانسو اشعار پر مشتمل تھی مگر غدر میں ضایع ہو گئی۔ اون کے دیوان میں مثنوی کے زیر عنوان کچھ اشعار ملتے ہیں۔

**صنایع و بدایع** صنایع و بدایع کی پابندی دلی کے شعرا میں بہت کم پائی جاتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بالکل نہیں پائی جاتی۔ کلام کی بنیاد اکثر صنایع و بدایع پر رکھنے سے معنی سخت الجھن میں پڑ جاتے ہیں اور اثر بھی زائل ہو جاتا ہے۔ صنعتیں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک معنوی جیسے مراۃ النظیر۔ مشاکلہ عکس۔ حسن تعلیل۔ تجاہل عارفانہ۔ ایہام وغیرہ۔ دوسری لفظی، جیسے تجنیس اور منقوط وغیرہ۔

اس دور میں شعرائے دلی کے کلام میں خال خال ایسے اشعار ملتے ہیں جنہیں صنایع و بدایع پائے جاتے ہوں۔ خصوصاً شاہ نصیر اور ذوق کے کلام زیادہ اور مومن اور غالب کے کلام میں کمتر۔

سطور بالا میں ہم عہد ظفر میں اردو شاعری اور شعرائے کرام کے محاسن کلام پر تبصرہ کر چکے ہیں۔ اردو ادب اور خصوصاً غزل گوئی جس بلند مرتبہ پر پہونچی وہ سب پر ظاہر ہے۔ زبان کی پاکیزگی طرز ادا کی جدت اور اسلوب بیان کی ندرت اس عہد کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ پرداز تخیل۔ شوخی ادا۔ مضمون آفرینی، فلسفہ طرازی اور تصوف آمیز اشعار کے لحاظ سے یہ عہد بے نظیر ہے، جذبات نگاری میں جس سچائی اور حقیقت کا اظہار شعرائے دلی نے کیا ہے وہ قابل ہزار آفریں ہے۔ باوجود اس حیرت انگیز ترقی کے اس

عہد کے شعرائے کلام میں کچھ کمزوریاں اور خامیاں موجود ہیں، جن کا اظہار ایک ناقد کا فرض ہے۔

۱۔ تصویر کا دوسرا رخ | کچھ نامناسب الفاظ کا استعمال:۔

قریب قریب اس عہد کے تمام شعرار کے کلام میں کبھو۔ کسو۔ کھائے ہے۔ تئیں، اور اسی طرح کے اور بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں جنکا شمار اب متروکات میں ہے۔ ممکن ہے جب نہو۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ باوجود اسقدر اصلاح اور ترمیم کے زبان میں اب بھی کچھ سقم باقی تھا۔ اس عہد میں "قس پر" متروک ہوچکا تھا مگر غالب نے استعمال کیا جو ناجائز ہے۔

گوشش مہجور پیام و چشم محروم جمال ایکدل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

۲۔ رعایت لفظی | شعرائے دلی اگرچہ ایک حد تک اس وبا سے محفوظ رہے تاہم رعایت لفظی کی اکثر مبتذل مثالیں اس عہد کے شعرار کلام پائی جاتی ہیں۔ شاہ نصیر۔ ظفر اور ذوق کے یہاں بہت زیادہ مومن اور غالب کے کلام میں بہت کمی ہے۔

شاہ نصیر — تیرا خسا ہر روز پڑھواتے ہیں ہم دل اسی پرچے سے پرچاتے ہیں ہم

” — چمکا ترے بلاق کا موتی جو رات کو دم ناک میں ہے اختر دنبالہ دار کا

مومن — طلب وصل کس انداز سے ہم کرتے ہیں شوق نامہ اُسے وصلی پہ رقم کرتے ہیں

شیفتہ — کیا کہوں جوہر شناسی آپ کی مجکو مارا تیغ جوہر دار نے

غالب — دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

” — غالب میرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں دہن کے پاؤں

ذوق — چنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے! ستاروں میں کیا کیا چناں و چنیں ہے

"مشترک خامیاں" اس عہد کے شعرار کے کلام میں بہت کم پائی جاتی ہیں، اسلئے ہم اس دور کے ممتاز اساتذہ ذوق، غالب اور مومن کے کلام کی کمزوریوں پر اکتفا کرتے ہیں اور جو کمزوریاں ان مو الید ثلاثہ کے کلام میں ملتی ہیں، انہیں ایک یا دوسری غلطی کے دوسرے شعرار بھی مرتکب ہوئے ہیں۔

ذوق

بے مطلب قیافہ پیمائی اور محاورہ بندی | اکثر اشعار میں صرف محاورہ بندی کے علاوہ کچھ مطلب یا ندرت نہیں ہے۔ متعدد غزلیں جو سنگلاخ زمینوں میں ہیں انمیں سوائے قیافہ پیمائی کے کچھ نہیں اور حقیقی شاعری سے مفقود۔ شاہ نصیر اور ظفر کے کلام میں بھی یہ عیب ہے۔ ذوق کے یہ اشعار جنمیں محاورہ بندی کے علاوہ کچھ نہیں۔

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

سوال بوسہ کو ٹالا جواب چین بر و سے برات عاشقاں بر شاخ آہو اسکو کہتے ہیں

ذوق۔ نصیر۔ اور ظفر کے دواوین میں جو غزلیں سنگلاخ زمینوں میں ملتی ہیں ان میں بیشتر اشعار ایسے ہیں جن میں حسن شعر

کچھ بھی نہیں، مثلاً ذوق اور نصیر کی یہ غزل جو اس زمین ہے۔ "بس کی تیلیاں"۔ "برس کی تیلیاں" دیکھئے یا ذوق کی وہ غزلیں دیکھئے جو اس زمین میں "ہرن کی شاخ" "یاسمن کی شاخ" یا "فن آب میں" "گلخن آب میں" دیکھئے۔

**۴۔ کلام میں تعقید** ذوق کی غزلوں میں بہت سے اشعار ایسے ملتے ہیں جنہیں تعقید کا عیب ہے، ظفر کے دیوان میں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شعرا ردلی ضرورتاً زبان کو خیالات پر قربان کر دیتے تھے۔

غالب کے کلام میں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں مثلاً

ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر    ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

بندش میں تعقید ہے۔

## غالب

**۵۔ خیالات کی پیچیدگی** غالب کے بہت سے ایسے اشعار ہیں جن کا اصلی اور صحیح مفہوم سمجھنے میں دقت ہی نہیں بلکہ ناکامیابی کا سامنا ہوتا ہے، یہ طرز ادا اچھی نہیں اور اسیر غالب کا ناز کرنا کہ

آگہی دام شنیدن جسقدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

نازیبا ہی نہیں ہے بلکہ قابل اعتراض ہے ایسے اشعار دیوان غالب میں بہت ملتے ہیں۔

**"فارسیت" کا غلبہ اور بیجا استعمال** غالب کے اکثر اردو اشعار ایسے ہیں کہ جنہیں اگر اردو کا فعل علیحدہ کر دیا جائے تو شعر اچھا خاصہ فارسی کا شعر ہو جاتا ہے۔ مثلاً:۔

درس عنوانِ تماشہ بتغافل خوشتر    ہے نگہ رشتہ شیرازہ مژگاں مجھے
ستمارہ مرغوب بت مشکل پسند آیا    تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
یکقدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا    جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

**محاورہ بندی میں غلطی** غالب کے کلام میں یہ عیب بھی پایا جاتا ہے، مثلاً اپنے سہرے میں لکھتے ہیں:۔

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا    باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

طبا طبائی لکھتے ہیں کہ محاورہ پورا نہ بندھا، محاورہ یہ ہے:۔ ترے سر شاعری کا سہرا۔ ترے سر فضیلت کا سہرا۔ خالی سہرا کوئی نہیں کہتا جس طرح مرزا نے بخت کے سر سہرا کہا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ    اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

شراب کھینچنا۔ یا ساغر کھینچنا دونوں اردو کے محاورے نہیں۔ اگر فارسی کے محاورے "شراب کشیدن" اور ساغر کشیدن" کا ترجمہ کیا ہے تو ناجایز ہے۔

**فلسفہ طرازی کی زیادتی** | غالب کے کلام میں فلسفہ کا عنصر اعتدال سے بڑھ گیا ہے، غزل میں فلسفہ کا غلبہ نامناسب ہے غزل میں صرف حکایات سوز و گداز - درد و غم - اور احساسات و جذبات کا اظہار ہونا چاہیئے اگر تصوف - فلسفہ اور اخلاقی مضامین کو شامل کیا جائے تو بہت کمی کے ساتھ مگر غالب کے کلام اس کے برعکس ہے:-

## مومن

خیالات کی پیچیدگی میں مومن بھی غالب سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار معما بن کر رہ جاتے ہیں مثلاً:-

دیکھو اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

**زبان کی ناہمواری** | مومن نے زبان کی صحت اور بندش کی درستی سے لاپرواہی برتی ہے لہذا ان کا دیوان ایسے اشعار سے بھرا ہوا ہے، جن میں بندش کی تعقید پائی جاتی ہے جو ان کے کلام کے اغلاق کی ذمہ دار ہے - مثلاً یہ شعر دیکھئے:-

بے حجابی کا گلہ کیجئے تو کہتا ہے ترے
پردہ چشم کے تقصیر کے حائل نہوا
محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

اس کے علاوہ مومن کے کلام میں نامانوس تراکیب اور ثقیل الفاظ کی بھرمار ہے - مشکل اصطلاحات اور بعید اشارات سے شعر کو گورکھ دھندا کر دیا ہے - مثلاً:-

جیسے بندۂ شور بحر- ادراک الخ

مومن نے بعض الفاظ کا غلط استعمال بھی کیا ہے - مثلاً تم بسکون میم کو بہ فتح میم لکھا ہے - بعض مقامات پر ردیف بیکار کر دی ہے مثلاً:-

مجھ پہ طوفان اٹھائے لوگوں نے
مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے

جو خامیاں ہم اوپر لکھ آئے ہیں، وہ دیگر شعرائے دہلی کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں -

**طاہرہ خاتون**


# رسالہ جن

اگر آپ نے ابھی تک نہیں خریدا تو جلدی کیجئے کیونکہ پھر مکمل فائل آپ کو نہیں مل سکیگا - جنوری کا پرچہ قریب ختم ہونے کے ہے نمونہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا پسند آنا یقینی ہے - فوراً وی پی منگائیے - یا عہ کا منی آرڈر بھیج دیجئے - پندرہ میں روز کے بعد پہلا پرچہ کسی قیمت پر نہیں مل سکیگا -

"منیجر نگار و جن لکھنؤ"

# عہد ظفر کے تاریخی و سیاسی حالات

ملتون کے بننے بگڑنے مین، قومون کے عروج و زوال مین، قدما کے شاندار اور پر جلال طرز تمدن مین، انکے دلکش اور دلفریب اصول تہذیب مین، انکے اختلال مملکت، اور اضمحلال قیادت مین ایک محو نظارہ کے لئے جو سامان بصیرت نظر آتا ہے اہل نظر سے مخفی نہین، مطالعہ فطرت کے یہ تاثرات، انسان کے ذوق ادب مین کارفرما نظر آتے ہین، تاریخ آثار، تصوف، شاعری اسی انقلاب ہستی کی مختلف علمی تعبیرات ہین، ایک مورخ اوٹھا، اسنے قوم مین جذبات عمل، اور شورش اقتدار پیدا کردی، انکی تعمیر عادات، انکی تنظیم جماعت انکی سیاست مدن، الغرض انکے تمام شعبات معاشرت کے لئے کاشانۂ ہستی، اور طلسم وجود سے، منتشر واقعات چن کر، اثر آفرینی کا ایک ایسا مادہ جمع کردیا، جسے آج ہم "تاریخ" کے نام سے موسوم کرتے ہین، اسیطرح ہیئت اجتماعیہ کے بعض افراد نے اس ہنگامہ عمل کے آخری نتیجہ پر غور کیا، انھون نے مصر کے قدیم آثار، یونان اور روما کے مٹے ہوئے تمدن، فارس اور عرب کی قومی یادگار، ہندوستان اور چین کے دفائن ارضی کا پر حسرت نظارہ کیا، انکے قلوب پر ہنگامۂ ترقی، تمنائے حکومت، اور انکے وجدان مین احساسات مادہ نوازی اور طلب جاہ کی بجائے دوسری کیفیات پیدا ہوئین جنھین مبادی تصوف، اور لوازم شاعری سے تعبیر کرسکتے ہین، آثار قدیمہ کا یہی عبرت آموز نظارہ تھا، جسنے گوتم اور ادہم سے تخت چھڑایا، جسنے رومی اور سنائی پیدا کئے، جسنے گوئٹے اور ورڈسورتھ کی گفتار مین خلش پیدا کی، اسمین شک نہین کہ شعرا کی زندگی کا ابتدائی زینہ اکثر اس مطالعہ کے اولین حصہ سے متعلق رہا ہے، لیکن شاعری جب "فاراہ الایۃ الکبریٰ" اور "بنطش بطشۃ الکبریٰ" کے مناظر سے متحس ہوئی تو احساسات نے کروٹ لی، اذواق کا دوسرا مرکز مقرر ہوا، تاریخ بتاتی ہے، شعر و سخن کا آخری نتیجہ ذوق تصوف ہے، اور یہ کلیہ ہم رومی اور عطار کی حلاوت زندگی، خاقانی اور خسرو کے رشحات درد، نظیری اور ظہوری کے ترک تلذذ مین پاتے ہین، مشاہدات زندگی، اور تجارب انقلاب کی اسی منزل پر پہونچکر رومی نے کہا ہے۔

دیدم کہ بر کنگرہ اش فاختۂ      بنشستہ ہمی گفت کہ کو، کو، کو

دہر کی اس پرملال بوقلمونی، اور دائیہ فطرت کی اس ستم ظریفی سے قلوب پر جو اثر پڑتا تھا، وہ صوفی ادبیات، یا زوال دولت کی تاریخی موشگافیون، اور کھنڈر اور آثار کی دلکش نقش آرائیون مین ملیگا، جنکا کافی ذخیرہ گبن کی دردانگیز سحر کلامی، اور خاقانی کے نگارخانۂ بیان مین پایا جاتا ہے، خاقانی مداین کے سربفلک عمارات کے کھنڈرون مین پہونچتا ہے، عہد اکاسرہ کی مٹی ہوئی عظمت انکا جاہ و جلال، انکی شان و شکوہ، انکا رعب و دبدبہ اسکی آنکھون کے سامنے آجاتا ہے، وہ عہد ماضی کے اس دور سطوت و حکمرانی کا ایک نہایت دلفریب نقشہ پیش کرتا ہے، اور اسکے بعد اس وحشت آباد مقام، اور درد پیدا کرنے والے ویرانہ کے نقوش دکھاتا ہے دفعۃً قلب مین ہیجان پیدا ہونے لگتا ہے، دل مین ٹیس اوٹھتی ہے، اور بے اختیار تیرہ سو سال پیشتر کے ایک انسان کے الہامی

جذبات کی تصویر نظر کے سامنے کھینچ جاتی ہے، وکم اهلکنا قبلهم من قرن هم احسن اثاثا ورءیا ٥ قل من کان فی الضلالة فلیمدد له الرحمن مدا۔ حتی اذا راوا مایوعدون اما العذاب واما الساعة فسیعلمون من هو شر مکانا واضعف جندا ٥[1] (اور ہم نے ان سے پہلے بہت سے ایسے لوگ ہلاک کئے جو سامان اور نمود مین ان سے بھی اچھے تھے، آپ فرما دیجئے جو لوگ گمراہی مین ہین اللہ تعالی انکو ڈھیل دیتا چلا جارہا ہے، یہانتک کہ جس چیز کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، اسکو دیکھ لینگے خواہ عذاب کو خواہ قیامت کو، سو انکو معلوم ہو جاویگا کہ برا مکان کسکا ہے، اور کمزور مددگار کس کے ہین)

خاقانی نے مدائن کے کھنڈر کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ گویا قرآن مجید کے اسی آیت کی شرح ہے، فرماتے ہین[2]

ہان اے دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ہان ایوان مدائن را آئینہ عبرت دان

یکرہ ز لب دجلہ منزل بہ مدائن کن از دیدہ دوم دجلہ بر خاک مدائن ران

خود دجلہ چنان گرید صد دجلہ خون گوئی کز گرمی خونا بش آتش چکد از مژگان

بینی کہ لب دجلہ کف چون بدہان آرد گوئی ز تف آہش لب آبلہ زد چندان

شاعر دریائے دجلہ کے کنارہ کھڑا ہے، اسکے ایک طرف عہد اکاسرہ کی یادگارون کا سلسلہ ہے، اسے دیکھکر شاعر کے دل مین ایک التہاب درد پیدا ہوتا ہے، ایک شعلۂ الم بھڑک اٹھتا ہے، اسے اپنے تمام جذبات لطیف خود دریائے دجلہ مین نظر آنے لگتے ہین، وہ دجلہ کے تموج اور تھپیڑون مین حباب کی سرافرازیون کو دیکھکر کہتا ہے کہ موج دریا آہ ہے جسکی گرمی سے جسم دریا پر پھپھولے رونما ہین، اور یہ حباب کی شکل مین سطح دریا پر نظر آرہے ہین

گہ گہ بہ زبان اشک آواز دہ ایوان را تا بو کہ بہ گوش دل پاسخ شنوی ز ایوان

دندانہ ہر قصرے بندے دہدت نو نو پندسر دندانہ بشنو ز بن دندان

گوید کہ تو از خاکی ما خاک تو ایم اکنون گامے دو سہ بر ما نہ اشکے دو سہ ہم بفشان

از نوحہ جغد الحق مائیم بہ درد سر از دیدہ گلابی کن درد سر ما بنشان

آری چہ عجب داری کاندر چمن گیتی جغد است پے بلبل نوحہ است پے الحان

اسکے بعد شاعر کی آنکھون مین آنسو بھر آتے ہیں وہ ایک والہانہ انداز مین، ٹوٹے ہوئے محلون سے اس تباہی و بربادی کا راز دریافت کرتا ہے، اور عالم بیخودی مین اسے دندانہ قصر سے جواب بھی مل رہا ہے، کہ آ، تم بھی ایک پتلہ خاک ہو، مین بھی تمہاری ہستی کا ڈھیر ہون، ہماری تمہاری خلقت ایک ہے، مجھ پر دو ایک قدم چلو، چند قطرے آنسو بہالو، دوسری طرف سے شاعر کے

---

[1] قرآن مجید مین اکثر اس مضمون کی آیتین پائی جاتی ہین، زخرف، قصص، احقاف، قاف وغیرہ مین یہ اشارے موجود ہین۔

[2] خاقانی کا یہ قصیدہ اس قدر مشہور ہے کہ ایک انگریز مستشرق نے اسکا ترجمہ مع شرح شائع کیا،

کان مین الو کی وحشتناک آوازین آرہی ہین، سرمین درد ہوگیا ہے، اور اب وہ طالب ہے کہ گلاب نہین بلکہ آنسوئے میرے اس درد کا علاج کر دلیعنی وہ دوسرے افراد کو بھی اپنا شریک ماتم بنانا چاہتا ہے، اسکے بعد زنگینی دہر کا ایک کلیہ پیش کرتا ہے، کہ دنیا مین ہر بلبل کی آواز کے بعد الو کی منحوس صدائین سنی جاتی ہین اور ہر نغمۂ نشاط کے بعد نوحہ مستلزم ہے۔

این ہست ہمان ایوان کز نقش رخ مردم | خاک در او بودے دیوار نگارستان
این ہست ہمان درگہ کو راز شہان بودے | دیلم ملک بابل، ہند و شہ ترکستان
پند ار ہمان عہد است از دیدۂ فکرت بین | در سلسلہ درگہ در کوکبۂ میدان

یہ وہی محل ہے جہان خدم وحشم تھا، جہان کی خاک نگارخانہ چین کی دیوار تھی، یہ وہی دربار ہے، جہان دیلم، بابل ہند اور ترکستان کے حکمران جذبۂ نیائش لیکر آتے، اگر غور سے دیکھا جائے، تو عہد ماضی کا وہ جبروت آج بھی در و دیوار سے ظاہر ہو رہا ہے، آثار قدیمہ کے اس مطالعہ سے خاقانی اس نتیجہ پر پہونچے ہین

امروز کہ از سلطان رندے طلبد توشہ | فرداز در رندے توشہ طلبد سلطان
ہر کس بر داز طیبہ سبحہ "زگل حمزہ" | پس تو ز مداین بر تسبیح "گل سلمان"

دنیا مین یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ آج اگر کوئی شخص بھکاری بنکر بادشاہ کے دروازہ پر صدا لگا رہا ہے، تو کل بادشاہ اس مفلس وقلاش کے دروازہ پر دریوزہ گری کیلئے آتا ہے، اسکے بعد فرماتے ہین کہ مکہ سے تو سب لوگ "سبحہ گل حمزہ" یجاتے ہین مجھے مدائن سے "گل سلمان" کی تسبیح لانی چاہئے،

دنیا کی ہر قومی ترقی کا ایک دورہ ہوتا ہے، اور اگر مین تاریخ و آثار کے بے شمار واقعات کی بنا پر دعوی کرون تو بیجا نہین کہ امتون کی ترقی کے لئے فطرت خود اسباب مہیا کرتی ہے، اور جب انکی بربادی کا زمانہ آتا ہے، تو کوئی تدبیر کوئی حکمت عملی کارگر نہین ہوتی، جنھون نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے، انھین اس سے انکار نہین ہوسکتا، کہ خاندانونکے اسباب عروج وزوال مین باوجود کاوش بھی اسکا پتہ لگانا مشکل ہے کہ کسی خاندان کی سیاسیات ایک وقت حوادث زمانہ کے سیلاب سے کیون محفوظ رہجاتی ہے، اور دوسرے وقت وہی اسباب سیاسی خطرات کیون پیدا کردیتے ہین؟ ایک غلام اور ایک آشفتہ حال فرد بادشاہ ہوتا ہے، اور شاہی خاندان کا ایک معزز انسان دربدر کی ٹھوکرین کھاتا پھرتا ہے، یا اپنا گلوئے نازپرورده کو تشنگی شمشیر کے لئے وقف کر دیتا ہے، عہد اموی وعباسی کی مطول داستان جلالت ونکبت کو جانے دیجئے، صفویہ اور قاچاریہ، فاطمیہ اور ملوکیون کے سیاسی انقلاب کو چھوڑیے، برامکہ کی ترقی، اور ہندوستان کے غلام، خلجی، تغلق، سید، لودی، سور خاندانون کو درگزر کیجئے، صرف دکن کی محدود سرزمین کے مختلف شاہی خاندانون کے اسباب ترقی وتنزل پر غور کیجئے، خاندان بہمنیہ اور عادلشاہیہ، کے آشفتہ حال بانیون کے حالات زندگی پڑھیئے، نظام الملک بحری اور فاروق شاہیہ کے بانی راجہ بیگ کی زندگی کا مطالعہ کیجئے[1]، آپکو معلوم ہوجاویگا کہ طلسم کائنات کی ان بوالعجبیون کو سمجھنا مشکل ہے، اور

[1] فرشتہ، بساتین السلاطین، منتخب التواریخ، اور تاریخ قطب شاہیہ وغیرہ مین بہ تفصیل یہ حالات موجود ہین ان خاندانون کے بانی اور انکے نسب وحسب کے متعلق ایک کتاب میرے زیر تصنیف ہے، جسکی اشاعت پہلے نگار مین بھی ہوگی،

عجز کیساتھ صرف یہی اقرار کرنا پڑیگا کہ حقیقتاً فطرت کا بانی کسی شے کو ہمیشہ ایک حالت پر رکھنا نہین چاہتا، ہر شاہی خاندان کا وجود ایک بچہ کی ولادت ہے، اور اسکے لئے جتنے مراحل ارتقاء طے کرنا ہین ان سے گذرنے کے بعد یقیناً ایک وقت معین پر باوجود سامان ارتقاء، باوجود اسباب علو، نکبت کا ہجوم اور بدبختی کا سیلاب ضروری ہے، جس طرح ضعف پیری مین عمدہ سے عمدہ تدابیر بھی ایام جوانی کی معمولی تدبیر کے برابر بھی اپنا اثر ظاہر نہین کرتین، اسی طرح قومون اور ملتون، خاندانون اور افراد کے ارتقاء کی ایک محدود منزل ہے، جہان اسے اپنی ترقی کا آخری سفر ختم کر کے فنا ہونا پڑتا ہے، اکاسرہ کی تباہی کا جب زمانہ آیا تو یزدجرد جیسے بیدار مغز بادشاہ کی ایک نہ چلی، امویہ کی پستی کا دور آیا تو مروان الحمار جیسے زبردست سلطان سے بھی کچھ بنائے نہ بن پڑا، لودیون کے خراب دن آئے تو ابراہیم میدان جنگ مین مارا گیا

مغل خاندان حوادث روزگار کی اس زد سے کیونکہ محفوظ رہسکتا تھا، جلوس بابری ۹۳۲ھ سے ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ کے وقت جلوس ۱۲۵۳ھ تک تین صدی سے زیادہ زمانہ گزر گیا تھا، خاندان مغلیہ وہ تمام خدم و حشم تزک و تجمل، جبر و قہر قبضہ و اختیار، نعایم و لذائذ حاصل کر چکا تھا، جو دنیا کے ایک بڑے سے بڑے خاندان کیلئے ضروری ہین آخر کار انکے عادات و اطوار، انکے اخلاق و ذہنیت مین انقلاب ہونا تھا، ہوا، اور جسطرح انھون نے لودیون کو بے خانمان کیا تھا، اسی طرح خود بھی بے خانمان ہوئے، وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّن قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجَتْكَ أَهْلَكْنَاهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ (اور بہت سی بستیان ایسی تھین جو قوت مین آپکی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھین جسکے رہنے والون نے، آپکو گھر سے بے گھر کر دیا کہ ہمنے انکو ہلاک کر دیا، سو انکا کوئی مددگار نہوا)

ایک با اقتدار خاندان کے ظل عاطفت مین، قدرت دوسرے خاندان کی ترقی کے جو اسباب مہیا کرتی ہے انہین تاریخ نے نظر انداز نہین کیا، البتہ صورتین مختلف ہوئی ہین، اور اس سایہ مین پرورش پاکر خاندانون نے اپنے ولی نعمت سے جو سیاسی حقوق حاصل کئے، انھین جسطرح مٹایا، اور آخر کار انہین مٹا کر تاج و تخت حاصل کیا وہ تاریخ کا کوئی نادر الوقوع مسئلہ نہین، لہذا مغل خاندان کے ساتھ انگریزی حکومت نے جن سیاسی تدابیر اور ظاہر دارانہ مراعات سے کام لیا انکا مطالعہ کرنیکے بعد نہ تو انگریزی حکومت کو مطعون بنایا جاسکتا ہے، نہ انگریزون سے کوئی گلہ ہے

خاندان مغلیہ کا دور انحطاط تو عالمگیر کی وفات سے ہی شروع ہوتا ہے، لیکن اکبر اور عالمگیر کی قایم کی ہوئی عظمت نے شاہ عالم کی زندگی (۱۱۱۷ھ سے ۱۱۲۴ھ) تک کوئی نمایان تغیر نہونے دیا اسکے بعد پیاپے مختلف بادشاہونکی تخت نشینی اور چند ماہ اور چند یوم تک زمام حکومت لیکر برطرف ہونے کے واقعات نے مغل سیاسیات کو بہت نقصان پہونچایا، چنانچہ شاہ عالم کی وفات ۱۱۲۴ھ سے سلطان محمد ابراہیم کے وقت جلوس ۱۱۳۲ھ تک تخت دہلی پر پیاپے مغل خاندان کے نو بادشاہ بیٹھے، ان مین صرف سلطان فرخ سیر نے چھ سال تین ماہ اور چند یوم تک حکومت کی بقیہ تمام سلاطین چند ماہ اور چند یوم تک سریر آرائے حکومت رہے ابو الفتح محمد شاہ بادشاہ کی حکومت ہر چند سطوت مغلیہ کے استقرار کے اعتبار سے اچھی تھی لیکن نادری حملہ اور دہلی کی بربادی نے

مغلون کو دنیا کی نظر مین بہت خفیف کر دیا، اور غالباً اسی وقت سے ہندوستان کی دوسری سیاسی تحریکات کو مغلون پر تسلط حاصل کرنے کی جرأت ہوئی، محمد شاہ کے بعد بہادر شاہ سے لیکر اکبر شاہ (سنہ ۱۱۶۱ھ سنہ ۱۲۵۳ھ) تک ہر چند مستقل طور پر بادشاہون نے حکومت کی، لیکن شاہ عالم ثانی ہی کے دور مین انگریزی سیاسیات نے ہندوستان پر ایک گہرا اثر پیدا کر دیا تھا اور شاہ عالم سے لیکر سراج الدین بہادر شاہ ظفر (سنہ ۱۱۷۳ھ سنہ ۱۲۵۳ھ) تک تیموری خاندان کے بجائے انگریزون کو ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی طاقت تصور کرنی چاہیے

لارڈ ولسلی اور اسکے رفقائے دار الشوریٰ کا خیال تھا کہ شاہ عالم کو اپنی حمایت مین لیکر بتدریج حصول شہنشاہیت کی سیاسی تدابیر اختیار کرنی چاہیے[۱]، شاہ عالم کے مسئلہ حفاظت سے لارڈ ولسلی نے سیاسی فضا مین جو نمایان انقلاب پیدا کر دیا تھا وہ یہ تھا کہ اگر خاندان مغلیہ کا یہ فرمانروا، انگریزون کی بجائے فرانسیسیون یا مرہٹون کی حمایت مین آجاتا تو انگریزون کو برطانوی حکومت کے قایم کرنے مین دقتین پیدا ہوتین، چنانچہ یہ نظریہ اس خط سے بھی واضح ہو جاتا ہے، جو لارڈ ولسلی نے ۱۳ر جولائی سنہ ۱۸۰۴ء کو انگلستان کی "عدالت رہنمایان کی مجلس مخفیہ" مین بھیجا تھا، جسکا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ عالم کو برطانوی حفاظت مین لینے سے فرانسیسی قوم جو ہندوستان کے ایک حصہ مین صاحب اقتدار ہے، اپنے معاندانہ ارادون مین کامیاب نہین ہو سکتی، کیونکہ شاہ عالم انکے معاندانہ کارروائیون مین ایک آلہ تھا، جس سے وہ اب محروم ہو گئے، ولسلی نے اس سیاسی حکمت عملی کی طرف بھی اشارہ کیا ہی کہ بادشاہ کے مسئلہ حفاظت سے اطراف و جوانب کی دیسی ریاستون پر ایک اچھا اثر پڑیگا اور وہ یہ دیکھکر کہ انگریزون نے بادشاہ کے لئے اس گری ہوئی حالت مین ایک نشیمن راحت کا سامان کر دیا، اور اسکے آفت زدہ کثیر التعداد افراد خاندان کے لئے ایک معقول ذریعہ معاش مقرر کر دیا، انگریزی سیاسیات کو بہ نظر استحسان دیکھینگے، شاہ عالم کا انگریزی حمایت مین آجانا خاندان تیموریہ کے مٹنے اور حکومت برطانیہ کے استقلال کا سبب ہوا، اور "ولیم کے" "فتح و نصرت کے نہایت ستمگارانہ جذبات مین جبکہ

---

[۱] عہد ظفر کے یہ سیاسی و تاریخی حالات مینے "جان ولیم کے" کی کتاب "تاریخ جنگ سپاہیان" سے لئے ہین جو تین جلدون مین ہے تاریخی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف نے بعض جگہ جیسی زہر افشانیان کی ہین، طنز آمیز لہجہ، اور حقارت انگیز طرز خطابت اختیار کیا ہے، وہ یہی نہین کہ ہندوستانی دماغون کے اندر ہیجان پیدا کرنے والے ہین بلکہ انگریزی سیاست کے بھی منافی ہین اور مین بہ آہنگ بلند کہہ سکتا ہون کہ مصنف نے یہ کتاب لکھکر انگریزی سیاسیات کو فایدہ پہونچانیکی بجائے نقصان پہونچانیکی کوشش کی ہے، مینے چاہا تھا کہ ظفر کے متعلق ہر پہلو سے بحث کر دن لیکن افسوس یہ ہے کہ مین پٹنہ کی اورینٹل لائبریری مین باوجود کاوش عہد ظفر کی تاریخی کتابین نہ پا سکا وہان اردو کی کتابین ایک تو یون بھی کم ہین، اور جو ہین انہین اس مقصد کی کتابین نہ مل سکین تاریخ اور ادب کی کتابونکی تدوین کے متعلق خاندان مغلیہ کو جو شرف ہے، وہ علمی دنیا سے مخفی نہین، لیکن عہد ظفر خاندان مغلیہ کا دور نزع تھا، وہان تاریخ اور شاعری کے متعلق کتابین کون لکھتا، بہت تلاش کے بعد "جام جم" مصنفہ سید احمد خان (قلمی نسخہ) انکشاف المخلوق مصنفہ منشی خادم علی سندیلوی اور اس انگریزی کتاب سے سیاسی اور تاریخی حالات مرتب کئے،

انسان بیجو دہو جاتا ہے، کہتا ہے، کہ "دلسلی نے اپنے رفقا سر جارج بارلی اور مسٹر ایڈمن اسٹون کے مشورہ سے ایک فہرست تجاویز مرتب کی جسکے ذریعہ بادشاہ کی وقعت ایک گڑیا سے زیادہ نہین رہی وہ بیک وقت ایک بادشاہ بھی تھا، اور انگریزون کے سیاسی مقاصد کے حصول کا ایک آلہ بھی، وہ کچھ تھا بھی اور کچھ نہین، اب وہ انگریزون کا ایک وظیفہ یاب تھا، وہ ہلوگون کے لئے "بازی عظیم" (Great game) کا ایک نمود اطمینان تھا، ہلوگون کو یہ دیکھکر تشفی تھی کہ بادشاہ ہمارے تصرف مین ہے، لیکن ساتھ ہی وہ ہلوگون کیلئے ایک کشمکش اور حیرت کی چیز بھی تھا، کہ کس طرح اس آلہ کو استعمال کرین لارڈ ولسلی کی حکومت کی سیاسی قابلیت کا تذکرہ کرتے ہوئے، وہ لکھتا ہے کہ یہ لارڈ ولسلی کی زبردست حکمت عملی تھی کہ اسنے صرف خاندان تیموریہ ہی نہین بلکہ اُنلوگون سے بھی مصالحت رکھی جو اس مسلمان شاہی خاندان سے ایک جذبہ احترام اور تعلق معززانہ رکھتے تھے لارڈ ولسلی کی تجاویز مین ایک تجویز یہ تھی کہ ریاستون پر جو اقتدار قایم کیا گیا ہے، اسکا ایک حصہ ہنوز بادشاہ سے متعلق رہے اور ان اضلاع کی آمدنی کے علاوہ جو اس تخت شاہی سے مخصوص تھی، بادشاہ اور اسکے خاندان کے لئے سالانہ ایک لاکھ پونڈ سے زیادہ وظیفہ مقرر کر دیا، اس طور سے کائنات کا سب سے بڑا بادشاہ، ہندوستان کا حکمران باایںہمہ کہ اسے حکومت بھی تھی اسکے مقبوضات بھی تھے حقیقتہً "جماعت تجار" کا ایک وظیفہ خوار ہو گیا، حالات نے ایسی صورتین اختیار کرلی تھین جو حکومت برطانیہ ہند کے فواید کی مویدہون، لیکن خطرات سے خالی نہ تھین، ان مصائب اور انحطاط کے باوجود بادشاہ کا نام قوت کا ایک ستون تھا اور لوگ پرچم شاہی کو ہنوز بہ نظر اعزاز واحترام دیکھتے تھے، لارڈ ولسلی نے اچھی طرح معلوم کر لیا کہ اگر حکومت مغلیہ کے یہ بقیہ آثار قایم رہے اگر شاہ عالم کو شاہجہان کے محل مین اس تمام اگلی شان شکوہ کے ساتھ ایک مسلمان آبادی کے درمیان مین جو ہنوز خاندان تیموریہ سے وفاداری کا جذبہ رکھتی تھی، چھوڑ دیا گیا تو ایک نہ ایک دن شاہ عالم کے کسی جانشین کی بدولت تباہ شدہ شہنشاہیت کی تعمیر جدید کی جد وجہد ہوگی جس سے ہلوگون کو نہایت پریشان کن تکالیف کا سامنا ہوگا، اسلئے تجویز کیا گیا کہ مونگیر شاہی خاندان کا مسکن قرار دیا جائے لیکن تبدیل مقام کے خیال سے ضعیف العمر بادشاہ کانپ گیا اور یہ لرزش خوف اسکے تمام خاندان، چھوٹے بڑے، مرد عورت، متعلقین اور محکومین مین سرایت کر گئی لارڈ ولسلی نے اب مزید ایذا رسانی سے باز رہکر انھین مورد عجز بنانا نہ چاہا، اور راضی ہو گیا کہ وہ دہلی محل مین سابق دستور رہین

دسمبر ۱۸۰۶ء مین شاہ عالم کا انتقال ہو گیا، اور اکبر شاہ اسکا جانشین مقرر ہوا، اسوقت انگریز افسر جو دہلی مین برطانوی حکومت کی نیابت کرتا تھا، قدیم طرز کا ایک درباری تھا، اور اسے اپنی نرمی کلام اور اوضاع سے کافی موقعہ تھا کہ دربار شہنشاہی پر خارجی اثر ڈال سکے، مسٹر سیٹن کو مرجانا قبول تھا لیکن وہ محل کے چھوٹے چھوٹے افراد کے احساسات کو مجروح کرنا نہین چاہتا تھا، چارلس مٹکاف نے لکھا کہ مین سٹین کے اس طرز عمل کو پسند نہین کرتا، جو انھون نے شاہی خاندان کے انتظام مین اختیار کیا ہے، مینے مانا کہ ایک برسر اقتدار شاہی خاندان کے زوال کے بعد عدل وانصاف، شفقت و رحمت کا اقتضا ہے کہ ایک مستحسن طرز عمل اختیار کیا جائے، لیکن سٹین کا خلق و رافت، انکا عجز محبت انکا اعتراف لطف اس تمام

شان و شکوہ کا خاتمہ کر رہا ہے جبکا برطانوی حکومت کے ایک نائب کو دہلی مین، جو صحیح معنی مین دہلی کا حکمران ہے، حاصل ہونا چاہیئے اس طور سے حمیت انسانی کے اظہار مین وہ ان شاہی جذبات کو بیدار کر رہے ہین جنھین ہمیشہ کیلئے ختم کر دینا چاہیے یہ تو ظاہر ہے کہ ہملوگ بادشاہ کو شہنشاہی اقتدار تفویض کرنا نہیں چاہتے، لیکن ساتھ ہی ہملوگون کو ایسی روش نہین اختیار کرنی چاہیے، کہ اسکے دل مین اسکے حصول کا حوصلہ پیدا ہو جائے، ہملوگ اسکے حالات کے مطابق اسکا احترام کرین ہملوگ ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکی اسکی آسایش کا خیال رکھین، اور جہانتک ممکن ہو وہ تمام ذرایع بہم پہونچائین جس سے وہ خوش خوش رہے، ساتھ ہی جب ہملوگونکی غرض غائی یہ نہین کہ پھر اسے وہی اگلی شہنشاہیت عطا کرین تو یہ ضروری ہے کہ ہملوگ یہ بھی مد نظر رکھین کہ اسے شہنشاہیت کا خواب دیکھنے کی بھی ترغیب نہو، ایک سفید مو ماہر سیاسیات بھی اس سے زیادہ معقول بات نہین لکھ سکتا، اور جب چند سال گذرنے کے بعد وہ دہلی مین ریذیڈنٹ مقرر ہوا، اور اسے مسائل کے حل و عقد کے اعلی اختیارات حاصل ہوئے تو اسکے لڑکپن کے خیالات اور بھی قوی ہو گئے اسے ایسے ایسے امور سے سامنا ہوا جو عقل اور انسانیت دونو اعتبار سے مجرمانہ تھے، لیکن نہ تو وہ خود اور نہ اسکے جانشین اس سے زیادہ کر سکتے تھے، کہ یکے بعد دیگرے ایسی تدبیر اختیار کرین کہ بتدریج ان خرابیون کا ازالہ ہو جائے جو انکے سامنے رونما تھین، وقت گزر گیا انگریزون کے بڑے بڑے مقبوضات محفوظ تھے، انھین کسی خارجی دشمن سے خوف نہ تھا اور وہ اپنے اندر ایک زبردست قوت کا احساس پانے لگے، کہ وہ ہر اس خطرہ سے سامنا کر سکتے ہین جس سے انھین سرزمین ہندوستان مین دوچار ہونا پڑے، انھون نے مضبوط اور جوانمردانہ قدم اوٹھایا، اب انھین ایک حکومت قایم کرنیکے خیال الگ رہنے کی ضرورت نہ تھی، ابتدائے صدی مین جو ایک خطرناک خیال معلوم ہوتا تھا اب ہملوگونکی پوزیشن کا ایک قطعی سانحہ کہا جا سکتا تھا لارڈ ولسلی کے زمانہ مین "بازی عظیم" نامکمل طور پر انجام پائی تھی اور دس سال کے بعد لارڈ ہیسٹنگس نے دیکھا کہ سمجھوتہ سے کوئی مفید نتایج مرتب نہوئے اور انھون نے ارادہ کر لیا کہ ہندوستان کی تمام سیاسی قوتون پر حکومت برطانیہ کا اقتدار قایم کر دین، وطن اور غیر ممالک دونو جگہ زمانہ بدل چکا تھا اور اسکے، ساتھ ہمارے احساسات مین تغیر ہو چکا تھا، یورپ مین ہماری کامیابیون نے ہملوگون کے اندر یہ یقین پیدا کر دیا تھا کہ ہملوگ ایک بڑی طاقتور قوم ہین، اور باوجودیکہ "لیڈن ہال" اسٹریٹ کے رہنما، مشرق مین ہماری تمام فوجی اور سیاسی توسیع کے خلاف صف بستہ تھے، لیکن یہ خیال تھا کہ اگر ہمین کامیابی ہوئی تو انگریزی قوم ہماری جوانمردانہ حکمت عملیہ کی داد دیگی، اس زمانہ سے انگلستان کے ہاتھ مین ہند کے شاہزادونکی قسمت کے فیصلہ کرنیکی باگ ڈور آگئی اب ہملوگون کو کوئی دریغ نہ تھا کہ ایک سب سے زبردست طاقت کی طرح اپنا طرز عمل اختیار کرین، ہماری تجاویز کا ایک اہم جزئیہ تھا کہ ہم سلطنت دہلی کے فسانہ کو مٹائین، اب مشرق مین لفظ "حکومت" کا الحاق صرف برطانیہ کے ساتھ ہو سکتا تھا اور "تسخیر شہنشاہیت" کے قایم رہنیکی ضرورت نہ تھی جسے ہملوگون نے اپنی سیاسی حکمت عملیون کے لئے پہلے ضروری خیال کیا تھا، یہ قابل بیان ہے کہ کس طرح تین سال کے درمیان مین آفتاب شہنشاہیت کی چمک مین ماندپڑتی گئی، کسطرح ایک گورنر جنرل اور اسکے بعد دوسرا مغلون کے متکبرانہ دعاوی کو مسترد کرتا گیا: اور خاندان

تیموریہ کے اُن اعزازات کو جنھوں نے عرصہ بعید تک اسکی شان و شکوہ قایم رکھا تھا، مٹاتا گیا، سنہ ۱۸۳۵ء مین ہندوستان کے سکہ مروجہ مین یہ تبدیلی واقع ہوئی کہ اسپر مغل بادشاہ کا نام و علامت کندہ نہین ہوتی تھی بلکہ اسکی جگہ ''سکہ کمپنی'' نے لی، یہ تمام صورتین ارباب محل کے پیش نظر تھین لیکن وہ لوگ انگریزون کے روز افزون اقتدار کے حاجتمند تھے، عظیم الشان محل جو بذات خود ایک بڑا شہر تھا، بہتیری قسم کی مکر دہات کا مخزن تھا، اور ایک مسیحی حکومت کو نسلاً بعد نسلٍ آزاد مرد اور بدسیرت عورتون سے تکلیف پہونچ رہی تھی، جو خود اپنے لئے بھی لعنت بنے ہوتے تھے اور دوسرون کیلئے بھی محکومانہ سرکاری الفاظ مین کہا جاتا تھا کہ شاہی خاندان کے افراد قانون کے قیود سے آزاد ہین، وہ کاہلی اور بد اطواری مین غرق رہتے، اور انھین عام راستے سے کوئی التفات نہ تھا، حقانیت کو بغیر چھپائے ہوئے کہا جا سکتا ہے، کہ محل کے مقامات مین اُن تمام جرایم کا ارتکاب ہوتا تھا جنکا رواج مشرق مین تھا، اور صرف خدا تعالی ہی اس ہولناک فہرست آزادی کا محاسبہ کر سکتا تھا، ۲۸ ستمبر سنہ ۱۸۳۷ء کی شام کو ۸۲ سال کی عمر مین اکبر شاہ نے وفات پائی، چند سال قبل اسنے اپنے ایک عزیز لڑکے کے لئے جائز شاہزادہ کی جانشینی کے خلاف خفیہ کارروائی کی تھی، اور اب شاہزادہ ابوظفر اس دور کی سرکاری اصطلاح مین ''ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی''[1] کے لقب سے سریر آرائے حکومت ہوا، وہ اسوقت عمر کا زیادہ حصہ گزار چکا تھا لیکن چونکہ ایک عرصہ سے صاحب حکومت خاندان کا رکن تھا، اسکی زندگی کی ساٹھ سال کی گزری ہوئی مدت نے اسپر برا اثر نہین ڈالا تھا، خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ایک خموش، کاہل انسان ہے، جسے صرف شاعری کا شغف ہے، اور اسے فطری طور پر سیاسی خفیہ کارروائیون سے کوئی علاقہ نہین، تاہم شہنشاہ کا خطاب ملتے ہی، اس نے شاہی وظیفہ میں جو اکبر شاہ کو دیا جاتا تھا اضافہ کے لئے اصرار کرنا شروع کیا، سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل پبلک کے روپیہ کی اتنی بربادی کرنی نہین چاہتے تھے، لیکن باوجودیکہ گورنر جنرل کو پورا یقین تھا کہ یہ روپیہ کی تضیع ہے، لیکن اس نے وعدہ کر لیا مگر اسکے لئے شرط پیش کی کہ بادشاہ کو ایک عہد نامہ کے ذریعہ یہ اقرار کرنا پڑیگا کہ وہ آیندہ برطانوی حکومت پر کسی قسم کے دعاوی نہین کرینگے، لیکن بہادر شاہ نے وہی کیا جو انکے والد نے قبل کیا تھا، انھون نے مجوزہ شرط کو ماننے سے انکار کر دیا، اور ہنوز یہ خیال کرتے رہے کہ وہ انگلستان مین ایک نائب بھیجکر جو کچھ چاہتے ہین بلکہ کسی قید و شرط کے حاصل کر لینگے اکبر شاہ نے مشہور برہمن رام موہن راؤ کو اپنا نائب مقرر کیا اور اپنے اسی قدیمی نشۂ حکومت مین انہین ''راجہ'' کا خطاب دیدیا لیکن انگریزی ارباب حل و عقد نے سرکاری طور پر ''راجہ'' کے خطاب کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، ہرچند وہ اس شخص کی سیرت کا بڑا احترام کرتے تھے، کیونکہ وہ شخص جہلا کو ایک معاشرتی اور مذہبی مصلح کی طرح روشن خیال بنانیکی کوشش

---

[1] ۲۶ شعبان سنہ ۱۱۸۳ھ مین قریب غروب آفتاب بہادر شاہ کی ولادت ہوئی تھی، دار السلطنت دہلی مین بہ عمر ترسٹھ ۶۳ سال دس ماہ شب جمعہ الجمادی الثانی کو سریر آرائے حکومت ہوئے، مولوی امام بخش صہبائی نے تاریخ کہی۔

از نشۂ دولت بہادر شاہی — بنشست بہ تخت دولت روز افزون
شد برزمی طرف باغ دہلی — نزہت بفزود دار تباع دہلی
تاریخ جلوس آن شہ والا قدر — آمد بہ لب خرد چراغ دہلی

(جام جم)

کر رہا تھا، مغل بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے رام موہن راؤ نے کوئی مفید کام انجام نہین دیا اور بہادر شاہ نے دیکھا کہ معاملات اسی حالت مین تھے جبکہ متوفی بادشاہ کی طرف سے راموہن راؤ نے انگلستان کا سفر اختیار کیا تھا، لیکن ابھی تک اسے یقین تھا کہ اگر کسی انگریز نائب کے ذریعہ انگلستان مین پیام رسانی کیجائے تو مفید ہو سکتی ہے، اسلئے جب انھون نے سنا کہ ایک فصیح و بلیغ خطیب جسنے رنگین اقوام کے حقوق کی نیابت کر کے مغربی دنیا مین بڑی شہرت حاصل کر لی تھی، ہندوستان مین آیا ہے، تو انھون نے اسے دہلی مین مدعو کیا، انکی خواہش ہوئی کہ اسے اس خدمت پر مامور کرین انھین اپنے بہت سے خیالی مصائب کی فریاد کرنی تھی لارڈ اڈنبرو نے ندرانہ پیش کرنیکا رواج ختم کر دیا تھا، یہانتک کہ ریذیڈنٹ کیلئے بھی اس قسم کا کوئی ہدیہ پیش کرنا ممنوع تھا، ندرانہ پہلے گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف پیش کرتا تھا، ۱۸۳۷ء تک بہادر شاہ کی تخت نشینی تک موخر الذکر عہدہ دار یہ عمل کرتا رہا ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء کے موسم سرما مین لارڈ اڈنبرو کے ناظمون نے بادشاہ کو ندرانہ پیش کیا گورنر جنرل کو اسکی خبر نہ تھی، جب اسے خبر ہوئی تو وہ نہایت متعجب ہوا، اور پھر اپنے ناظمون پر خفگی کی، اور ہمیشہ کیلئے ندرانہ پیش کرنیکی رسم کو اوٹھا دیا، اس طور سے خاندان تیموریہ کی آخری شاہانہ شان بھی انگلستانی حکومت کے زیر اثر جاتی رہی[۱] ہر چند اسکے معاوضہ مین روپیہ دیا جاتا تھا، لیکن بادشاہ کے دماغ کو یہ تغیر بھی تکلیف دے رہا تھا، کمپنی نے کسی مزید وظیفہ کے تقرر سے اسوقت تک کے لئے انکار کر دیا جب تک شاہی خاندان اُن مفصلہ شرائط کو منظور نہ کرلے، حقیقتاً کوئی سبب بھی نہ تھا کہ وظیفہ بڑھایا جائے، ایک لاکھ روپیہ ماہانہ کافی تھا، اس ماہانہ لاکھ روپیہ کے وظیفہ کے علاوہ بہادر شاہ کو بعض شاہی اراضی کی آمدنی بھی تھی، اور انہین شہر سے بعض جایداد کا کرایہ بھی آتا تھا[۲]

بہادر شاہ کو برطانوی حکومت سے کوئی گلہ نہ تھا، اور غالبًا بادشاہ کامل قناعت نہین تو ایک مطیعانہ امن کے ساتھ اس حالت مین بسر کرتے، لیکن حرم کی خفیہ ریشہ دوانیون نے جنکا ہر مشرقی بادشاہ شکار رہوا کرتا ہے، بہادر شاہ کو بھی زیر اثر کر لیا تھا انھون نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کر لی تھی، اور پیری مین انھین اس سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا تھا، وہ عورت خیر و شر کے متعلق بادشاہ پر اثر رکھتی تھی، جیسا کہ ہوتا چلا آیا ہے، نواب زینت محل کے زیر اثر بادشاہ نے کوشش شروع کی، کہ حقیقی جانشین کا حق مسترد کر کے اس بچے شہزادہ کو اپنا جانشین مقرر کر دے، جیسا کہ اکبر شاہ نے خود بہادر شاہ کے خلاف کیا تھا اسی طرح انہے بھی یہ نامنصفانہ طرز عمل اختیار کیا تاکہ اسکی محبوبہ کو تسلی ہو، لیکن اسمین بادشاہ کو جلدی کرنے مین ناکامی کا خطرہ تھا اسے بہتر یہی سمجھا کہ جب تک بچہ جوان بخت، جوان نہ ہولے موقعہ کا انتظار کیا جائے۔

**جانشینی کا قصہ** ۱۸۴۹ء مین شہزادہ دارابخت وارث تخت نے وفات پائی، اسوقت بہادر شاہ کے ستر سے زیادہ بیٹے تھے

---

[۱] "ولیم کے" نے اس منظر کا نہایت دلچسپ مرقع پیش کیا ہے، جبکہ دو انگریز افسر بہادر شاہ کو ندرانہ دینے گئے ہین، ان مین ایک انگریز کا بیان ہے کہ اسکے باوجود ردعمل خاندان تیموریہ کے اس آخری نشیمن جلال مین جسوقت قدم رکھا، تو اس پر ایک خاص قسم کا رعب و ہیبت طاری تھا، یہ آخری ندرانہ تھا جو مغل خاندان کے اس آخری فرمانروا کو برطانیہ کی طرف سے دیا گیا، (تاریخ جنگ سپاہیان جلد ۲) [۲] مسٹر سنڈر کی شہادت بابت مقدمہ بہادر شاہ

جانشینی کے سوال نے گورنر جنرل کو بہت تکلیف پہونچائی، لارڈ ڈلہاوزی ایسا نہ تھا کہ مغل بادشاہ کی اس تمسخرانہ بادشاہت کو تسلیم کرتا، اسکے سامنے دوسرے لوگ تھے جو قدیم شاہی خاندان کی روایات پر زیادہ متاثر تھے اور وہ غم و ملال کیساتھ اس حالت کی برقراری چاہتے تھے، جسکے خلاف عقل و حقانیت بغاوت کر رہی تھی، "بہادر شاہ کی وفات کے بعد "شاہ دہلی" کے خطابی شکوہ کے متعلق "ایسٹ انڈیا کمپنی" میں مباحث ہوئے، اگست ۱۸۴۷ء میں "مجلس رہنمایان" نے یہ خیال ظاہر کیا، گورنر جنرل نے ایجنٹ کو ہدایات بھیجی ہیں کہ شاہ دہلی کی وفات کے بعد اسکے جانشین کے اس خطاب کے اختیار کرنے پر کوئی ایسا قدم نہ بڑھایا جائے، جو اس خطاب کے تسلیم کرنے پر مشتمل ہو، اگر ان ہدایات میں خطاب کے مسترد کرنے کا خیال ظاہر کیا جاویگا تو ہملوگ اسے منظور نہیں کرینگے، جب تک ہملوگوں کو تمھاری طرف سے بیشتر معلومات نہ موصول ہوں اور جب تک ہملوگوں کو اس خلاصہ سفارشات پر جو پیش کیا جاویگا غور و فکر کرنے کا وقت نہ ملے، اس تجویز سے لیڈن ہال چیمبر میں مختلف جماعتیں ہوگئیں اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی عملی قدم بڑھانے میں دیر ہوئی، ڈلہاوزی نے دیکھا کہ مسئلہ اسوقت تک کیلیے لاینحل رہا جب تک ہندوستان سے آیندہ مشورے نہ ارسال کئے جائیں، دارا بخت کی وفات نے مسئلہ کے طے پانے کا موقعہ دیا جس سے ڈلہاوزی جیسے مزاج کا آدمی چوک نہیں سکتا تھا؛ دوسرا جانشین اسلامی قانون کے مطابق شاہزادہ فخر الدین ہوتا تھا جسکی عمر اسوقت تیس سال کی تھی، اور وہ یوروپین سوسائٹی کا شایق اور برطانوی حکومت کا روادار تھا، اسکے ذریعہ لارڈ ڈلہاوزی تغیرات پیدا کرنا چاہتا تھا

## ڈلہاوزی کی تدابیر

برطانوی حکومت سہولت کے ساتھ وقت کا انتظار کرتی تھی دارا بخت وہ اخیر شہزادہ تھا جو مغلیہ خاندان کی حکمرانی کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا اسے خیال تھا کہ دہلی کی بادشاہت کا مالک ہوگا، اسوقت ان امیدوں اور آرزوؤں کے مٹانے میں بڑی دقت ہوتی۔ فخر الدین ایک وظیفہ خوار پیدا ہوا تھا اسے اسوقت کی یاد نہ تھی جبکہ دہلی کا بادشاہ تخت پر بیٹھتا، اور وہ اسوقت تک ہندوستان میں سب سے زبردست اقتدار رکھتا تھا برطانوی حکومت کے اغراض اور مصالح ملکی کے خلاف یوں تو بہت سی باتیں قابل اصلاح تھیں، لیکن دو مسائل بہت اہمیت رکھتے، تھے، خاندان مغلیہ میں لقب "شاہ" کا استقلال، اور شاہی محل پر انکا قبضہ۔ لارڈ ڈلہاوزی ان مسائل کی اہمیت سے ناواقف نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ بہادر شاہ کے بعد "شاہ" کا خطاب اس خاندان میں باقی نہ رہے، اور شاہی محل پر انگریزوں کا تصرف ہو جائے۔

لارڈ ڈلہاوزی نے اپنے دور حکومت ہی میں "عدالت رہنمایان کی مجلس مخفیہ" کو لکھا کہ اب ضرورت ہے کہ حکومت کی طرف سے ایسے احکام جاری ہوں، جنکے ماتحت موجودہ بادشاہ کے بعد اسکے جانشین کو شاہ کا لقب اختیار کرنیکا حق نہ رہے دوسرا حکم انکے نقل مکان کے متعلق ہونا چاہئے، ڈلہاوزی کی تجویز تھی کہ شاہی خاندان اب "قطب" میں جا رہے، اور شاہی محل پر انگریزوں کا قبضہ ہو، اگر بادشاہ ان تجاویز کو نہ مانیں تو وظیفہ بند کر دیا جائے، ان تجاویز پر دلچسپ مباحث ہوئے بورڈ نے ڈلہاوزی کے نظریات کی تائید کی، لیکن "مجلس رہنمایان" نے اختلاف کیا اور بتایا کہ یہ تجاویز صرف گورنر جنرل نے ارسال کی ہیں، مجلس شوریٰ کی رائیں اس پر ثبت نہیں، بورڈ نے جواب دیا کہ اسکی ضرورت نہیں تھی، بورڈ نے دکھلایا کہ گورنر جنرل

لکھتا ہے کہ ہر چند خاندان تیموریہ سے کوئی خدشہ نہیں لیکن جب مسلمان باشندے جوش میں آکر برطانوی اقتدار کو صدمہ پہونچانا چاہیں تو انکے لئے اسباب موجود رہیں، ایک بادشاہ ہے ایک مستحکم قلعہ ہے، اس رد و کد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بورڈ نے آخری فیصلہ یہ کیا کہ قلعہ سے شاہی خاندان کا اخراج مستحسن نہیں، لارڈ ڈلہاؤزی کو یہ خط ابتدائے موسم بہار ۱۸۵۴ء میں موصول ہوا، خط پانے کے بعد اسنے لکھا کہ ہر چند میرا اساسی عقیدہ ان مرسلہ نظریات کے متعلق پہلے بھی وہی تھا اور اب بھی ہے، لیکن جب انگلستان کے ارباب حل و عقد نے، جن کے خیالات کو ہندوستانی سیاسیات کے متعلق بہت اہمیت ہے، اپنی تشویش اور خطرہ کا اظہار کیا ہے، تو یہ تجویز ابھی عمل میں نہیں لائی جاویگی

**محل کی ریشہ دوانیاں**

بادشاہ نے شاہزادہ فخر الدین کی جانشینی کے متعلق احتجاج کیا، اپنی بیوی زینت محل کے زیر اثر انھوں نے اسکے لڑکے کے لئے جو اسوقت گیارہ سال کا ایک بچہ تھا جانشینی کی رائے ظاہر کی، بادشاہ نے جو اسباب عذر پیش کئے تھے، انمیں ایک نہایت دلچسپ عذر یہ تھا کہ شاہزادہ فخر الدین مختون تھا، اسلئے خاندان تیموریہ کی روایات کے مطابق کہ کوئی شخص جسکا کوئی عضو کٹا ہو تخت نشین نہیں ہو سکتا، فخر الدین سلطنت کا حقدار نہیں، ہمایوں کے وقت تک سلاطین مغلیہ مختون تھے، لیکن یہ رسم بعد میں منقطع ہو گئی، بعض جسمانی علت کے اعتبار سے فخر الدین کیساتھ یہ استثنا تھا، اور زینت محل کو ایک بہانہ ملگیا، جانشینی کے سوال کے متعلق انگریزی ماہرین سیاست کا یہ متفقہ فیصلہ ہو گیا کہ بادشاہ کی حیات تک تمام امور غیر متغیر رہیں، شاہزادہ فخر الدین نائب بادشاہ متصور ہو، لیکن اسکے حریف مقابل سے اگر یہ فایدہ حاصل ہو کہ وہ شاہی محل کو چھوڑ کر قطب میں جا رہے، تو موقعہ ہاتھ سے نہ دیا جائے اگرچہ وظیفہ میں اضافہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

**برطانوی حکومت اور فخر الدین سے وہ معاہدہ**

سرکاری ہدایات کے مطابق دہلی کے ایجنٹ سر ٹامس مٹکاف نے شہزادہ فخر الدین سے خفیہ ملاقات کی، اور انکے سامنے یہ تجویز پیش ہوئی کہ اگر وہ ایک عہدنامہ کے ذریعہ اس امر پر راضی ہو جائے کہ بادشاہ کا جانشین ہونیکے بعد شاہی محل سے دست بردار ہو کر "قطب" میں اپنا مقام سکونت منتقل کر دیگا تو انگریز جانشینی کے مسئلہ میں اسکی طرفداری کرینگے، شہزادہ نے یہ تجویز منظور کر لی، ایک عہد نامہ مرتب ہوا، شہزادہ نے اسپر دستخط کیا تو گوگی شہادتیں ثبت ہوئیں، جب یہ خبر قلعہ میں پہونچی تو لوگ بہت متاثر ہوئے، اور خصوصیت کے ساتھ ملکہ زینت محل کو زیادہ رنج ہوا

**فخر الدین کی ناگہانی وفات**

۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء میں فخر الدین نے مرض استفراغ سے اچانک انتقال کیا، قرائن بتاتے ہیں انہیں زہر دیا گیا، شاہی حکیم احسان اللہ کو بلایا گیا لیکن وہ نہ آسکے یا، انہوں نے آنے میں حیلہ حوالہ کیا، نتائج سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ رات ملکہ زینت محل کے کمروں میں کس طرح بسر ہوئی ہوگی، یقیناً یہ رات ریشہ دوانی اور عمل سازی کی رات ہوگی، دوسرے دن سر ٹامس مٹکاف ملنے آیا تو بادشاہ نے ایک رقعہ دیا جسمیں شہزادہ جوان بخت کی جانشینی کے متعلق حکومت برطانیہ سے استرضا کیا گیا تھا، اسمیں بادشاہ کے دوسرے لڑکوں کے دستخط بھی مندرج تھے اسکا خلاصہ یہ تھا کہ زینت محل

کالڑکا جوان بخت، عقل، خوبی علم اور عادات وخصایل کے اعتبار سے بادشاہ کا جانشین بننے کا مستحق ہے،" اسمین شاہی خاندان کے آٹھ شاہزادونکی مہر تھی، لیکن دوسرے دن مرزا قریش بڑے لڑکے نے حکومت برطانیہ مین ایک یادداشت (میموریل) بھیجی کہ بادشاہ نے شاہزادونکو لالچ دلائی تھی کہ اگر وہ دستخط کرینگے تو انکا وظیفہ بڑھادیا جاویگا، ورنہ بند کردیا جاویگا، بادشاہ نے مرزا قریش کو بھی کچھ دیکر راضی کرلینا چاہا، مرزا نے ایک مطیع اولاد کی حیثیت سے بادشاہ کے ان تمام خواہشات کو قبول کرنا چاہا اگر وہ اسے جانشین مقرر کرین لیکن جب اس نے دیکھا کہ زینت محل کے اغوا سے بادشاہ تلے ہوئے ہین کہ اسے جانشینی سے محروم کردین تو اسنے حکومت برطانیہ مین ایک یادداشت بھیجی، اور دکھلایا کہ مین سب سے بڑا ہون، میننے حج کیا ہے، حافظ قرآن ہون، اور ملاقات کے وقت میری بقیہ استعداد معلوم ہوسکتی ہے

## لارڈ کیننگ کے نظریات سیاسی

لارڈ ڈلہاؤزی نے جو سیاسی طرز عمل اختیار کیا تھا، نہایت مدبرانہ تھا ہر چند انکا یہ عقیدہ غلط تھا کہ دہلی کے مسلمان خاندان تیموریہ سے کوئی قلبی علاقہ نہین رکھتے اور انکا یہ بھی خیال غلط تھا کہ اگر شاہی خاندان کو شاہی محل سے قطب مین منتقل کردیا جائے تو مسلمان غیر متاثر رہینگے لیکن اثر آفرین ہے کہ انھون نے باوجود اقتدار، اپنے نظریات سیاسی کو، جب ان سے بالادست ارباب حل وعقد نے اختلاف کیا تو جامہ عمل نہین پہنایا، لارڈ کیننگ نے خیال کیا کہ قلعہ کا خاندان تیموریہ کے قبضہ مین رہنا نہایت خطرناک ہے، اسے برطانیہ کے قبضہ مین رہنا چاہیے جسمین سپاہ اور آلات حرب کا ذخیرہ جمع رہے، چونکہ لارڈ کیننگ کو ہندوستان مین آئے ہوئے ابھی چند ماہ گزرے تھے اور وہ بھی کلکتہ مین، لہذا وہ مسلمانان دہلی کے احساسات سے ناواقف تھے، بنابرین انھون نے خیال ظاہر کیا کہ بتدریج دہلی کے "تسخیر بادشاہت" سے تمام اختیارات سلب کرلئے گئے، "شاہ" کا لقب بھی چھین کر کیون نہ خاندان تیموریہ کی شاہانہ عظمت کا خاتمہ کردیا جائے، اسنے مرزا قریش کی جانشینی کے لئے مجلس ارباب حل وعقد سے سفارش کی، کاؤنسل نے گورنر جنرل کے مراسلہ پر غور وفکر کرنیکے بعد مفصلہ ذیل ہدایات ارسال کین،

(۱) - دہلی ایجنسی کے ذریعہ بادشاہ کو یہ جواب دیا جائے کہ گورنر جنرل مرزا جوان بخت کی جانشینی قبول نہین کرسکتا

(۲) - مرزا قریش کو بھی یہ امید نہین رکھنی چاہیے کہ انکی جانشینی ان شرائط پر منظور کیجاویگی جن پر مرزا فخرالدین سے معاہدہ ہوا تھا اور یہ کہ مسئلہ جانشینی کے متعلق بادشاہ کی زندگی تک حکومت کے ساتھ کوئی نامہ وپیام نہ ہوگا

(۳) - بادشاہ کی وفات کے بعد مرزا قریش جانشین ہونگے، اور انکے ساتھ وہی شرائط ملحوظ رہینگی، جو فخرالدین کے ساتھ تھین لیکن انہین بادشاہ کے لقب کے بجائے "شاہزادہ" کا لقب اختیار کرنا ہوگا، ساتھ ہی یہ بھی تحریری اقرار یا معاہدہ کی صورت مین نہین پیش کیا جائے، بلکہ یہ کہا جائے کہ حکومت کا یہ ارادہ راسخ ہے، کہ ایسا ہی ہو

(۴) محل کے ان افراد کی ایک فہرست مانگی جائے، جنھین وظیفہ دیا جاتا ہے، اور یہ کہ وظیفہ کہانتک محدود رہیگا، بیٹے اور پوتے تک؟ لیکن کسی بادشاہ کے دور کے رشتہ دار اسکے مستحق نہ ہونگے،

(۵) مقررہ وظیفہ مین سے پندرہ ہزار سالانہ شاہی خاندان کے وارث کو ملیگا

## زینت محل کی خفیہ کارروائیان

بادشاہ اپنی زندگی کی بقیہ گھڑیان اطمینان اور امن سے گزار دیتا، لیکن ملکہ زینت محل کی ریشہ دوانی نے اسے کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اسنے کبھی یہ امید منقطع نہین کی کہ میرا لڑکا دہلی کا بادشاہ ہوگا ایک پردہ حایل تھا وہ موت سے دور ہو گیا دوسرا بھی اسی طرح دور ہو جاویگا اگر حکومت برطانیہ نے جوان بخت کی جانشینی کو تسلیم نہین کیا تو دوسری زبردست قوتون سے استمداد کیا جائے، بادشاہ کو اسمین اغماض نہ تھا کہ وہ شاہی محل کو چھوڑ دے اور نہ اسے اپنے جانشین کے فواید سے چندان دلچسپی تھی، جیسا کہ بادشاہ کے مقدمہ مین حکیم احسان اللہ کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے، لیکن زینت محل کی ریشہ دوانیون نے اسے روکا، جب فخر الدین نے شاہی محل کو چھوڑ دینے کی شرط پر دستخط کر دی تو باوجود اسکے کہ وہ اس "نام بادشاہ" سے نفرت رکھتی تھی لیکن اسنے شور و شغب برپا کیا، وہ جانتی تھی کہ فخر الدین کوئی غیر فانی ہستی تو ہے نہین ؟ اس عرصہ مین وہ شاہزادہ جسکے ساتھ انگریزون کے خلاف نفرت کا جذبہ پرورش کر رہا تھا، وہ انگریز رعایا کے سامنے بھی یہ کہنے سے باز نہین آتا تھا کہ مین تھوڑے عرصہ مین انگریز قوم کو اپنے قدمون کے سامنے جھکا ہوا دیکھونگا، مسز فلیمنگ ایک انگریز سرجنٹ کی بیوی قلعہ مین گئی تھی، اسکی لڑکی مسز ایسکلی بھی اسکے ساتھ تھی جوان بخت نے اس لڑکی کے سامنے بھی انگریزون کے مقابلہ مین اپنی فتح و نصرت کا نغمہ گایا لڑکی نے مان سے شکایت کی، کہ یہ نوعمر بدمعاش اس قسم کے خیالات ظاہر کرتا ہے اسپر انگریز خاتون نے کہا کہ اگر تمھارے خیالات ایسے ہین تو سب سے پہلے تمھاری گردن ماری جاویگی، شاہزادہ جوان بخت اس قسم کے خیالات اکثر غور تو کی محفلون مین ظاہر کیا کرتا تھا، اور جب سرجنٹ کی بیوی نے خشمگین لہجہ مین اسے یہ جواب دیا تو وہ کہنے لگا کہ اہل ایران آرہے ہین مان بیٹی کو ہم لوگ قلعہ مین پناہ دینگے، اور اسی طرح اکثر باتین بنا دیا کرتا تھا مختصر امین اسے اپنی مان سے یہی تعلیم مل رہی تھی، اور وہ انھین احساسات کے ساتھ نشو و نما پا رہا تھا

ہر چند دہلی یا اسکے باہر سلمانون کو اس سے دلچسپی نہین تھی کہ کون شاہزادہ جانشین ہوگا لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اہل محل کی پیہم کوششین جاری تھین کہ مسلمانون مین یہ خیال پیدا کرین کہ عالم غیب سے کوئی ایسا آدمی پیدا ہونے والا ہے، جو خاندان دہلی کی زوال پذیر حکومت کو پھر برسر عروج لاویگا، اور ہندوستان کے مسلمانون کو پھر وہ دولت اور عزت حاصل ہوگی جس سے انگریزون کے غصب کے باعث وہ محروم ہو گئے ہین

## احساسات دہلی

دہلی مین اخبارات نے پیشین گوئی کرنی شروع کی کہ ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہونے والا ہے جس سے انگریزی سیاسیات کو نقصان پہونچیگا، اہل فارس ہندوستان پر حملہ آور ہونگے، ایک مرتبہ شور ہوا کہ ایرانی اٹک تک آ چلے ہین دوسری خبر یہ پھیلی کہ ایرانی فوج درہ بولن کو طے کرتی ہوئی آرہی ہے، اور اس حملہ کی توجیہ یہ کی گئی کہ شاہ فارس پانچ پشت سے فوج اور سامان حرب جمع کر رہا تھا تاکہ ہندوستان کو فتح کرے، زار روس شاہ کا ساتھ دیگا، اور تقریباً پچاس ہزار روسی فوج مع سامان حرب اہل فارس کی مدد کے لئے پہونچ گئی ہے، اور اگر یہ فوج کافی نہین ثابت ہوئی تو روس سے مزید کمک

آدیگی، اس صورت حال میں اترکی، اور فرانس کا طرز عمل ظاہر ہے، وہ بھی شاہ کا ساتھ دینگے، بعض اخبارات کا یہ نظریہ تھا کہ دوست محمد خان امیر کابل ہر چند انگریزون کا وظیفہ خوار اور ظاہری دوست ہے، لیکن وہ بھی دو نو طریق عمل اختیار کریگا کفار سے معرکہ آرائی اور فارس کے ساتھ قسمت آزمائی، بازار، گلی کوچہ دوکان اور شاہی محل تمام مقامات مین ایک سنسنی پھیلی ہوئی تھی، شہر، ہیبت و استعجاب کا ایک مجسمہ بنا ہوا تھا اور شاہ نعمت اللہؒ کی اس پیشینگوئی نے اور بھی اس سنسنی خیز خبر کو مستحکم کر دیا تھا کہ ایک سو برس کے بعد انگریزونکو زوال ہوگا اور ایک مقامی شاہی خاندان برسر اقتدار ہو جائیگا۔

بادشاہ اور شاہ فارس کے سیاسی تعلقات کے متعلق ایک مقامی نامہ نگار نے مارچ ۱۸۵۷ء مین شمالی مغربی صوبجات کے لفٹنٹ گورنر کو اطلاع دی کہ شاہی محل اور خصوصیت کے ساتھ بادشاہ کے خاص کمرون مین، شبانہ روز اہل فارس کی آمد کا چرچہ رہتا ہے، حسن عسکری نامی ایک شخص تھا اسکے خاندان مین پیری مریدی کا سلسلہ تھا، شاہی محل کے دہلی دروازہ کے نزدیک اسکا مکان تھا ایرانی حکومت کے ساتھ سیاسی تعلق کرنے کے لئے یہ شخص ہمیشہ مستعد رہا کرتا تھا اسنے بادشاہ کو متاثر کر لیا کہ اسے کشف کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ ایرانی حکومت، دہلی بلکہ تمام ہندوستان مین وسیع ہو جائیگی اور دہلی کی بادشاہت کو ازسر نو عروج ہوگا کیونکہ شاہ فارس پھر دہلی حکومت کو تاج و تخت عطا کر دیگا، تمام اہل محل خصوصیت کے ساتھ بادشاہ بہت مسرور ہین یہانتک کہ اسکے لئے نماز پڑھی جاتی ہے، حسن عسکری غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل روزانہ "عمل" (ریاضت) کیا کرتا ہے، تاکہ اہل فارس جلد آوین اور انگریزونکو نکالین"، لفٹنٹ گورنر جنرل کالون نے جب یہ خط پایا تو مضحکہ اور حقارت سے دیکھکر بے توجہی کیسا تھا اسے ڈالدیا اسنے واقعہ کی اہمیت پر نظر نہین ڈالی، ہر چند شاہ فارس کیساتھ شاہ دہلی کا سیاسی تعلق ہو یا نہو شمالی ہند کے مسلمانون کا خیال تھا کہ یہ خبر صحیح ہے لیکن اس خبر سے عام باشندون مین جو سنسنی اور احساس پیدا ہو رہا تھا، وہ نہایت اہم تھا انگریز مدبرین کا یہ نقص تھا کہ وہ اپنے اندر ان لوگون کے وجدان کا صحیح اندازہ لگانیکی اہلیت نہین رکھتے تھے، جو انکے اردگرد رہتے تھے بادشاہ اور شاہ فارس کے نامہ و پیام کا قصہ محض کہانی نہین تھا، ہر چند اسکے متعلق صحیح واقعات نہین ملتے کہ کوئی صحیح نتیجہ نکالا جاسکے لیکن بہادر شاہ کے مقدمہ مین جو گواہ گزرے انمین سب سے معتبر گواہ احسان اللہ شاہی حکیم کی روایت یہ ہے کہ بادشاہ نے خواہ اپنے ذاتی خیال کی بنا پر یا اپنے بعض رشتہ دارونکی تحریک سے جو اودھ مین سکونت رکھتے تھے، شیعہ مذہب اختیار کرنا چاہا، مرزا حیدر جو بادشاہ کا بھتیجہ، اور اودھ مین سکونت رکھتا تھا دہلی مین آیا اور جب واپس گیا تو یہ خبر شایع کی کہ بہت تغیر ہو گیا ہے، مغل بھی شیعہ مذہب اختیار کرنے چاہتے ہین ممکن ہے، بادشاہ کو ترغیب دیگئی ہو کہ انکے تبدیل مذہب کی خبر سے بادشاہ اودھ اور شاہ فارس اور بھی برضا و رغبت مدد کرینگے چونکہ بادشاہ جانشینی کے متعلق اپنی بیوی کی خواہش پوری نہین کر سکتا تھا لہذا ممکن ہے اسنے یہ پہلو اختیار کیا ہو کہا جاتا ہے کہ اسنے شاہ فارس کو اپنے معتبر کارپردازون کے ذریعہ خطوط لکھے، شبہ ہے کہ اسنے زار روس کو بھی خطوط لکھے لیکن یہ پہونچے نہین،

اسی طرح ایکدن دہلی جامع مسجد کے دروازہ پر ایک اشتہار چسپان تھا جسکا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ فارس نے مسلمانان ہند کو

خطاب کیا ہے کہ ایک ایرانی فوج آرہی ہے، اور ہندوستان کے مسلمانون کا فرض ہے کہ اس فوج سے بازو ملا کر کفار کے مقابلہ مین جنگ کرین، معلن کا نام محمد صادق تھا لیکن پتہ نہین لگا کہ یہ محمد صادق ہے کون شخص عوام پر اسکا کوئی اثر نہوا، کیونکہ چسپان ہونیکے چند ساعت کے بعد پھاڑ دیا گیا، لیکن مقامی اخبارون نے اس اشتہار کا خلاصہ شایع کر دیا، بہادر شاہ نے ابتدائے موسم بہار ۱۸۵۷ء مین کوئی عملی قدم نہین اوٹھایا، بلکہ انکے نام سے لوگوان نے شور و فتنہ بپا کیا جسکا خمیازہ انھین اوٹھانا پڑا، مئی ۱۸۵۷ء مین میرٹھ کے اندر سپاہیون مین بڑا جوش و خروش پیدا ہوا اور دہلی کے ملکی افسرون کو دعوت دیگئی کہ وہ آنیوالی کشمکش مین حصہ لین،

اسکے بعد سیاسیات ہند مین وہ نازک حالتین پیدا ہوگئین جنھون نے مغل خاندان کو "قطب" کی بجائے ہندوستان کے مختلف مقامات مین کا المجراد المنتشی بنادیا، اور اب نہ تو شاہی محل کے خالی کرنیکا کوئی سوال باقی رہا اور نہ کسی شاہزادہ سے "شاہ" کے ترک لقب کیلئے عہد نامہ کی ضرورت، خاندان مغل کا یہ بدقسمت فرمانروا ایک ملزم کی حیثیت سے برطانوی عدالت مین پیش ہوا، اور اسے رنگون مین زندگی کی بقیہ تکلیف وہ ساعتین تمام کرنی پڑین، غالب مرحوم اسوقت زندہ تھے، غالباً طلسم ہستی کے اسی دردانگیز منظر کو دیکھکر انھون نے کہا تھا،

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد  شمع بجھتی ہے تو اس مین سے دھوان اوٹھتا ہے

عبدالمالک آروی

# ایک غلطی کا ازالہ

دسمبر میں جو نظم "ترانۂ کابل" کے عنوان سے شایع ہوئی ہے، اسکے مصنف ہمارے عزیز دوست اختر شیرانی ہیں، غلطی سے محمود شیرانی لکھی گیا۔


# پنجاب میں اردو

جسپر نگار میں ریویو شایع ہوچکا، اس کے ملنے کا پتہ یہ ہے:۔

قیمت ؏ — جناب اختر شیرانی - ۱۸ فلیمنگ روڈ - لاہور۔

# دربار ظفر اور عہد ظفر کے شعراء

شاہانِ مغلیہ صرف اپنی فتوحات، نظم و نسق حکومت اور تسخیر ممالک ہی کے لئے مشہور نہین ہین۔ بلکہ دنیائے علم و ادب کی جو خدمتین ان شہنشاہانِ ہند نے کین ہین۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہین۔ بابر کا آفتاب شہرت آجتک بام علم و ادب پر درخشان ہے۔ اسکی "توزک" اس کی شاعری اور خوش نویسی شہرۂ آفاق ہے۔ ہمایون بھی ایک بڑا ادیب تھا۔ اور اسکی ہمشیرہ گلبدن بیگم نے اپنی مشہور عالم کتاب "ہمایون نامہ" لکھ کر صرف اپنی تاریخ دانی ہی کا نہین بلکہ اپنے ذوق ادب کا بھی کافی ثبوت دیا ہے

اکبر جہانگیر اور شاہجہان کے زمانہ مین فارسی شاعری نے جو عروج پایا وہ کسی سے مخفی نہین۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ فیضی نظیری۔ عرفی۔ طالب آملی اور کلیم جیسے اساتذۂ فن دربار مغلیہ کے وظیفہ خوار تھے۔ اور سخن شناس اور علم دوست بادشاہ اور امراء ان شعراء کے حوصلے گران قدر انعامات اور بیش بہا خلعت سے بڑھاتے تھے۔ مگر افسوس کہ یہ درباری سلسلۂ شعر و شاعری اورنگ زیب کے وقت مین منقطع ہوگیا۔ اور چونکہ اورنگ زیب کے جانشینون کو حادثاتِ زمانہ کی باد مخالف نے چین نہ لینے دیا لہذا یہ برہم شدہ مجلس پھر سے ترتیب نہ پا سکی۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ملک مین ہر طرف شورش برپا تھی، طوائف الملوکی کا زور تھا۔ سلطنت مغلیہ کا شیرازہ اجزائے پریشان کی طرح منتشر ہو چکا تھا۔ دکن مین مرہٹہ زور پکڑ چکے تھے۔ اور تمام ملک ہند کو اپنی لوٹ مار سے تاخت و تاراج کر رہے تھے۔ بنگال اور مدراس مین انگریز اور فرانسیسی اپنے قدم جما رہے تھے۔ اس پر آشوب زمانہ مین عروسِ ادب عالم جان کنی مین اپنی لازوال ہستی کی آخری سانسین لے رہی تھی۔ اب پھر اُس کو خاندانِ مغلیہ کے آخری بادشاہون نے خضر صفت ہو کر اپنے ہاتھ سے آبِ حیات پلا کر صحت بخشی۔ مگر اب اس نے اپنا فارسی لباس اُتار کر اردو کا وہ جامۂ بوقلمون زیب تن کیا، جو اپنے محاسن گوناگون کے لئے محمد شاہ۔ شاہ عالم۔ مرزا سلیمان شکوہ۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کا رہین منت ہے۔

آخر الذکر بادشاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر اپنی اُردو نوازی مین سب سے بازی لے گئے۔ تخت مغلیہ کا آخری تاجدار آسمانِ شاعری پر ایسا نیر اعظم ہو کر چمکا کہ جس کی ضوفشانی سے تمام ستارے ماند پڑ گئے۔ اس نے شعر و شاعری مین ایک زبردست روح پھونکدی۔ اور ادب اُردو مین ایک اہم انقلاب پیدا کر دیا۔ ان کی سخن پروری کی بدولت عوام مین شاعری نے اسقدر زور پکڑا کہ دلی کی گلیون کا ہر طفل دبستان اپنے آپ کو میر سودا مصحفی اور انشا کا ہمسر سمجھنے لگا ظفر کے ذوق شوق کا وہ عالم تھا کہ قلعہ معلی اردو شاعری کا سرچشمہ بن گیا۔ یہان کی ادبی مجلسون اور مشاعرون کی گرماگرمی نے اردو شاعری کو درجہ کمال پر پہونچا دیا۔ ظفر کو اوائل عمر ہی سے شاعری سے ایک خاص لگاؤ تھا

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ انھیں تو شعر سے کچھ زیادہ رغبت نہ تھی مگر بہادر شاہ شعر کے عاشق و شیدا تھے۔ اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا دربار شاہی خاصہ مشاعرہ بنا ہوا تھا۔ جہاں اسوقت کہنہ مشق شاعر مثلاً حکیم ثناء اللہ خان فراق۔ میر غالب علی خان سید۔ عبدالرحمن خان احسان۔ برہان الدین خان زار۔ حکیم قدرت اللہ قاسم اور ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خان عشق۔ میان شکیبا۔ شاگرد میر تقی میر۔ مرزا عظیم بیگ عظیم شاگرد سودا میر قمرالدین منت اور ان کے صاحبزادے۔ میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب مشاعرے مین آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ مطلع پر مطلع اور مصرعہ پر مصرعہ لگاکر طبع آزمائی کرتے تھے۔ میر کاظم حسین بیقرار جو دہلی عہد کے ملازم خاص تھے اکثر ان صحبتون مین شامل ہوتے تھے

بہادر شاہ ظفر کے تخت پر بیٹھتے ہی اردو ادب نے عموماً اور اردو شاعری نے خصوصاً ایک کروٹ بدلی۔ دلی ایک مرتبہ پھر اردو ادب کا مرکز اور گہوارہ بن گئی۔ اگرچہ اساتذہ متقدمین اور متوسطین مثلاً میر۔ مصحفی۔ انشا۔ نصیر۔ بوجہ غربت اور فلاکت دلی چھوڑ کر تلاش معاش مین لکھنؤ چلے گئے تھے اور ایک حد تک اردو کا مرکز لکھنؤ منتقل ہوچکا تھا۔ تاہم وہ شاخ جو حاتم۔ آرزو۔ درد میر نے لگائی تھی۔ بارآور ہوئی۔ اور باوجود حادثات زمانہ اردو شاعری دہلی مین ترقی کرتی رہی۔ مگر عہد بہادر شاہ مین جو حیرت انگیز ترقی اردو نے کی وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ شاہ نصیر ذوق۔ مومن اور غالب اس دور کے عناصر اربعہ شمار کیے جاتے ہین، ان اساتذہ کے متعدد ارشد تلامذہ نے بھی اردو شاعری کو معراج کمال پر پہونچانے مین بہت حصہ لیا۔ یہان عہد ظفر کے مشاہیر شعراء کا تذکرہ اور ان کے کلام پر ایک تنقیدی نظر ڈالنا مقصود ہے۔

**ظفر** — قبل اس کے کہ عہد ظفر کے دیگر کاملین فن کا تذکرہ کیا جائے ہم اس تاجدار اقلیم سخن کے ذکر سے ابتدا کرتے ہیں اور چونکہ مضمون ہی ان سے وابستہ ہے اور یہی اپنے دور کی شاعری کی ترقی کا سرچشمہ ہین۔ لہذا ہم مجملاً کچھ ان کی شاعری کے متعلق لکھتے ہین۔

ظفر کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا اور کیون نہ ہوتا۔ ہوش سنبھالا تو فضا شاعری سے معمور تھی۔ اور دربار بھی نامی گرامی شعراء سے آراستہ تھا۔ اس پر اُن کی خداداد ذہانت اور طبع رسا اس کا جیسا نتیجہ ہونا چاہئے تھا ہوا۔ گو ظفر خود بھی تمام عمر شاعری مین مستغرق رہے۔ شاعری سے، عہد مہد سے لیکر آغوش لحد تک جدا نہوئے اور ظفر کے مذاق صحیح نے شاعری کو بام ترقی کے وہ اعلیٰ مدارج بخشے کہ باید و شاید ظفر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھون نے شاعری کو جادۂ تہذیب سے حتی الامکان تجاوز نہ کرنے دیا۔ ظفر کا خود شاعر ہونا شاعری کے لئے خضر راہ ہوگیا۔ اور اسی وجہ سے وہ رہ مستقیم سے نہ بھٹکے۔ اور نہ اپنے مقام ارفع سے ردیہ انحطاط ہوے

۲ — اس کا مفصل تذکرہ تو دوسری جگہ کیا جائیگا۔ یہان صرف ظفر کی شاعری کے متعلق کچھ لکھنا ہے۔ ان کے کلام مین سب سے زیادہ نمایان خصوصیت ان کا سوز و گداز ہے ذاتی مصائب اور زمانہ کے پرآشوب حالات نے اُن کی شاعری مین درد و غم حسرت و اندوہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ جو کسی دوسرے اُردو کے شاعر کے کلام مین بہ استثنائے میر نہین ملیگا۔

علاوہ اس کے ظفر کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ اُن کی ٹھمریاں اور گیت شمالی ہند مین مقبولیت عامہ اور بقائے دوام حاصل کر چکے ہین

ظفر ایک بلند پایہ خوشنویس بھی تھے دہلی کی اکثر مشہور مساجد کے لئے قران شریف کی آیات لکھ کر نذر کی تھین

باوجود اس ہمہ گیری کے ظفر کی شہرت کا انحصار ان کی غزلیات پر ہے۔ ظفر کا کلام ان کے حین حیات ہی مین مقبول ہو چکا تھا حتی کہ دہلی کے گلی کوچون مین ان کی غزلین گائی جاتی تھین

چنانچہ حسن نظامی صاحب نے لکھا ہے کہ ولی عہدی کے جھگڑے مین جب بہادر شاہ نے یہ شعر کہا۔

اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظام سلطنت　　بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نام سلطنت

تو دہلی کے ہر گھر مین اس کا ذکر تھا اور عورتین اس شعر کو پڑھ کر روتی تھین اور بچے گلیون مین مرثیہ کے انداز مین گاتے پھرتے تھے

**خصوصیات کلام ظفر** سچ پوچھو تو ظفر حقیقی اور فطری شاعر ہین۔ یہ عبرت کا درس دیتے ہین۔ رنج واندوہ غم والم حسرت و یاس کی کیفیات بکثرت موثر طریقہ سے فصاحت کے ساتھ بیان کرتے ہین۔

ظفر کے کلام مین سلاست روانی اور آمد ہے۔ فصاحت۔ معاملہ بندی محاورہ بندی۔ شیرین زبانی ان کے کلام سے نمایان ہے جرأت کا رنگ بہت مرغوب تھا۔ اور یہ ظفر کے کلام سے بخوبی ظاہر ہے۔

ظفر کا یہ مخصوص رنگ نمایان طور سے ان کے کلام مین عیان ہے ان کی غزلین کیفیات الم کی دنیا ہین۔ اخلاقی مضامین کثرت سے ملتے ہین۔ اور صوفیانہ خیالات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ ظفر کے خیالات بلند ہیں تخیل شاعرانہ ہے تشبیہین اور استعارے عام فہم اور جذبات سچے اور شریفانہ ہین۔ ذوق کی طرح زبان کے چٹخارے اور محاورے بھی ہین۔ لیکن غالب اور مومن کی طرح ان کی غزلون مین فارسی ترکیب اور جدت مضمون کم ہے۔ بڑی تلاش سے شاید چند مثالین مل سکین۔ تاہم اکثر فرسودہ مضمون کو لیکر درد کی چاشنی سے اسقدر انوکھا پن پیدا کر دیا ہے کہ گویا ایک مردہ مین روح حیات پھونک دی ہے

ظفر نے مشکل بحرون۔ سنگلاخ زمینون اور بڑی ردیفون مین بھی طبع آزمائی کی ہے اور نہایت کامیابی سے غزلین کہی ہین۔

بہر حال ظفر کی شاعری جذبات۔ واقعات اور حادثات دنیا کی سچی تصویر ہے۔ اور ظفر اپنی طرز شاعری کا واحد تاجدار اور اپنی دلکش غزلون اور شیرین نغمون کی وجہ سے نہایت بلند مرتبہ پر ہے

**کلیات ظفر** مین کچھ فارسی غزلین اور فارسی غزلیات پر چند تضمین بھی شامل ہین ظفر کو تاریخ گوئی مین بھی بڑا ملکہ تھا درگاہ قطب الاقطاب کا ایک نیا دروازہ تیار ہوا۔ تو انھون نے یہ تاریخ کہی۔

این در عالی چو شد محکم بنا حسب المراد　　گفت دل سال بنا باب ظفر پائندہ باد

طبع حاضر فی البدیہہ اشعار کہنے سے بھی دریغ نہ کرتی تھی کہتے ہین کہ کسی امیر نے ایک شخص پر اسقدر ظلم کیا کہ مظلوم جان بحق تسلیم ہو گیا۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھون نے فی البدیہہ فرمایا۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش مین یادِ خدا نہ رہی جسے طیش مین خوفِ خدا نہ رہا

**تصویر کا تاریک پہلو** اسقدر محاسن کے ہوتے ہوئے ظفر کے کلام مین اکثر بندشین سُست ہین، تازگیٔ مضمون کی کمی ہے۔ پامال مضامین کی بھرمار ہے۔ جستجو سے اخلاق سے گرے ہوئے اشعار بھی مل سکتے ہین۔ اکثر اشعار مین آورد کا شائبہ ہے۔ ایک ہی مضمون کو بار بار کئی کئی اشعار مین باندھا ہے۔

**ظفر کے اُستاد** ابتدا مین شاہ نصیر کو غزلین دکھائین۔ ان کے بعد میر کاظم حسین بیقرار اس خدمت پر مامور ہوئے۔ ان کے بعد ذوق کا سلسلۂ استادی ایک مدت دراز تک قائم رہا۔ ان کے انتقال کے بعد غالب سے مشورۂ سخن کیا۔ تنویر نے انکی استادی کا دعویٰ کیا ہے۔ مگر لالہ سری رام نے تذکرۂ "گلستانِ سخن" کے حوالے سے غلط ثابت کیا ہے۔

**تصنیفات** شرح گلستانِ سعدی لکھی ہے۔ لیکن دراصل ان کی مہتم بالشان ان کے چار مکمل دیوان ہین۔ جن مین غزلون کے سوائے۔ حمد و نعت۔ سلام و مرثیہ۔ قطعات۔ رباعیات۔ تضمین، مخمس، مسدس، مثلث۔ ٹھمریان۔ گیت سب کچھ ہین۔

غرض ظفر کے چارون دیوان گلہائے رنگارنگ سے غیرت باغ ارم ہین

**ظفر کے کلیات پر اعتراض** ظفر کے کلیات کے متعلق حضرت آزاد کی رائے ہے کہ "آدھا دیوان شاہ نصیر کا اور باقی ساڑھے تین دیوان استاد ذوق کے عطا کردہ ہین" سخت تعجب ہے۔ نہ معلوم کن وجوہ کی بنا پر آزاد نے یہ کہا ہے۔ آخر اُنھون نے اس حق سے غالب بیقرار اور خود ساختہ اُستاد تنویر کو کیون محروم کر دیا۔ خیر آزاد کچھ ہی کہین۔ لیکن واقعات اسکے خلاف معلوم ہوتے ہین آزاد نے منجملہ دیگر اسباب کے جو استاد ذوق کے مکمل دیوان مرتب نہونے کے بیان کئے ہین ان مین سے ایک وجہ اُستاد شاہ ہونا بھی ہے۔ اور ان کا یہ کہنا کہ اُستاد شاہ ہونے کی وجہ سے ذوق کا دیوان جیسا ہونا چاہئے تھا۔ نہوا۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوق ظفر کو اپنا کلام بخش دیتے تھے۔ اس دعویٰ کے ثبوت کے لئے کہ ظفر کے کل دیوان بلا شرکت غیرے ظفر ہی کے ہین۔ قبل اس کے کہ ہم کوئی دلیل پیش کرین۔ دونون شعراء کے دیوان پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ امر خود روشن ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ آزاد جوش عقیدت مندی مین کہہ گئے ہین۔ ورنہ کہان ذوق کا پرواز تخیل، تازگیٔ مضمون طرز بیان ترکیب اور محاورون کی بندش۔ اور کہان ظفر کہ جن کے کلیات مین ایک بحر غم والم اور سوز و گداز موج زن ہے۔ جس جس طریقہ سے ظفر نے غم واندوہ کی تصویرین کھینچی ہین۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف ظفر ہی کا حصہ ہے۔ ظفر کی زبان پر تو کوئی حرف لا ہی نہین سکتا۔ لیکن سلاست و صفائی مین بھی وہ یکتا ہے۔ محاورے بھی ظفر نے کثرت سے استعمال کئے ہین اور نہایت کامیابی سے انکو اپنے کلام مین شامل کیا ہے۔ ذوق کے کلام مین بھی کیفیات درد والم پائی جاتی ہین۔ لیکن ظفر کی طرح یہ ان کی امتیازی شان نہین ہے۔ یہی ایک خصوصیت ظفر کو اپنے طرز کا استاد منوانے کے لئے کافی ہے۔ اب رہا ذوق کا خود کوئی دیوان مرتب ہونا

تو اس کی وجہ ظفر کی استادی نہین ہوسکتی۔ ذوق آخر استاد شاہ تھے اور یہ خدمت ان کے سپرد تھی کہ بادشاہ کی غزلین درست کرین۔ بہت ممکن ہے کہ بوجہ اس خدمت کے وہ عدیم الفرصت رہتے ہون۔ جیسا کہ خود اُنھون نے اپنے ایک شعر مین ظاہر کیا ہے۔

ذوق مرتب کیونکہ ہو دیوان شکوہ فرصت کس سے کرین　　باندھے گلے مین ہمنے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہین

اس سے صاف یہی مطلب اخذ ہوتا ہے کہ مجھکو ظفر کے کلام کی اصلاح سے فرصت نہین ہوتی۔ یہ تو کہین نہین کہا کہ مجھ کو بادشاہ کی غزلین لکھ کر دینی پڑتی ہین

یہ ممکن ہے کہ کچھ مصرعے اور چند شعر بھی جیسا کہ استادون کا قاعدہ ہے۔ ذوق کے ہون۔ اکثر اصلاح کے وقت جو مصرعے موزون ہو جاتے ہین شاگردون کو بخش دیا کرتے ہین۔ اسی طرح ذوق نے بھی بروقت اصلاح کبھی کوئی مصرعہ یا کوئی شعر جو وقت پر ہو گیا۔ غزل مین شامل کر دیا ہو۔ تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ اس سے یہ کیون کر مان لیا جائے کہ سالم غزل ذوق ہی کی ہے۔ اس سبب سے اگر کلیات ظفر مین کچھ مصرعے چند شعر یا کچھ غزلون مین ذوق کا رنگ پایا جائے تو تعجب نہین

ایک بات اور بھی خیال کرنے کی ہے کہ نئے اور پرانے کسی تذکرہ نویس نے یہ بات نہین کہی کہ ذوق ظفر کو غزل لکھ کر دید یا کرتے تھے۔ برخلاف اس کے صاحب بزم سخن ان کی شاعری کے معترف ہین اور کہتے ہین

"در سخن پایۂ ارجمند گفتارش اگرچہ سادہ پرکار ہست اما ہمہ اش۔ خاطر شکار ہست۔ محاورہ گوئی ازان اوست و معاملہ نویسی زیر فرمان او"

اقلیم سخن کی فرمان روائی دادا سے ترکہ مین ملی تھی۔ اور اُردوئے معلیٰ زیر نگین تھا۔ افسوس کہ اسکو بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفر سے چھین کر استاد ذوق کو بخشدینا چاہا۔ آب حیات مین اُستاد ذوق کے حالات پڑھو۔ ظفر کے ہاتھ کیا رہتا ہے۔ کوئی شعر پورا۔ کوئی ڈیڑھ مصرعہ۔ کوئی ایک۔ کوئی آدھا مصرعہ۔ فقط بحر اور قافیہ باقی بخیر۔ "گل رعنا صفحہ ۲۹۳"

مقدمۂ دیوان حالی مین حالی نے بھی ان کو اپنی طرز کا استاد تسلیم کیا ہے "ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی مین اول سے آخر تک یکسان ہے۔ لیکن اس مین تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے"۔ نمونتہً ظفر کی ایک غزل پیش کی جاتی ہے جو کہ قریب قریب اُنکے تمام خصوصیات کلام کی حامل ہے

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اُٹھا وہ جو پردہ سا بیچ مین تھا نہ رہا
رہے پردہ مین اب نہ وہ پردہ نشین کوئی دوسرا اسکے سوا نہ رہا
نہ تھی حال کی جب ہمین اپنے خبر رہے دیکھتے اورون کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیون پر جو نظر تو نگاہ مین کوئی برا نہ رہا
ترے رخ کے خیال مین کون سے دن اُٹھے مجھپہ نہ فتنۂ روزجزا
تری زلف کے دھیان مین کون سی شب مرے سر پہ ہجوم بلا نہ رہا

ہمین ساغر بادہ کے دینے مین اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط یہ دور طرب نہ رہیگا جہان مین سدا نہ رہا
کئی روز مین آج وہ مہرلقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا اسے پاس حجاب و حیا نہ رہا
ترے خنجر تیغ کی آب رواں ہوئی جبکہ سبیل ستم زدگان
گئے کتنے ہی قافلے خشک زبان کوئی تشنۂ آب بقا نہ رہا
مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھون مین رو رو کے خون جگر
ملے پانوں سے کس کے ہین دیدۂ تر کف پا پہ جو رنگ حنا نہ رہا
اسے چاہا مین نے کہ روک رکھون مری جان بھی جائے تو جانے نہ دون
کئے لاکھ فریب کروڑ فسون نہ رہا نہ رہا نہ رہا نہ رہا
لگے یون تو ہزارون ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
وے ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا
ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش مین یاد خدا نہ رہی جسے طیش مین خوف خدا نہ رہا

---

**احسان** حافظ عبدالرحمن خان احسان خلف حافظ غلام رسول خان شاہزادہ مرزا فرخندہ بخت عرف مرزا ... کے خلف حضرت شاہ عالم ثانی کے سرکار مین مختار کل تھے اور استاد سلاطین زمن کے لقب سے مشہور تھے۔ شعراء پایہ تخت مین ممتاز اور سربلند تھے۔ فارسی مین طبع آزمائی کرتے تھے لیکن اردو سے خاص لگاؤ تھا۔ فارسی میں استعداد کامل رکھتے تھے

اساتذہ فارسی کے ہزارون اشعار بر زبان تھے۔ جب کوئی ان کے شعر مین کسی لفظ یا ترکیب پر اعتراض کرتا تو فوراً سند مین کسی استاد کا کلام پیش کر دیتے۔ آپنے دیوان اردو مین بھی کئی جگہ کسی غیر معمولی حرکت یا ترکیب الفاظ کی سند مین کئی کئی شعر لکھے ہین۔ شاہ عالم کے ایک مصرعہ پر انھون نے فی البدیہہ کہا کہ

نامناسب ہے میان وقت سحرگاہ نہین

کسی نے وقت سحرگاہ پر اعتراض کیا تو انھون نے سند مین صائب کا شعر پڑھا

آدمی پیر شود حرص جوان می گردد خواب در وقت سحرگاہ گران می گردد

قلعہ معلی کے تمام شاہزادے اور دلی کے اکثر امیرزادے آپ کی شاگردی کے حلقہ بگوش تھے۔ شاہ عالم ثانی آپ کے اشعار

نہایت شوق سے سُنا کرتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے حضور مین بارہا شاہ نصیر سے نوک جھوک ہوئی۔ لیکن دربار شاہی مین عزت ہمیشہ برقرار رہی۔ ایک بار شاہ نصیر نے کہا تھا

اے خالِ رخِ یار تجھے ٹھیک بناتا
پر چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

علوم متداولہ اور فنون نفسیہ مین دست گاہ کامل رکھتے تھے۔ اپنے زمانہ کے زبردست اُستادون مین شمار ہوتے تھے۔ مثل شاہ نصیر کے یہ بھی شعراء متوسطین کی باقیات صالحات تھے۔ جہان جرأت۔ انشا مصحفی۔ اور نصیر کے ہم آہنگ تھے وہان ذوق۔ مومن۔ غالب اور ممنون کے بھی ہمعصر رہے۔ چنانچہ ان کے دیوان مین ان اساتذۂ فن کی ہم طرح غزلین موجود ہین۔ زبان کی صفائی۔ الفاظ کی شستگی ترکیب کی برجستگی مین نہایت کد وکاوش کی اور حتی الوسع مغلق الفاظ پیچیدہ تراکیب سے پرہیز کیا۔ رعایت لفظی ومعنوی ان کے کلام مین نمایان ہین۔ تاہم طرز بیان نہایت صاف۔ سہل۔ مؤثر اور بے تکلف ہے۔ بہادر شاہ ظفر تخت نشینی کے بعد آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور تادم زیست وظیفہ شاہی کے احسان سے سبکدوش نہ ہوئے۔

احسان کا دیوان عنقا ہے۔ بڑی تلاش اور جستجو سے ایک قلمی کلیات جو ضخامت مین تین جزو سے زیادہ نہین ہے دستیاب ہوا ہے۔ اور ایک مثنوی یوسف زلیخا بھی نہایت عمدہ لکھی ہے۔ ان کے شاگرد سیکڑون ہوئے لیکن مرزا ثابت اور صابر کو اُستادی کا درجہ حاصل ہوا شاہ ظفر کی اُستادی کا دعویٰ بھی کیا ہے لیکن شاید ایام شاہزادگی کے تعلق سے۔ کیونکہ ذوق ان کی شاہزادگی کے عہد کے اُستاد ہین۔ شاید یہ اس سے بھی پہلے کبھی بچپن کے اُستاد ہون۔ ۱۲۶۷ھ مین رحلت کی ان کے قطعات بھی نہایت پر لطف ہوتے ہین۔ قطعات لکھنے مین ان کو خاص مہارت ہے

**بیقرار** میر کاظم حسین بیقرار تخلص کرتے تھے۔ ہمشیرزادہ نواب رضا خان مختار شاہ عالم ثانی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اور ذوق کے ہم سبق تھے۔ شاہ نصیر کے بعد کچھ عرصہ تک ظفر نے ان کو بھی اپنا کلام دکھایا۔ یہ نہایت موزون طبع اور ذہین تھے۔ مگر افسوس کہ ہمارے سامنے اسوقت ان کے دو شعر ہین۔ وہ ہدیہ ناظرین ہین

جس طرف پھر تا رہا یار وہ رشکِ آفتاب
جون دل خورشید دل اپنا مقابل رہ گیا

رخ سے گر زلفین اُٹھین تو چھوڑ دی اپنے نقاب
اک نہ اک پردہ ہمارے ان کے حائل رہ گیا

**زار** منشی برہان الدین خان زار شاہجہان آبادی شاعر دربار اکبر ثانی۔ فارسی اور اُردو دونون زبانون مین شعر کہتے تھے۔ خط شکستہ لکھنے مین کمال حاصل تھا۔ پہلے اکبر شاہ کے خواصون مین تھے پھر شعراء مین داخل ہو گئے اور یہ انکے اشعار ہین

کیونکر اس بات کو مین حال دل بد نام لکھون
کب وہ دیکھے ہے خدا کا بھی اگر نام لکھون

چشم طوفان خیز گریہ پر مری تیار ہے
جس کے آگے لے سیہ رو ابر تو بیکار ہے

**ممنون** میر نظام الدین نام ممنون تخلص۔ میر قمر الدین منت کے بیٹے تھے اصلی وطن تو سونی پت تھا۔ مگر مولانا شاہ عبد العزیز علیہ الرحمہ سے قرابت رکھنے کی وجہ سے ان کے والد دہلی آ گئے تھے۔ ممنون دہلی مین پیدا ہوئے۔

درسی کتابیں والدین سے پڑھیں اور اصلاح سخن بھی انھیں سے کی۔ چند روز کی فکر و کاوش سے دہلی شہر میں ان کی شاعری کا سکہ رائج ہوگیا۔ اکبر شاہ نے ان کو فخر شعراء کے خطاب سے متفخر کیا۔ کثرت سے لوگ ان کے تلمذ میں داخل ہوگئے۔ کہتے ہیں کہ مفتی صدرالدین خان آزردہ نے بھی ان سے اصلاح لی ہے بہرحال ان کی شاعری نے خوب ترقی کی۔ اسی زمانے میں لکھنؤ تشریف لائے تھے اور سرکار اودھ کی طرف سے خاطر خواہ قدردانی ہوئی۔ مگر گورنمنٹ انگریزی نے بڑی قدردانی کی۔ اور ان کو اجمیر کا صدر الصدور کر دیا۔ مدت تک اس جلیل القدر عہدے کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جب کبرسنی نے مجبور کیا تو دلی جاکر خانہ نشین ہوگئے اور سنہ ۱۲۶۴ھ میں ایک ضخیم دیوان چھوڑ کر دنیا سے رحلت کی۔

ان کی زبان صاف و شیرین ہے اور جابجا محاوروں کی چاشنی دیتے ہیں۔ تو کلام اور بھی مزیدار ہو جاتا ہے۔ پھر ترکیب بندش کی چستی سے پامال اور فرسودہ مضامین بھی اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ کلام میں خاص لطافت و نزاکت پیدا ہو جاتی ہے

**شاہ نصیر** نصیرالدین المتخلص بہ نصیر بلحاظ زبان اور زمانہ شعرائے متوسطین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان میں خاص بات یہ ہے کہ شعرائے متوسطین اور متاخرین میں بطور کڑی کے ہیں۔ آپ سیاہ فام بھی واقع ہوئے تھے۔ اس لئے ان کو میاں کلو بھی کہتے تھے۔ شاہ غریب باشندہ دلی کے فرزند تھے۔ ان کے والد عزلت نشین درویش مشرب تھے۔ شاہان مغلیہ کی عطا کردہ جاگیر پر بسر اوقات تھی شاہ نصیر کی علمی استعداد معمولی سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اوائل عمر میں ہی مشق سخن کرنے لگے۔ مائل کے شاگرد ہوئے۔ شاہ عالم کے دربار میں بھی رسائی پیدا کی۔ خلعت اور انعامات سے مالا مال ہوئے۔ عمر کا بیشتر حصہ سیاحت میں گذرا لکھنؤ اور حیدرآباد کے کئی چکر لگائے۔ لکھنؤ میں مصحفی۔ انشا۔ جرأت سے معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ اور کامیابی کا سہرا ان کے سر رہا۔ دیوان چندو لال شاداں کی دعوت پر حیدرآباد تشریف لیگئے۔ اور وہاں انکی آمد نے اردو شاعری کے قالب میں نئی روح پھونکدی

**کلام** یہ کہنہ مشق اور پرگو شاعر تھے اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ چونکہ طبیعت میں لاپرواہی تھی۔ اسوجہ سے ان کا بہت سا کلام ضائع ہوگیا۔ ان کے ایک شاگرد مہاراج سنگھ نے تقریباً ایک لاکھ اشعار کو ترتیب دیکر دیوان کی شکل میں شائع کرایا ہے۔ اور ایسا بھی کہتے ہیں کہ ان کا دیوان بہ مشکل مسودہ میر عبدالرحمن پسر میر تسکین شاگرد مومن نے ترتیب دیا۔ اور نواب رامپور کو فروخت کر دیا۔ جو اُن کی لائبریری میں موجود ہے

نصیر بہت با اخلاق۔ ظریف اور خوش مزاج تھے۔ حیدرآباد۔ دہلی۔ لکھنؤ میں بہت سے اُن کے شاگرد تھے۔ نصیر سنگلاخ زمینوں اور مشکل بحروں میں نہایت روانی کے ساتھ اشعار کہتے تھے۔ اور اس طرز میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کو شاعری میں کمال حاصل تھا۔ پر شکوہ الفاظ کو نہایت خوبصورتی سے بٹھاتے تھے۔ انھوں نے عام تشبیہ و استعارات کو نہایت کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ مثل ناسخ اور صائب کے بھی پہلے مصرعہ میں اخلاقی مضمون اور دوسرے میں برجستہ تشبیہ دیتے ہیں۔ اگرچہ نہایت جوش و خروش سے اشعار لکھتے ہیں مگر رفعت خیال اور ندرت مضمون کمیاب ہے۔ ان کے بہت سے شاگرد نہایت مشہور ہوئے

**ذوق** خاقانی ہند ملک الشعراء شیخ ابراہیم ذوق استاد بہادر شاہ ایک غریب باپ کے بیٹے تھے۔ اگرچہ خاندانی شخص نہ تھے تاہم

اپنی ذاتی قابلیت اور خداداد لیاقت کے سبب معراج ترقی پر پہونچ گئے۔ جب ذوق نے ہوش سنبھالا۔ دلی کی گلی گلی مین شعر و شاعری کا چرچہ تھا۔ ان کے معلم حافظ غلام رسول شوق اکثر مجلس مشاعرہ مین شریک ہوا کرتے تھے۔ ذوق کو بھی شاعری کا شوق دامنگیر ہوا۔ ابتدا مین کچھ عرصہ تک شوق کو اپنا کلام دکھایا۔ مگر طبیعت کی تیزی کسی باکمال کی تلاش مین تھی۔ میر کاظم حسین بیقرار شاگرد شاہ نصیر کے توسط سے شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاہ نصیر کا طوطی دہلی مین بولتا تھا۔ ذوق کی شاعرانہ قابلیت نے شاہ نصیر کے سینہ مین آتش حسد بھڑکا دی۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ اُستاد اور شاگرد مین ناچاقی ہوگئی۔ شاہ نصیر سے رشتہ شاگردی منقطع ہونے کے بعد ذوق نے کسی کی شاگردی قبول نہ کی۔ رفتہ رفتہ ذوق کی شاعری مقبول ہونے لگی۔ اور دہلی کی گلی گلی مین بچے بچے کی زبان پر ان کی غزلین تھین۔ اس وقت شاعری کا مرکز مرزا ابوظفر ولی عہد کا محل تھا۔ جو قلعہ محل مین بڑی دھوم دھام سے مجلس مشاعرہ منعقد کیا کرتے۔ جہان اکثر بڑے جوش و خروش سے فی البدیہہ مشاعرے بھی ہوجایا کرتے تھے۔ جسکی وجہ سے شاعری بام عروج پر پہونچ گئی۔

ان مجلسون مین اساتذہ فن کا جمگھٹا رہتا تھا۔ ذوق نے اپنے رفیق میر کاظم حسین بیقرار کے توسل سے دربار مین رسائی حاصل کی اُسوقت شہزادے کی غزل کی اصلاح کی خدمت بیقرار کے سپرد تھی۔ کیونکہ شاہ نصیر دلی سے چلے جا چکے تھے تھوڑے عرصہ بعد میر کاظم حسین بھی جان الفسٹن کے ہمراہ میر منشی ہوکر دہلی سے سندھ چلے گئے۔ اب ذوق کا ستارہ چمکا اور یہ اُستاد ولی عہد مقرر ہوئے۔ تھوڑے عرصہ بعد بقول آزاد نواب الٰہی بخش خان معروف جو کہ دربار مغلیہ کے مشہور رکن اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ذوق کے شاگرد ہوئے۔

مگر لالہ سری رام خمخانہ مین معروف کی شاگردی کے بارے مین لکھتے ہین "مولانا آزاد نے جوش عقیدت مندی مین یہ ذکر بھی کردیا ہے کہ نواب الٰہی بخش خان معروف جو شاہ نصیر کے پُرانے شاگرد تھے۔ اور عمر ان کی چھیاسٹھ سال کی تھی۔ انھون نے ذوق کو جو بمشکل اٹھارہ سال کے تھے۔ اپنا اُستاد بنایا اور اپنے دونون دیوان درستگی کے لئے دئے۔ اس واقعہ کی تکذیب نواب ضیاء الدین احمد خان نیر درخشان اور نواب احمد سعید خان صاحب طالب نے خود مولانا آزاد سے مباحثہ کرکے یہ براہین قاطع کردی ہے"

ذوق کے کلام مین اس وقت تک پختگی آچکی تھی۔ اور اُن کی شاعری مین ایک خاص رنگ پیدا ہوچکا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد نصیر نے مراجعت وطن کی۔ اور ذوق سے میدان شاعری مین معرکہ آرائیان ہونے لگین۔ ذوق نے مشکل اور سنگلاخ زمینون مین شاہ نصیر کی غزلون پر غزلین کہین

عرصہ تک شاہ نصیر اور ذوق مین شاعرانہ مجادلہ ہوتا رہا اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہے۔ آخرالامر کامیابی کا سہرا ذوق کے سر رہا۔ ان معرکہ آرائیون کا یہ اثر ہوا کہ عوام مین شاعری سے بہت دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ہر معمولی پڑھا لکھا آدمی میدان شاعری مین ذوق اور شاہ نصیر کے نقش قدم پر چلنے مین کوشان رہنے لگا۔ دہلی مین ذوق کی شاعری کا ڈنکا بج گیا۔ ذوق نے قصیدہ گوئی مین بھی کمال حاصل کیا۔ اور نہایت جوش و خروش سے قصیدے لکھے۔ اور اکبر شاہ ثانی نے خاقانی ہند کے خطاب سے اعزاز بخشا۔ جب بہادر شاہ ظفر جلوہ آرائے تخت دہلی ہوئے۔ تو انھون نے ذوق کا مشاہرہ پانچ روپیہ سے بڑھا کر پچیس ۲۵ روپیہ کیا۔ اور کچھ عرصہ بعد سو روپیہ کردیا۔ اور وقتاً فوقتاً خلعت۔ جاگیر۔ انعامات اور تحفہ تحائف سے مالامال کرتے رہے

## ذوق کی سیرت

ذوق فطرتاً طباع تھے۔ بلحاظ ذہانت اور حافظہ ہزاروں میں فرد تھے۔ رحمدل۔ خدا ترس اور نہایت متقی تھے۔ موسیقی سے بھی شوق تھا۔ طبابت اور قیافہ شناسی سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ لیکن شاعری میں تفوق حاصل تھا۔ اور اس میں اس قدر غرق تھے کہ ان کو فنا فی الشعر کہنا ناموزون نہ ہوگا۔ خاک دہلی کی الفت اسقدر دامنگیر تھی کہ شوق کو سبب اُس نے ان کو کہین بھی نہ جانے دیا۔ دیوان چندو لال شاداں نے ان کو بصد منت حیدر آباد بلایا۔ اور مصرعہ طرح بھیجا ــــ انھون نے جواب مین غزل لکھکر بھیجی۔ جس کا مقطع تھا۔

گرچہ ہے ملکِ دکن مین اِن دنون قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دہلی کی گلیان چھوڑ کر

## ترتیب دیوان

آخر عمر مین صوم وصلواۃ کی نہایت سختی سے پابند ہوگئے۔ ذوقؔ تمام عمر شعر گوئی مین منہمک رہے۔ جب ہم ان کا ایک مختصر سا دیوان دیکھتے ہین۔ تو تعجب ہوتا ہے ذوقؔ کے حالات پر کافی غور وخوض کرنے اور آزاد کی اس تحریر کے پڑھنے کے بعد جو انھون نے ذوقؔ کے دیوان مین مختلف مقامات پر لکھی ہے۔ ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہین کہ ان کے مزاج مین استغنا اور لاپروائی بہت تھی

ترتیب دیوان کے ضمن مین آزاد کہتے ہین

"فصاحت کا خون ہوتا ہے۔ جب ان کے دیوان پر نگاہ پڑتی ہے۔ اس کا بیان ایک مصیبت کا افسانہ ہے اور مرثیہ خوانی میرا فرض ہے فرماتے تھے کہ بچپن مین جب کہ ۱۵-۱۶ سال کی عمر تھی ہم نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔ اور اُسے بڑے شوق سے لکھا تھا۔ پھر زمانہ نے فرصت نہ دی۔ جو غزل ہوئی جدا کاغذ پر لکھی گئی۔ اس طرح طاق پر رکھدیتے تھے کہ فرصت سے نظر ثانی کرینگے۔ جب طاق بھر گیا۔ تکیہ کے غلاف مین بھرے اور گھر مین دیدیتے اور کہدیتے کہ احتیاط سے رکھنا۔ اور کبھی مٹکے اور تھلیا مین بھرے۔ اور گھر مین بھجوا دیے کہ ضائع نہ ہون۔ اور اسی طرح تھیلے اور مٹکے تھلیان بھر گئے"

آگے چلکر لکھتے ہین کہ۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق الٹ جائیگا عالم تہ وبالا ہو جائیگا حسرتون کے خون بہ جائینگے۔ دل کے ارمان دل ہی مین رہ جائینگے"

دفعتاً ۱۸۵۷ء کا غدر شروع ہوگیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمعیل ان کے فرزند جسمانی کے ساتھ ان کے فرزند روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے" اس کے علاوہ آزاد نے متعدد غزلون پر نوٹ بھی لکھے ہین کہ ان کے سامنے کوئی مطلع یا کوئی غزل کوئی شعر پڑھا گیا تو انھون نے کہا "ہان بھائی لڑکپن یا جوانی کی غزل ہے"

اور بقول آزاد:۔ "نظر ثانی سے نور نہین پایا" فرصت مین دیکھین گے"

بے پروائی کی حد ہوگئی۔ جب غزلون کے مسودے گھڑے مٹکون، تھیلون اور طاقون مین بھرے جانے لگے۔ تو ان کے ساتھ

وہی ہونا تھا جو ہوا۔ کیون کوئی زمانے کو کہے۔ اور کیون خیال کرے کہ انھون نے اپنا کلام دوسرون کو بخش دیا۔ ایسا کبھی سننے مین نہین آیا۔ کہ غزلین گھڑون اور طاقون مین رکھی جائین۔ بے پروائی سے ماری ماری پھرین۔ اور پھر دیوان کی شکل مین بھی مرتب ہوجائین۔ لہذا ذوق کے کلام کے ساتھ جو کچھ ہوا غیر متوقع نہین ہوا۔ اس پر طرہ آشوب غدر۔ بہرحال ہم یہ ماننے کو تیار نہین کہ بادشاہ کی استادی نے ذوق کے دیوان کو جیسا کہ ہونا تھا نہ ہونے دیا۔ یہ تھوڑا بہت مشتے نمونہ از خروارے جو ہم تک پہونچا ہے۔ اس کو پہلے حافظ دیوان نے اپنے دوستون کی مدد سے مرتب کیا۔

بہت دنون کے بعد آزاد نے کوشش کرکے ایک دوسرا مجموعہ مرتب کیا۔ جس سے کچھ ناتمام غزلین مکمل ہوگئین۔ اور کچھ قصیدون اور غزلون کا اضافہ ہوگیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے فنافی الشعر آدمی کا یہ مختصر سا دیوان ہی تمام سرمایہ نہین ہوسکتا۔ اگر کلام انکی لاپروائی اور غدر کے نذر نہ ہوجاتا تو یقینی تین چار ضخیم جلدین بھی اس کی متحمل نہ ہوسکتین۔

**تصانیف**

ذوق غزل اور قصیدہ کے مسلم الثبوت استاد ہین۔ ان کی مشہور عالم مثنوی "نامہ جان سوز جو ۵۰۰ اشعار پر مشتمل تھی وہ غدر مین ضائع ہوگئی۔ علاوہ ازین ذوق بے شمار رباعیات مخمس اور تاریخون کے مصنف ہین۔ جواب بہت کم یاب ہین۔ سلام اور مراثی پر طبع آزمائی نہین کی نہ کسی کی ہجو سے اپنی زبان کو آلودہ کیا

**ذوق کا مرتبہ اُردو ادب مین**

ذوق نے اُردو کی نہایت اہم خدمت کی ہے۔ ذوق نے زبان کو نہایت شستہ اور سلیس کیا۔ موزون اور برجستہ الفاظ کے استعمال مین ان کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ ذوق کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھون نے ہندی اور اُردو کے لاتعداد محاورات بہت حسن خوبی سے استعمال کئے اور اشعار مین ان کو نگینے کیطرح جڑدیا۔ زبان پر ان کو بہت زیادہ عبور حاصل تھا۔ غزل قصیدہ مین حیرت انگیز کمال دکھایا۔ ذوق نے اکثر غزلون مین ترنم کا خاص طور سے لحاظ رکھا ہے۔ ذوق نے شعار کے قالب مین جو لغات بھر دئے ہین وہ دنیائے ادب کو آج تک مست بیخود کئے ہوئے ہیں

**طرزِ کلام**

صنائع اور بدائع، تشبیہ اور استعارات بطریق احسن استعمال کئے ہین۔ اور اس خوبی سے بٹھائے ہین کہ کانون پر ذرا بھی گران نہین گذرتے۔ ذوق کے اشعار مین جوش۔ آمد اور مناسب زیر و بم ہے۔ زبان کی شیرینی، اور صفائی کا بمقابلہ رفعت خیال اور پرواز تخیل زیادہ خیال رکھا ہے۔ ہمہ گیری مین ان کا مقابلہ سودا سے کیا جاسکتا ہے۔ اکثر ذوق نے سودا کے طرز کلام کا تتبع کیا ہے مگر قصیدہ گوئی مین تمام شعراء اُردو مین ممتاز ہین۔

ذوق نے غزلون مین شاہ نصیر۔ انشا۔ مصحفی۔ جرأت اور اکثر ناسخ کا تتبع کیا ہے اور آخر کار اپنا ایک خاص رنگ پیدا کرلیا۔ جو غزلیات انھون نے جرأت کے رنگ مین لکھی ہین۔ ان مین جرأت کی تمام خوبیان پائی جاتی ہین۔ مگر وہ جرأت کی کمزوریون سے یکسر پاک ہین۔ ان کی علمی استعداد پر نکتہ چینی کیجاتی ہے۔ لیکن خمخانۂ جاوید میں لکھا ہے

"ابتدائے عمر مین شیخ مرحوم نے معمولی درسی تعلیم کے بجائے شعر گوئی کی طرف توجہ کردی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ مشاعرون کی معرکہ آرائیون اور حریفون کے اعتراضون نے انھین تکمیل علوم اور سیر کتب کی طرف متوجہ کیا۔ فطری شوق کی مدد سے قلیل عرصہ مین

وہ ایک فاضل ہوگئے۔ اور معلومات کا دائرہ وسیع کرلیا۔ مولوی محمد حسین آزاد فرماتے ہین۔ کہ شیخ مرحوم نے فرمایا کہ مین نے ۵۰،۷ دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے ہین۔ اور اُن کا خلاصہ کیا۔ اساتذہ کی تصنیفات ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی صدہا کتابین گویا ان کی زبان پر ہین۔ مگر مجھ کو اس کا تعجب نہیں اگر شعراء عجم کے ہزارون شعر انھین ازبر تھے۔ تو مجھے حیرت نہین۔ اور گفتگو کے وقت جس تڑاقے سے وہ شعر سند پیش دیتے تھے۔ اس کا بھی خیال نہین۔ کیونکہ جس فن کو وہ لئے بیٹھے تھے یہ سب اس کے لوازمات ہین۔ ہان تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مؤرخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہین۔ خصوصاً تصوف مین ایک عالم خاص تھا۔ رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیر مین انھین خدا نے ایک ملکۂ راسخہ دیا تھا۔ اور لطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقعہ ہوتے تھے۔ علم طب کو خوب تحصیل کیا مگر کام نہ کیا"

اگرچہ ذوق قابلیت اور لیاقت۔ رفعت تخیل اور تازگئ مضمون مین غالب سے کمتر ہین۔ لیکن غالب زبان کی سلاست۔ محاورہ بندی مین ان کے مقابلہ سے قاصر ہین۔ ذوق آسمان شاعری کے نیر تابان اور گلشن اُردو کے عندلیب شیرین مقال ہین

لالہ سری رام نے ان کے کلام پر حسب ذیل ریویو کیا

"استاد ذوق کی محاورہ بندی مضمون آفرینی۔ کلام کی پختگی صحت زبان سلاست بیان کی شہرت محتاج بیان نہین۔ ذوق اگرچہ نازک خیالی اور مضمون بندی مین غالب اور حکیم مومن خان کے رتبہ کو نہین پہونچے۔ مگر ان کی خداداد ذہانت اور ہمہ دانی نے اس کمی کو جیسا کہ چاہئے۔ پورا کر دکھایا۔ ایک خاص وصف جس سے ان کی شاعری مسلم مانی جاتی ہے۔ یہ تھا کہ اکثر پامال مضامین کس خوبی اور ایسے الفاظ مین باندھتے مین کہ اپنی جدت طرازی سے نئے خیال کا لطف اس مین پیدا کرتے ہین"

"نساخ۔ گارسن دتاسی۔ شیفتہ۔ صہبائی۔ آزردہ جیسے منصف مزاج باکمالون نے انھین فن شعر کا بادشاہ اور قادر الکلام اُستاد تسلیم کیا ہے"

شیفتہ فرماتے ہین

قوت مشقی کہ اورا است دیگرے را دیدہ نہ شد
لہذا ارطب و یابس کہ شیوہ بسیار گویان است
در کلامش کمتر و برجمیع اضاف سخن قدرت تمام دارد

**ارشد تلامذہ** یون تو تمام دلی ذوق کے شاگردون سے پر تھی مگر ظفر۔ آزاد۔ ظہیر۔ انور۔ مخبر اور داغ نے اُستاد کے نام کو چار چاند لگادئے۔ نمونہ کلام ذیل میں درج ہے

وہ کون ہے جو مجھ پہ تأسف نہین کرتا ۔۔۔ پر میرا جگر دیکھ کہ مین اُف نہین کرتا
گل اس نگہ کے زخم رسیدون مین مل گیا ۔۔۔ یہ بھی لہو لگا کے شہیدون مین مل گیا
ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا ۔۔۔ خوب طوطی بولتا ہے ان دنون صیاد کا

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

---

الفت کا نشہ جب کوئی مرجائے تب جائے
یہ درد سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اُف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھو

عبث تم اپنا رکاوٹ سے منھ بناتے ہو
وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

کیا اے چلے گلی سے تیرے ہم کہ جون ستم
آتے تھے سر پہ خاک اُڑاتے اُڑا چلے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ سے
دلکو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ لے

آنا تو خفا آنا جانا تو رُلا جانا
آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے تو کیا جانا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
پر حیف کہ مجنون کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تیری سب کے جواب مین

احسان ناخدا کا اُٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

موت ہی سے کچھ علاج درد فرقت ہو تو ہو
غسل میت ہی ہمارا غسل صحت ہو تو ہو

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی
کالا کریگا منھ بھی جو داڑھی سیاہ کی

جس جگہ بیٹھے ہیں با دیدۂ نم اُٹھے ہیں
آج کس شخص کا منھ دیکھ کے ہم اُٹھے ہیں

سینہ و دل پہ مرے زخم جگر ہنستے ہیں
ہنستے وہ بیچارہ گردن ہنستے ہی گھر لیتے ہیں

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

بد نہ بولے زیر گردون گر کوئی میری سنے
ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

جاکے اک بار نہ پھرنا تھا جہان سے ہم کو
بیقراری ہے کہ تلوار لئے پھرتی ہے

رفعت خیال پرواز تخیل مضمون آفرینی کے نمونے:-

تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ
اپنا آئینہ مرا دیدۂ پر آب بنا

موت نے کر دیا لاچار وگرنہ انسان
ہے وہ خود بین کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

ہنگامہ گرم ہستیٔ ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

اتنا تو شورِ فنا ہو کہ چمن میں بلبل!
خرمنِ گل کی جگہ ڈھیر ہو انگاروں کا

چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ
ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا

کب لباسِ دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر
جامۂ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا

دم کو ہمارے سینے میں اک دم نہ ہو قرار
یہ وہ غریب ہے کہ مسافر وطن میں ہے

مشکل ہے مرے عہد محبت کا توڑنا
اے بیوفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں

وہ مست ہوں کہ رکھے قدح کش تہِ بغل
بنیاد میکدہ مری خشتِ لحد سے ہے

دیکھنا آبی دوپٹہ منھ پہ اُنکے خواب میں
برج آبی میں ہے مہ یا مہر روشن آب میں

رکاوٗ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

جا پڑا پاؤں پہ قاتل کے تڑپ کر کشتہ
سرد ہونے پہ بھی گرمیٔ وفا ہے اس میں

دانۂ خرمن ہے ہمیں دریا ہے قطرہ ہم کو
آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو

ہم تبرک ہوئے اب کرے زیارت مجنون
سر پہ پھرتا ہے لئے آبلۂ پا ہم کو

افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف
لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ

کعبہ کی دیوار و در سے نور کے جلوے اُٹھیں
گر پڑے سایہ بھی مےخانہ کی دیوار کا

ریشِ سفیدِ شیخ میں ہے ظلمتِ فریب
اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح

لبریزِ صد نشاط۔ برنگِ ہلالِ عید
سینہ میں میرے ناخنِ غم کی خراش ہے

---

زمین پہ نورِ قمر کے گرنے سے صاف اظہارِ روشنی ہے
کہ جو ہیں روشن ضمیر اُن کو فروغ اُنکی فروتنی ہے

---

ہے نماز کشتۂ قامت۔ بجائے جانماز
اے قیامت لا بچھا دامانِ محشر زیر پا

ارشد تلامذہ

**ظہیر** — سید ظہیر الدین جلیل سید جلال الدین حیدر خوشنویس کے لڑکے تھے جلال الدین حیدر شاہ ظفر کے خوشنویسی میں اُستاد تھے۔ ظہیر نے بھی ملازمت اختیار کی اور راقم الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں

ذوق کے شاگرد ہوئے۔ زمانۂ غدر مین دہلی چھوڑ کر چلے گئے۔ اور زمانہ کے ہاتھون بہت پریشان رہے۔ آخر حیدر آباد پہونچے۔ اور نہایت عُسرت کی حالت مین انتقال کیا

ظہیر بہت پرگو شاعر تھے۔ ان کا پہلا دیوان "گلستان سخن" آگرہ سے شایع ہوا۔ دوسرا اور تیسرا دیوان مطبع کریمی کلکتہ سے شائع ہوا چوتھا غیر مطبوعہ ہے۔

ظہیر اگرچہ ذوق کے شاگرد تھے۔ مگر غزلین اکثر مومن کے رنگ مین کہتے تھے۔ اور اس کا اعتراف اپنے اشعار مین کیا ہے

سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا طرز مومن سے نہ آگاہ تھے جبتک کہ ظہیر

عہد ظفر کی شاعری کے آخری چراغ تھے جسکو صرصر حوادث نے سرزمین دکن مین گل کر دیا۔ ان کو اردو شاعری کا مسلم الثبوت اُستاد تصور کیا جاتا ہے۔ نجم الدین احمد ثاقب بدایونی انکے شاگرد رشید تھے۔ جن کو ظہیر نے "پہلوان سخن" کا خطاب دیا تھا۔ ان کے کلام مین بجائے ذوق کے مومن خان کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ذوق کے کلام کی ممتاز خصوصیات کلام کی پختگی اور محاورہ کی صفائی اور زبان کی درستی ظہیر کے ہان پائی جاتی ہین مومن خان کے یہان شاعری کا مدار خیال کی نزاکت ترکیب۔ فارسی بندش، اور اسلوب بیان کی جدت پر ہے۔ جو ظہیر کی شاعری کا سرمایۂ ناز خصوصیت ہے

غرضکہ مجموعی حیثیت سے ظہیر کی شاعری دلی کی اصلی اور قدیم مشاعری کا ایسا نمونہ ہے کہ جسکی مثال ان کے بعد اور کسی کے کلام مین نہین مل سکتی

نگاہِ شرمگین سے ہے نہان کیا کیا عیان کیا کیا فقط اک سادگی پر شوخیون کے ہین گمان کیا کیا

---

بڑھا جاتا ہے یان شوقِ سجودِ آستان کیا کیا قدم رکھتے نہین ہین وہ زمین پر بے نیازی سے

---

الجھتے ہین دم رفتار تسو تسو بار دامن سے یہ شوخی ہے کہ تمکین ہے الٰہی کیا قیامت ہے

---

مین کچھ دوا سے اور بھی رنجور تر رہا پھر سیرِ عشق سے مجھے وحشت فزون ہوئی
ہر ہر ادا پہ مجھ کو گمانِ نظر رہا اعجاز دلفریبیٔ انداز دیکھنا

**انور** سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا المتخلص بہ انور برادر خرد ظہیر شاگرد ذوق۔ ذوق کے انتقال کے بعد غالب کی طرف رجوع ہوئے۔ یہ نہایت ہونہار شاعر تھے۔ مگر صد حیف کہ عمر نے وفا نہ کی۔ اور ۳۵ برس کی عمر مین جیپور مین انتقال کیا۔ ان کے ہمعصر ان کو بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ غدر کے دس ماہ کے بعد جو مشاعرہ دہلی مین منعقد ہوا جس مین داغ۔ ارشد۔ ظہیر۔ مجروح۔ سالک۔ عزیز۔ مشتاق اور حالی رونق آرائے بزم سخن تھے۔ یہ بھی موجود تھے۔ ان کے

دو دیوان ضائع ہو گئے۔ لیکن لالہ سری رام نے ان کی غزلیات کو جمع کر کے ایک دیوان کی شکل میں شائع کیا ہے۔ انور کے کلام میں ذوق کی سلاست۔ مومن کی نزاکت۔ اور غالب کی بلاغت پائی جاتی ہے۔

"طبیعت نہایت دقت پسند اور مضمون خیز واقع ہوئی تھی۔ کلام کی شوخی۔ خیال کی چلبلاہٹ اور فکر کی رسائی روزمرہ کے انوٹ فریفتگانِ سخن کے دماغ میں عجیب سرور اور عاشق مزاجوں کے دلوں میں غضب کا درد پیدا کرتے تھے۔ جو شعر دیکھو پھڑکتا ہوا حسنِ خیال و بلندیِ مضمون پر نظر ڈالو تو ایک خوش آئند حیرت پیدا ہوتی ہے"

کیا غماز اپنا ہے پیدا ہاتھ سے اپنے
زبان بنکر کہے دیتا ہے چاک آستین کیا کیا

تقلید خاکساری ہوتی ہے خاک ہو کر
مٹ مٹ کے ہمنے سیکھا انداز نقش پا کا

تم آج ہی چل پھر کے مٹا دو نہ یہ جھگڑا
کیوں کل پہ رکھو شورشِ نوغائے قیامت

مجھ سے دل کا غبار مٹ نہ سکا
اپنے کو ہم مٹائے بیٹھے ہیں

کچھ کچھ وہ چھیڑ لطف کی کم کم عتاب میں
جی ہے امید و یاس کے کس کس عذاب میں

نہیں انجم یہ رو رو کر کسی کے یاد دندان میں
بھرے ہیں ہمنے موتی دامن شب ہائے ہجران میں

اللہ فرطِ شوقِ اسیری کے شوق میں
پھر دن اٹھا اٹھا کے سلاسل کو دیکھنا

تم کسی وعدے سے پھر جاؤ کہ ہو جاؤں تمام
ہو اگر پھرنے میں میرے حلق پر خنجر خراب

شبِ غم میں کس کس کی ہو روک تھام
جو دل میں گیا دم خفا ہو گیا

کیا غم دراز دستیِ نارسیر کا
دامن کو لے چلا ہوں بھگو کر شراب میں

ضعف میں مرنا بھی مشکل ہو گیا
جان اٹکی ہے نفس کے تار سے

---

**داغ۔** نواب مرزا خان داغ نواب شمس الدین خان کے لڑکے تھے ۱۲ ذی الحجہ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھ یا سات برس کی عمر تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ انکی والدہ نے مرزا فخرو خلف ظفر شاہ ولی عہد سے نکاح کر لیا۔ اور قلعہ میں رہنے لگیں۔ یہ بھی ساتھ تھے غرض ۹ سال کی سے ان کی تعلیم کا سلسلہ ہوا۔ دربار ظفر میں کمالانِ فن کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ ان کی تعلیم باقاعدہ ہونے لگی ولی عہد بہادر خود ان کی تعلیم میں بہت دلچسپی لیتے تھے اور بعض فنون کی تعلیم خود دیتے تھے۔ قلعہ میں جہاں اور علوم میں کمال حاصل ہو سکتا تھا ان شعر و شاعری کا بھی بازار گرم تھا۔ یہ دیکھ کر ان کو بھی شاعری کا شوق ہوا۔ خدا نے ذہانت اور ذکاوت ان کی فطرت میں نہایت فیاضی سے ودیعت کی تھی۔ اور اس پر خدا نے سامان بھی ایسے ہی پیدا کر دئے۔ ذوق کا زمانہ تھا۔ اور حضرت ذوق، بہادر شاہ ظفر اور ولی عہد دونوں کے استاد تھے۔ مرزا فخرو نے جب ان کا رجحان شاعری کی طرف دیکھا۔ تو ان کو ذوق کا شاگرد کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی مشاعروں کا بھی اسوقت بہت چرچا تھا۔ علاوہ قلعہ معلی کے شہر میں اکثر لوگوں کے مکانوں پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے پہلے پہل نواب شیفتہ کے مشاعرے میں

غزل پڑھی۔ پھر اکثر مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے۔ اور تعریف بھی ہونے لگی۔ غدر سے دس ماہ پیشتر مرزا فخرو ولی عہد کا بعارضۂ ہیضہ انتقال ہو گیا۔ مرزا کو اس کا بہت صدمہ ہوا۔ پھر دس ماہ کے بعد ہنگامہ غدر برپا ہوا۔ اور اس طوفان نے سب کے ساتھ شیرازۂ ادب کو بھی منتشر کر کے رکھدیا اور ........................ داغ کو بھی دلی چھوڑنی پڑی۔ اور یہ معہ اپنے خاندان کے رامپور چلے آئے۔ یہاں نواب یوسف علی خان اور ان کے بعد نواب کلب علی خان نے انکی بہت قدر کی۔ نواب کلب علی خان نے ان کو اپنا مصاحب خاص بنا لیا۔ ۲۴ سال تک مرزا ان کے ہمراہ رہے۔ اور ان کے ساتھ ہی سعادت حج سے بہرہ ور ہوئے۔ نواب کلب علی خان کے انتقال کے بعد بوجوہ چند رامپور سے دلی چلے آئے۔ یہاں کچھ روز قیام کر کے اِدھر اُدھر کی سیر کی۔ پھر حیدر آباد چلے گئے وہاں کچھ روز قیام کیا۔ حیدر آباد میں آپ کی بہت شہرت ہوئی۔ آپنے راجہ گردھاری پرشاد باقی کی مدح میں ایک قصیدہ بھی کہا۔

ہیں ہوا باد یہ پیما طرفِ ملکِ دکن سرمۂ چشم غزلاں ہوئی گرد دامن

کچھ عرصہ بعد حیدر آباد سے چلے آئے۔ دوبارہ نظام حیدر آباد نے نوشتہ بھیجکر طلب کیا۔ مرزا پھر حیدر آباد پہونچے۔ مدت کے بعد دربار میں طلبی ہوئی ساڑھے چار سو[۴۵۰] روپیہ وظیفہ مقرر ہوا۔ اور یہ اُستادِ نظام مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ایک ہزار[۱۰۰۰] روپیہ ملنے لگا۔ طبیعت کے نہایت غیور اور خود دار تھے۔ اُنھوں نے کسی امیر و رئیس کی مدح نہ کی۔ سوائے چند کے۔ اگر کہیں جاتے تو نظام سے پوچھ کر حتیٰ کہ اپنے ولی نعمت کے یہاں بھی بلا بُلائے نہ جاتے تھے۔ عام لوگوں سے نہایت خلوص اخلاق اور خوش طبعی سے ملتے تھے نہایت خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ انکی گفتگو دلچسپ ہوتی تھی۔ طبیعت نہایت مرنجاں مرنج واقع ہوئی تھی۔ دوسرے اُستادوں کے مانند ان سے اور کسی ہمعصر سے سخن گسترانہ معرکہ آرائی تک نہیں ہوئی۔ حرف گیری اور اعتراض ان کے ذوق سے باہر تھے۔ خلق کی عمدہ مثال امیر مینائی کی مہمانداری اور تیمار داری ہے۔ جلال۔ مجروح۔ ظہیر۔ تسلیم۔ راسخ۔ ناسخ سے ان کے تعلقات نہایت شگفتہ رہے۔ ۱۸ برس تک دکن میں قیام رہا۔ ۵ ذی الحجہ کو آٹھ روز مرض فالج میں مبتلا رہکر داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور یہ آفتابِ شاعری خاک دکن میں ہمیشہ کے لئے چھپ گیا مرزا خان داغ سے بھی انکی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ مرزا کی یادگار چار دیوان اور ایک مثنوی ہے

**خصوصیات کلام اور طرز کلام**

طرز کلام ان کا جداگانہ ہے۔ ان کو اُردو زبان کا مصلح مانا گیا ہے۔ نہایت قادر الکلام شاعر تھے۔ غزل کے جس قدر موضوع ہیں سب پر بخوبی حاوی تھے۔ بلاشبہ غزل کے بے نظیر شاعر تھے۔ انھیں نے نظم کو ثقیل الفاظ سے پاک کیا ہے ان کے اشعار میں صفائی بیان۔ شستگی زبان۔ برجستگیِ محاورات اور مضمون آفرینی بہت ہے چھوٹی چھوٹی بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں نہایت کامیابی سے غزل کہتے ہیں۔ الفاظ کے تھوڑے سے الٹ پھیر سے نیا مضمون پیدا کر دینا ان کا کمال ہے۔ مدحیہ قصیدے بھی نہایت کامیابی سے لکھے ہیں اور نہایت جوش وخروش سے لکھے ہیں۔ ہجو سے انھوں نے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ اسیر۔ تنیر۔ ظہیر۔ زکی۔ حالی۔ مجروح۔ سالک۔ جلال۔ امیر سب ان کی ہمہ گیری اور قادر الکلامی کے مداح و معترف ہیں

اس آفتاب شعریت کے تلامذہ ستارہ ہائے منتشر کی طرح ہین لیکن اس مین اکثر اپنے وقت کے بدر کامل ہو کر ضو فشان ہوئے ہین جضور نظام - بیخود بدایونی - بیخود دہلوی - مرزا سائل دہلوی - آغا شاعر دہلوی - ڈاکٹر اقبال بیباک - حیرت - آزاد - رسا - فیروز - اشک - نوح ناروی -

## غالب اسد اللہ خان غالب

سنہ ۱۷۹۶ء سنہ ۱۸۶۹ء - غالب کی ہستی نے دنیائے ادب اُردو مین ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا - اگرچہ ان کے ہمعصر شعرا کو ان سے ہمیشہ شکایت رہی کہ ان کے کلام کا سمجھنا صرف مشکل ہی نہین بلکہ ناممکن ہے اور ان کے مخصوص انداز کلام نے اپنے عہد مین فروغ نہ پایا - مگر زمانۂ حاضرہ نے انکی شاعری کا صرف لوہا ہی نہین مانا - بلکہ بڑے بڑے محققین اسپر متفق ہین کہ غالب دنیا کے زبردست شعراء کی صف اوّل مین پیش پیش ہے ان کی شاعری کے نکات و رموز کی شرح بڑے بڑے نقادان نے کی ہے - حالی کی یادگار غالب - دیباچہ دیوان غالب - از ڈاکٹر بجنوری - ——— شرح طباطبائی شرح حسرت موہانی . . . . . . . . . . . . یہ معرکتہ الآرا کتابین ہین خصوصًا یادگار غالب - اور مقدمہ بجنوری نے غالب کے فلسفیانہ رموز و نکات - مطالب بیان کرنے مین جو سعی عظیم کی ہے - وہ قابل صد ہزار تحسین ہے

ان کتابون کے بعد اگرچہ ضرورت تو نہین ہے ، کہ غالب پر بحث و تمحیص کا آغاز کیا جائے - تاہم ابھی تک بہت سے اشخاص مطمئن نہین ہوئے ہین - نگار مین آر گس نے جو غالب بے نقاب کے عنوان سے سرقہ و توارد کے تحت مین بحث چھیڑی تھی وہ عرصہ تک نیرنگ خیال مین اختتام کو نہین پہونچی -

---

## نسب و ابتدائی تعلیم

مرزا اسد اللہ خان غالب سنہ ۱۷۹۶ء مین آگرہ مین پیدا ہوئے یہ ایک شریف اور با رسوخ خاندان کے چشم و چراغ ہین - انکا نسب فریدون سے ملتا ہے - ان کے دادا وطن سے ہجرت کر کے دربار شاہ عالم ثانی مین آئے - ان کے والد مرزا عبد اللہ خان نے نواب اودھ - نظام حیدرآباد اور مہاراجہ الور کی ملازمتین اختیار کین - اور ایک قلعہ کے محاصرے مین جام شہادت نوش کیا - غالب نے اپنے چچا مرزا نصر اللہ خان کے سایۂ عاطفت مین پرورش پائی مگر شومیٔ بخت کہ غالب نو سال کے تھے کہ انہون نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا - بعد ازان اُن کی پرورش ان کے ننہال مین ہوئی - ابتدائی تعلیم شیخ معظم الدین اور میان نذیر اکبر آبادی سے حاصل کی - چودہ برس کے ہوئے تو ایک نووارد صاحب کمال سے فارسی مین استفادہ کیا - یہ نومسلم تھا - دو سال تک آگرہ اور دتی مین غالب ان کی محبت سے مستفید ہوئے - اور فارسی مین نہایت حیرت انگیز ترقی کی - سنہ ۱۲۲۵ھ مین نواب الٰہی بخش خان معروف کی دختر سے شادی ہوئی اور اس وقت دتی کی ادبی فضا شعر و شاعری سے معمور تھی - اور دتی مین شرفا کے مکانون پر کثرت سے مشاعرے ہوا کرتے تھے - بہت ممکن ہے کہ دہلی کی آمد و رفت اور تیزیٔ طبیعت نے اُردو شاعری کی طرف رجحان پیدا کر دیا ہو ابتدا میں فارسی میں ذوق سخن فرماتے تھے لیکن بعد کو اُردو میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے -

---

غالب نے کلکتہ۔ بنارس اور لکھنؤ کے سفر کئے اور ایک قصیدہ نواب اودھ کے وزیر کی شان مین اور ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر کی مدح مین لکھا۔ واجد علی شاہ نے پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔ جو ۱۸۵۶ء مین دو سال کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۸۳۷ء مین قماربازی کی تہمت مین ۳ ماہ کی قید بھی ہوئی مگر جیل مین بھی انکا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ ۱۸۴۲ء مین دہلی کالج کی پروفیسری ملتی تھی مگر نہین کی کیونکہ...... مسٹر ٹامس نے ان کی کافی تعظیم نہین کی۔ ۱۸۴۹ء مین بہادر شاہ ظفر نے ان کو نجم الدولہ دبیر الملک کے خطاب سے معزز فرمایا۔ اور بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار ان کو اپنے خاندان کی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا۔

اُستاد ذوق کے انتقال کے بعد غالب اُستاد شاہ ہوئے۔ ہنگامہ غدر کے بعد اس بنا پر کہ ان کے تعلقات قلعہ معلیٰ سے تھے بہت مصائب و آلام مین مبتلا ہوئے۔ لیکن پھر ان کی پنشن مقرر ہو گئی۔ اور ان کا لکھنؤ مین وقار از سر نو قائم ہو گیا۔ اور بعد کو نواب یوسف علی خان والئی رامپور کے اُستاد مقرر ہوئے ان کے دربار سے سو روپیہ ماہوار وظیفہ ہو گیا۔ جو ان کو تا حین حیات برابر ملتا رہا۔ ۱۸۶۹ء مین ۷۲ برس کی عمر مین دہلی مین انتقال کیا۔ اور درگاہ حضرت نظام الدین مین دفن ہوئے

**غالب کی سیرت**

غالب بہت زیادہ با مروت متواضع۔ ہمدرد۔ رحمدل اور خلیق تھے۔ مذہبی تعصب ان کو چھو بھی نہ گیا تھا۔ بہت سے ہندو شرفا ان کے دوست تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ سے ان کے بہت زیادہ مراسم تھے۔ یہ بہت آزاد خیال اور صاف دل تھے۔

آمدنی کے ذرائع متعدد تھے مگر نہایت مُسرف تھے۔ اس لئے ہمیشہ تنگ دستی مین بسر کی۔ خودداری کے ساتھ ہی طبیعت مین شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی

**غالب کی علمیت**

غالب کو فارسی مین کافی عبور تھا۔ ابتدا مین فارسی شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ مگر زمانہ کی رفتار دیکھ کر اُردو شاعری شروع کی۔ غالب بہت تیز طبیعت اور حاضر دماغ تھے اور اکثر فی البدیہہ اشعار فرمایا کرتے تھے۔ غالب ایک بڑے فلسفی و صوفی ایک جید عالم اور ایک جدت طراز شاعر تھے۔ غالب کو تصوف سے خاص دلچسپی تھی اور علم تصوف پر ان کو عبور کامل تھا۔ غالب چونکہ فطرتاً ایک فلسفی دل و دماغ لیکر آئے تھے لہذا ان کی شاعری مین یہ عنصر غالب ہے

**تصانیف**

عود ہندی۔ اُردوئے معلیٰ۔ کلیات فارسی۔ دیوانِ اُردو۔ لطائف غیبی۔ تیغ تیز۔ قاطع برہان۔ پنج آہنگ نامۂ غالب۔ مہر نیمروز دو سنبو۔ سبد گل ان کی مشہور تصانیف ہین۔ برہان قاطع غالب کی علمیت قابلیت اور تحقیق پر برہان قاطع ہے۔

**خصوصیات کلام**

سب سے بڑی خصوصیت جو غالب کو دوسرے اساتذہ سے ممیز کرتی ہے وہ ان کی جدت طرازی ہے۔ یہ جدت ان کے خیالات۔ تشبیہات و استعارات اور تخیل پر حاوی ہے۔ معمولی اور پامال مضمون مین بھی دلکشی اور ندرت کا رنگ کامیابی سے بھرا ہے۔ غالب نے اپنے کلام مین بہ نسبت الفاظ کے رفعت خیال کا زیادہ لحاظ رکھا ہے۔ اور خیالات کو الفاظ کے لباس سے اسطرح مزین کیا ہے جو صرف غالب ہی جیسے اُستادِ فن کا حق ہے

**طرز کلام** غالب اپنی شاعری مین زندگی کے ہر شعبہ پر تبصرہ کرتے ہین۔ مصائب کی دکھ بھری کہانیان اور تلخ تجربات سے ناظرین کو عبرت دلاتے ہین۔ نا امیدی، حسرت و یاس کی تصاویر خوب کھینچتے ہین

**فلسفہ** جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ غالب ایک زبردست فلسفی تھے۔ ان کا تمام کلام صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات سے مملو ہے غالب مذہب۔ مشرب۔ ملت کے تعصبات سے بالکل مبرا تھے

ہم موحد ہین ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتین جب مٹ گئین اجزائے ایمان ہو گئین

ان کا مطمح نظر عبادت کے بارے مین نہایت بلند ہے

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہین

جنت کی حقیقت ان کی نظرون مین اسقدر ہے

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

عبادت ان کی نظر مین صرف عبادت کے لئے کرنا چاہئے نہ حصول صلہ کے لئے

طاعت مین تا رہے نہ مے و انگبین کی لاگ دوزخ مین ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

غالب کے نزدیک انسان کا وجود ایک دائمی مصیبت ہے اور اس کا عدم اس کے وجود سے بہتر ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا۔ کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا مین تو کیا ہوتا

غالب ........ دنیا کے مصائب آلام کو بالکل ہیچ اور فانی خیال کرتے ہین۔ اور حقیقت یہ ہے کہ غالب نہایت حقیقت شناس نگاہ رکھتے ہین۔ فلسفیانہ مسائل اور دقیق نکات کو نہایت آسانی سے حل کرتے ہین۔

غالب پہلے شاعر ہین جنھون نے اردو مین فلسفیانہ شاعری کی مستقل بنیاد ڈالی اور وہ عمارت کھڑی کی کہ جسے دیکھ کر دنیا کے بڑے بڑے عالم بحر حیرت مین غرق ہو جاتے ہین۔ غالب اپنی طرز کے موجد اور واحد مالک ہین بیدل اور صوفیانہ خیالات کی تزئین کرنے مین اپنے دور کے مشہور شعراء کے دوش بدوش ہین۔ ان کے اشعار روحانی لذت اور تازگی بخشتے ہین۔ غالب کو بھی اس اہمیت پر بجا طور پر ناز ان ہین چنانچہ کہتے ہین

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

قدما مین صرف درد کے کلام مین جا بجا اکثر اسی رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ غالب کی شاعری علاوہ فلسفیانہ خیالات کے حقیقی جذبات سے بھری ہے۔ غالب نے زندگی کے تاریک پہلو پر کافی روشنی ڈالی ہے حسرت و یاس۔ اندوہ و غم۔ مصائب و آلام بدبختی تنگدستی کی خوب خوب تصویرین کھینچی ہیں

غالب وحدت الوجود کے قائل ہین۔ اور وہ خدا کو ماسوائے علیحدہ نہین خیال کرتے بلکہ ان کا مذہب ہمہ اوست ہے۔ فلسفہ مین کوئی سوال اس سے زیادہ مشکل نہین کہ دنیا کی آفرینش کس وجہ سے ہوئی

غالب اس کا جواب دیتے ہین اور کہتے ہین

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہین
ہم کہان ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بین
قید حیات و بند غم اصل مین دونون ایک ہین
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیون

غالب اپنے مغربی ہمعصر شیلی (انگریز شاعر) سے خودداری اور معصومانہ جذبات کے بے باکانہ اظہار مین بہت ملتے جلتے ہین۔ غالب اس کی کوئی وجہ نہین خیال کرتے کہ ان کو دنیا مین کیون نہ اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ وہ دنیاوی تکالیف پر نہایت آزادی سے دل کھول کر ماتم کرین

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیون
روئین گے ہم ہزار بار کوئی ہمین ستائے کیون

غالب کا یہ شعر جذبات ناامیدی کا حیرت انگیز آئینہ ہے۔ غالب کے اکثر سلیس اشعار مین بڑے بڑے معنی پنہان ہوتے ہین اُنھون نے وسیع سے وسیع مضمون کو جو کئی کئی اشعار مین ادا ہو سکتا ہے۔ ایک شعر مین نہایت آسانی سے ادا کر دیا مثلاً

ناکردہ گناہون کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہون کی سزا ہے

---

غالب ترا احوال سُنا دین گے ہم اُنکو
وہ سُن کے بلائین یہ اجارہ نہین لیتے

غالب کے اکثر اشعار ذو معنی ہین اس لئے ان کے مضمون مین بھی وسعت پیدا ہو گئی ہے

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

**غالب کا معاصرین سے موازنہ**

غالب اپنے معاصرین مین ذوق اور مومن سے بہت بڑھے ہوئے ہین۔ لیکن سلاست و آمد مین ذوق کا پلہ بھاری ہے۔ اور مومن کی زبان ان سے بہتر ہے۔ ان کی فلسفیانہ شاعری کا مقابلہ براوننگ سے ہو سکتا ہے، وہ بھی روح کا تجزیہ کیا کرتا ہے۔ مگر غالب روح مین اتنی دلچسپی نہین لیتے جتنا کہ وہ زندگی کے رموز اور اسرار کے انکشافات مین سرگرم ہین۔ اور اپنی یاس انگیز اور حسرت خیز شاعری مین (Heine) ہین کا مد مقابل ہے لیکن بہت موزون ہوگا اگر غالب کو اردو ادب کا گوئٹے (Goethe) کہا جائے۔

**تلامذہ**

غالب کے تلامذہ مین حسب ذیل بہت مشہور ہوئے۔ نواب ضیاء الدین نیر درخشان۔ مجروح۔ سالک۔ حالی۔ زکی۔ علوی۔ تفتہ۔ عزیز۔ مشتاق۔ جوہر۔

**مجروح**

میر مہدی مجروح میر حسین فگار کے لڑکے تھے۔ غدر مین دلی چھوڑ کر پانی پت چلے گئے۔ بعد غدر پھر دلی آئے اور نواب حامد علی خان والی رامپور کے دربار مین وظیفہ خوار ہوئے۔ مجروح کے کلام مین آمد۔ صفائی و سلاست۔ بدرجہ اتم ہے چھوٹی چھوٹی بحرون مین خوب طبع آزمائی کرتے ہین ان کے کلام مین ندرت نہین ہے تاہم کمزوریون سے پاک ہے اور اُستادانہ رنگ جھلکتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء مین انتقال کیا

**سالک**۔ مرزا قربان علی سالک نواب مرزا عالم بیگ کے لڑکے تھے۔ حیدرآباد مین پیدا ہوئے۔ ابتدا مین قربان تخلص کرتے تھے۔

مومن خان کے انتقال کے بعد غالب کو غزل دکھانے لگے اور سالک تخلص اختیار کیا۔ ایام غدر مین دلی چھوڑ کر الور چلے گئے اور عرصہ تک وہان وکالت کرتے رہے۔ اس کے بعد حیدرآباد مین محکمہ تعلیم مین سررشتہ دار ہو گئے۔ اور رسالہ مخزن الفوائد کی اڈیٹری بھی کی۔ ان کا دیوان موسوم بہ بنجار سالک ہے سنہ ۱۸۸۰ء مین حیدرآباد مین انتقال کیا مثل مجروح کے انکے یہان بھی تازگی مضمون کی کمی ہے۔ رفعت تخیل۔ اور آمد ان کے کلام مین بہت ہے۔ دلی کی بربادی پر سالک شہر آشوب اور غالب کا مرثیہ بہت مشہور ہے

### زکی

نواب سید محمد زکریا خان رضوی المتخلص بہ زکی۔ ان کے والد نواب سید محمد خان اور نانا نواب اعظم الدولہ میر محمد خان معظم جنگ سرور یہ دونون صاحب دیوان اور مصنف تھے۔ ان کے نانا نے ایک تذکرہ اُردو شعرا کا لکھا ہے۔ زکی اُردو فارسی۔ عربی کے عالم تھے۔ طبابت اور قانون تصوف مین بھی دستگاہ تام رکھتے تھے۔ نجوم۔ موسیقی اور خوشنویسی مین ماہر تھے۔ مولانا صہبائی اور پنڈت رام کشن نسبل ان کے معلم رہے۔ شاعری مین غالب کے سامنے زانوے ادب تہ کیا۔ غالب سے ان کے خاندانی تعلقات بھی تھے۔ غالب نے ان کو ایک سند بھی دی جو ان کے دیوان مین موجود ہے۔ بہت پرگو شاعر تھے۔ مشاعرون مین نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ غالب کے کلام کی بہت سی خصوصیات ان کے ہان پائی جاتی ہین غرض ان کو اُستاد تسلیم کیا گیا ہے۔ رفعت خیال۔ پرواز تخیل ان کے کلام مین خاص طور سے نمایان ہے۔ ایام غدر مین ان کو بھی مثل دیگر شعراء کے دلی کو خیرباد کہنا پڑا اور گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کی۔ بدایون مین ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۱ء مین پنشن لی سنہ ۱۹۰۳ء مین انتقال کیا

زکی کے دیوان ان کے حین حیات ہی مین طبع ہو گئے تھے اور یہ زکی کی شاعری کی زندہ یادگار ہے۔ سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ اور پنڈت جواہر ناتھ کول ان کے مشہور شاگرد ہین

### درخشان

نواب ضیاء الدین خان نیر درخشان۔ درخشان اُردو مین اور نیر فارسی مین تخلص رکھتے تھے۔ یہ غالب کے جانشین خیال کئے جاتے ہین۔ نیر بہت زبردست نقاد تھے۔ بڑے عالم اور منطقی تھے۔ لوگ ان کی نہایت وقعت واحترام کرتے تھے۔ مشہور مورخ ایلیٹ ( ) کو انھون نے تاریخ لکھنے مین بہت مدد دی۔ ان کے لڑکے نواب شہاب الدین خان ثاقب۔ غالب کے بھانجے تھے۔ نیر بہت ہی ہوشیار شاعر تھے۔ مگر عین عالم شباب مین قضا کر گئے۔ نواب مرزا سعید الدین خان طالب ان کے دوسرے لڑکے تھے۔

### تابان

سر شجاع الدین خان تابان ثاقب کے بڑے لڑکے اور نیر کے پوتے تھے شادان اور داغ کے شاگرد تھے۔ مرزا باقر علی خان کامل یہ غالب کے متبنّی مین۔ انکی لڑکی سے تابان کی شادی ہوئی تھی۔ نواب مرزا سراج الدین احمد خان سائل ثاقب کے دوسرے لڑکے اور نیر کے پوتے ہین۔ داغ کے بہت مشہور شاگرد اور اپنے وقت کے مسلم الثبوت اُستاد ہین

### آزردہ

مولوی مفتی صدر الدین خان آزردہ صدر الصدور تھے اور اپنے زمانہ کے زبردست عالم تھے۔ مولانا شاہ عبد العزیز اور مولوی فضل امام سے تعلیم حاصل کی۔ عربی فارسی کے جید عالم تھے۔ اُردو پر کامل عبور تھا۔ نواب یوسف علی خان والی رامپور اور نواب صدیق حسن خان بھوپالی کے اتالیق رہے اور سر سید احمد خان نے بھی انکے سامنے زانوے ادب

نہ کیا تھا۔ علم سے ان کو خاص شغف تھا اور اس درجہ انہماک کہ عدالت کے کام کے بعد اکثر تشنہ کامان علم کو سیراب کیا کرتے تھے۔ مومن غالب۔ صہبائی۔ ذوق۔ شیفتہ۔ درخشان سے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ عربی۔ فارسی اور اردو مین شعر کہتے تھے۔ اردو مین پہلے شاہ نصیر سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ پھر محرم اکبرآبادی اور ان کے بعد میر ممنون کے شاگرد ہوئے۔ ان کے اشعار سلیس صاف اور موثر ہین۔ اردو شعراء کا ایک تذکرہ موسوم بہ "تذکرۂ آزردہ" بھی یادگار ہے۔ لیکن یہ شاعری اردو کی وجہ سے اس قدر مشہور نہین ہے جتنے کہ اپنے اثر اور رسوخ کی وجہ سے۔ سنہ ۱۸۶۹ء مین دلی مین انتقال کیا۔

**مومن**

حکیم مومن خان مومن حکیم غلام نبی خان کے بیٹے تھے سنہ ۱۲۱۵ھ مین پیدا ہوئے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو مولانا شاہ عبدالقادر علیہ الرحمۃ سے عربی کی کتابین پڑھین جب استعداد درست ہو گئی۔ تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خان اور حکیم غلام حسن خان سے طب کی کتابین پڑھین۔ اور انھین کی زیر نگرانی۔ نسخہ نویسی کی

مومن خان کو بچپن ہی سے شاعری کا چسکا پڑ گیا تھا۔ انکی ذہانت اور حیرت انگیز حافظے نے ان کو شاعری مین بہت مدد دی۔ یہ عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ نجوم اور رمل مین بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ مزاج مین وارفتگی اور شوریدگی نہایت درجہ تھی شہر مین بانکون مین آپ کا شمار تھا۔ رنگینی طبع و رنگین مزاجی کے ساتھ خوش وضع اور خوش لباس آدمی تھے۔ غزل دردانگیز آواز اور دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے۔ مگر یہ رشتہ شاگردی بہت جلد منقطع ہو گیا۔ مومن بہت زیادہ مغرور تھے۔ اساتذہ سابقہ کا نام اکثر تحقیر سے لیتے تھے۔ میدانِ شاعری مین اپنے سے زیادہ کسی کو شہسوار نہ سمجھتے تھے اور اپنے معاصرین مثلاً ذوق اور غالب کو خاطر مین نہ لاتے تھے۔ انھین وجوہ سے قلعہ معلی مین کچھ زیادہ اعزاز نہ پایا اور نہ کبھی اُسکی پروا کی۔

**تصنیف**

آپکا ایک دیوانِ اردو ان کے شاگرد رشید شیفتہ نے ترتیب دیا اور سنہ ۱۸۴۶ء مین کریم الدین مصنف تذکرۂ شعرائے ہند نے شائع کیا۔ علاوہ دیوان کے ان کی چھ مثنویان بھی انکی یادگار ہین۔ ایک مثنوی جہادیہ ہے جو اسوقت لکھی تھی جب ان کے پیر و مرشد سید احمد شہید سکھون سے جہاد کر رہے تھے۔

**خصوصیاتِ کلام مومن**

مومن اپنی رفعت خیالی۔ پرواز تخیل کے لیے مشہور ہین۔ ان کی تشبیہ اور استعارے نگاہ عوام سے بالا ہین۔ ان کے اشعار مین بلندیٔ خیال اور حقیقی شاعری کا خلا ملا بہت ہے۔ ان کے کلام مین عشق کی اصلی چاشنی اور شاعری کی حقیقی حلاوت کا اجتماع بطریق احسن ہے۔ مومن کے یہان غیر مانوس استعارے اور تشبیہ کی کمی ہے۔ غالب کی طرح مومن نے بھی فارسی ترکیبین۔ محاورے اور الفاظ بے تکان استعمال کئے ہین۔ مگر ہمارے نزدیک اکثر انکی "فارسیت" نے ان کے اشعار کو پھیکا کر دیا ہے۔ اور اس میدان مین یہ غالب سے سبقت نہ لیجا سکے

ان کی مثنویان ادب اردو کی سرمایۂ ناز ہین جو بہت دردانگیز اور حقیقی جذبات سے پُر ہین۔ اور عاشقانہ تاثرات اور محاکات سے لبریز ہین۔ ان کی مثنویان اردو کی مشہور مثنویون سے ہم پایہ ہین۔ ان کی کلیات مین قصائد بھی ہین۔ جو اپنے رنگ مین بلند رتبہ رکھتے ہین۔ مگر انھون نے صلہ کی امید پر ارباب دنیا کی مدح مین کبھی قصیدہ نہین کہا۔ مومن کو تاریخ گوئی مین بھی کافی مشق تھی

آزاد نے مومن کے کلام پر حسب ذیل رائے کا اظہار کیا ہے۔

"ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین بہت عالی ہیں" آگے چلکر لکھتے ہیں "یہ معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ہیں۔ اس واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اسکا انداز جرأت سے ملتا ہے۔ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صفتِ خاص کے لحاظ سے ذاتِ شے کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب۔ لطیف معانی پیدا کرتے ہیں۔ اکثر عمدہ ترکیبیں اور نادر تراشیدہ فارسی کے استعارے اور اضافتیں اردو میں استعمال کرکے کلام کو نگین کرتے ہیں" مومن خان کے ہمعصروں میں مبلغ فکر کے موافق لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کرنے میں مرزا غالب نے نمایاں حصّہ لیا ہے۔ مگر جیسا کہ خود مولانا حالی نے یادگار غالب میں ایک موقع پر تسلیم کیا ہے۔ مومن خان مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن خان نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت اور لطافت پیدا کردی ہے۔ وہ اُنکی ذہانت اور جولانیٔ طبیعت کی تماشا گاہ ہے ان کی طرز ادا میں ایک بات اور بھی ہے جسکو مولانا شبلی نے شعر العجم میں خصوصیات غالب میں بیان کیا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ مرزا غالب بھی ان کے ساتھ شریک ہیں مگر مومن کے کلام میں بھی یہ بات بہت نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزاء چھوڑ جاتے ہیں، جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ موقع ہوتا ہے جہاں سننے والے کا ذہن خود بخود اُن اجزاء کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے۔ مومن کو اس طرز کا اُستاد مانا گیا ہے۔ حیرت۔ نسیم اور تسلیم اس طرز کے علمبردار ہیں

**ارشد تلامذہ** ان کے مشہور شاگرد تسکین۔ وحشت۔ نواب قیصر۔ نسیم اور شیفتہ خصوصاً قابل ذکر ہیں نمونہ کلام یہ ہے:-

شبِ وصل آپ کا عذر نزاکت　　بجا ہے پر نہ مجھ سے نیم جان سے

---

نہ جائے کیوں دل مرغ چمن کہ سیکھ گئی　　بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

---

یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی　　نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

---

جانا حرام ہجر بتان میں تو کیا گناہ　　پیر مغان شراب ہے شیشہ میں سم نہیں

---

خار بستر پہ شب ہجر بچھاؤں کیونکر　　دل میں تو ہے وہ گل اندام اگر بر میں نہیں

---

تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کرلے　　ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے

---

شبِ ہجر مین کیسا ہجوم بلا ہے
زبان تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

---

اشکِ تغان کی ہائے رقیب آفرینیان
محشر نے خفتگانِ زمین کو جگا دیا

---

وہ علی الرغم عدو مجھ پر کرم کرتے ہین
ہے ستم لطف کے پردے مین ستم کرتے ہین

---

چارہ گر اس کی خطا کیا مرے تن مین نہ رہا
خون اتنا کہ سرِ نشتر فصاد بھرے

---

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہین صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھے اپنی نظر نہ ہو جائے

---

اُس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

---

بجھ گئی اک آہ مین شمع حیات
مجھ کو دم سرد نے ٹھنڈا کیا

---

ڈوبی ہجوم اشک سے کشتی زمین کی
ماہی کو اضطراب ہوا جوش آب مین

پھرنے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سو رہے
آرام شکوۂ ستمِ اضطراب تھا

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
مین الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

جیب درست لائق لطف و کرم نہین
ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہین

دشنام یار طبع حزین پر گران نہین
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

درد ہے جان کے عوض ہو رگ و پے مین ساری
چارہ گر ہم نہین ہونے کے جو درمان ہوگا

اُلجھا ہے پاؤن یار کا زلف دراز مین
لو آپ اپنے دام مین صیاد آگیا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہین ہوتا

جذب دل اُسے کھینچ کے لائے تو کہان لائے
جو غیر کا گھر ہے وہی مسکن ہے ہمارا

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا　　مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہین

ڈرتا ہون آسمان سے بجلی نہ گر پڑے　　صیاد کی نگاہ سوئے آشیان نہین

اس ضعف مین تو سینے سے آتا ہے لب تک　　کہتے ہین اپنے نالے کو ہم نارسا عبث

جی اُٹھے اور وہی رنج محبت کا عذاب　　ہم نہ مانین گے کہ ایذا تری ٹھوکر مین نہین

چھُٹ کر کہان اسیر محبت کی زندگی　　ناصح یہ بند غم نہین قید حیات ہے

کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم　　کہین پامال سر نہ ہو جائے

وہ آئے ہین پشیمان لاش پر اب　　تجھے اے زندگی لاؤن کہان سے

مانگا کرین گے اب سے دعا ہجر یار کی　　آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

خون چھپانے کو مری لاش سے کہتا ہے وہ شوخ　　مجھ کو یہ غم ہے کہ مین کیون ترا قاتل نہوا

سرمگین آنکھون سے تم نامہ لگاتے کیون ہو　　خاک مین نام کو دشمن کے ملاتے کیون ہو

ہم رنگ لاغری سے ہون گل کی شمیم کا　　طوفان باد ہے مجھے جھونکا نسیم کا

ہر دم رہین کشمکش دست یار مین　　چلمن کے تار کس کے گریبان کے تار ہین

**شیفتہ**

نواب مصطفےٰ خان شیفتہ۔ بلند پایہ اور پرگو شاعر تھے فارسی مین حسرتی اور اردو مین شیفتہ تخلص کرتے۔ فارسی مین غالب سے اصلاح لیتے اور اردو مین مومن سے۔ اس دور کے مشاہیر شعراء مولوی امام بخش صہبائی۔ علوی۔ آزردہ غالب۔ ذوق۔ نصیر۔ رحمان۔ تسکین۔ عیش سے دوستانہ مراسم تھے۔ شیفتہ اور آزردہ کے یہان ہر ہفتہ باری باری مجلس مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی۔ اور اہل کمال جمع ہو کر لطف سخن اُٹھاتے تھے بعد فراغت حج شاعری سے قریب قریب دستکش ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے اصرار پر لکھ لیا کرتے تھے۔ فنِ شاعری کے زبردست نقاد تھے ان کے معاصرین ان کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔ بقول مصنف "گلِ رعنا" "اس زمانہ مین نواب کی سخن گوئی سے زیادہ ان کی سخن فہمی کی دھوم تھی۔ مرزا نوشہ غالب تک ان کی سخن فہمی کے معترف اور مداح تھے۔ مرزا کے نزدیک نواب کی پسند شعر کے حسن و قبح کا معیار تھی۔

چنانچہ فرماتے ہین:-

غالب بفن گفتگو ناز د بایں زورش کہ او　　ننوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خان خوش نکرد

ان کا تذکرہ شعرا "گلشن بیخار" ایک اہم تصنیف اور شعراء اُردو کے کلام پر بہترین تنقید ہے۔ شیفتہ اپنی آزادانہ اور صحیح رائے کے لئے مشہور ہین۔ انھون نے مومن کا رنگ و طرز اختیار کیا۔ تصوف اور اخلاق ان کی شاعری کی خصوصیات ہین۔ اگرچہ ان کی غزلین بہت مشہور نہین ہین۔ تاہم زبان کی صفائی۔ اور شستگی اور جذبات نگاری مین کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کے لڑکے نواب اسحاق خان نے ان کا دیوان ۱۹۱۵ء مین شائع کرایا۔ علاوہ دیوانِ اُردو و گلشن بیخار کے انکی تصانیف حسب ذیل ہین فارسی دیوان اور ایک مجموعہ فارسی انشاء

پروازی کا۔ ایک سفرنامہ ترغیب السالک جس کا فارسی نام "کار اُردو" بھی ہے ۶۳ سال کی عمر مین ۱۲۸۶ھ مین انتقال کیا۔ بطور نمونہ کلام حسب ذیل اشعار پیش کئے جاتے ہین

کیا جانے گذری غیر پہ کیا اس کی بزم مین
آئے وہ اس طرح سے مجھے پیار آگیا

اے تاب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی
کچھ رہ گئے ہین خار و خس آشیان ہنوز

کس لئے لطف کی باتین ہین پھر
کیا کوئی اور ستم یاد آیا

اے جان لب پہ آکے ٹھہرنے سے فائدہ
رہنا ہوا تو رہ گئے چلنا ہوا چلے

سحر انکا ارادہ ہے سفر کا
قیامت آنے مین شب درمیان ہے

نہ دیا ہائے مجھے لذت آزار سے چین
دل ہوا رنج سے خالی بھی تو دل بھر آیا

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی
صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

یا اپنے جوش عشوۂ بیہم کو تھامئے
یا کیجئے مین بھی نالۂ شورش ادا کرون

اک تیم ناز بس ہے ہمارے ہلاک کو
کچھ بھی نہ کیجے دیکھ کے بس مسکرائیے

رمز:۔ مرزا فخر الدین نام مرزا فتح الملک شاہ بہادر خطاب عرف مرزا فخرو رمز تخلص کرتے تھے شاہ ظفر کے منجھلے بیٹے تھے۔ مرزا محمد دارا بخت عرف مرزا شبو ولی عہد سلطنت کے انتقال کے بعد ۱۸۴۹ء مین ولی عہد سلطنت ہوئے مگر غدر سے پہلے ہی دس جولائی کو ۱۸۵۲ء مین ۴۰ سال کی عمر مین انتقال کیا۔

حضرت رمز کی اوّل تو ٹکسالی زبان اور اس پر خاقانی ہند حضرت ذوق کی شاگردی کا طرہ خود ہی گویا ہے۔ کہ انکا کلام کس درجہ فصیح و بلیغ ہوگا کلام مین شیرینی اور گھلاوٹ صفائی سلاست اور دلکشی ہے اشعار مین اکثر مطالب شاعرانہ بہت خوبی سے ادا کئے گئے ہین۔ پرواز تخیل و مضمون آفرینی نے کلام مین چار چاند لگا دئے ہین۔ انکا دیوان مرتب ہو گیا لیکن ۱۸۵۷ء مین سلطنت کے ساتھ یہ بھی نیست و نابود ہو گیا نمونۂ کلام یہ ہے:۔

غم وہ کیا ہے جو جان گزا نہ ہوا
درد وہ کیسا جو لا دوا نہ ہوا

حال کھلجا ہین غیر کے سارے
پر کرون کیا کہ تو مرا نہ ہوا

درد کیا جس مین کچھ نہ ہو تاثیر
بات کیا جس مین کچھ مزا نہ ہوا

وہ تو ستا پر اسے دل کم ظرف
تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا

شکوۂ یار اور زبان رقیب
کھیل ٹھہرا کوئی گلہ نہ ہوا

تم رہو اور مجمع اغیار
میرا کیا ہے ہوا ہوا نہ ہوا

پر تمھارے ستم اُٹھانے کو
رمز اچھا ہوا برا نہ ہوا

دیکھتے ہین سارے عالم کا تماشا دل مین ہم
ساغر دل اپنا رشک جام جمشید ا ہوا

مین وہ مجنون ہون کہ جس کے باغ جنت مین بھی نر  
خاک صحرائے جنون زیر قدم پیدا ہوا

جا پڑے ہم کوچۂ جانان مین رمز  
بارے اپنا بھی ٹھکانا ہو گیا

لیگئی دلکو تری کاکل پریشان میرا  
تا دم مرگ رہا حال پریشان میرا

چھوڑون کس طرح سے مین دامن صحرا کو جنون  
خار صحرا ہی نہین چھوڑتے دامان میرا

بیتابیون سے اس دلِ خانہ خراب کی  
کیا کیا ! کیا ہے اور نہ کیا کیا ! کرینگے ہم

ساقی مری توبہ کے ٹھہرنے کے نہین پاؤن  
گر جھوم آئیگا سحاب ایسے مزے مین

تنویر :- سخن ور، خوش تقریر منشی نوازش حسین خان تنویر دہلوی خواص حضرت ابو ظفر بہادر شاہ ثانی۔ شعر گوئی مین کہنہ مشق تھے۔ غدر کے بعد مہاراجہ تہوہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ بڑے پُر گو تھے ان کے چار دیوان انکے بیٹے حشمت خان پذیر نے چھپوا دئے ہین۔ ان کا بیان ہے کہ ظفر ذوق کے انتقال کے بعد انکو اپنی غزل دکھاتے تھے مگر راقم کے زعم مین یہ دعویٰ پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس بیان کے برعکس تذکرہ گلستان سخن سے پایا جاتا ہے کہ خود اپنے کلام مین بادشاہ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اور یہ امر قرین قیاس بھی ہے۔ تنویر مرحوم کے شاگردون مین مہاراجہ تہوہ متخلص بہ تصویر اور پنڈت امرناتھ آشفتہ مشہور ہوئے۔ ۱۲۸۹ھ مین بعمر ساٹھ سال بمقام نیپال انتقال کیا۔ آخر عمر مین دنیا چھوڑ کر وہین جا بسے تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

ہے مسیحائی کرتی جبین پر ناز ان لبون سے ہمین جواب ملا  
توڑے گا سمجھ کے شیشۂ دل یہ کوئی ساغر و سبو نہ ہوا

بے بیکے توڑتے ہین یہ یارب پرائے دل  
کیون ایسے نازنینون کے پتھر بنائے دل

خاک ناصح کی سُنون جان تو قابو مین نہین  
دل وہ غارت گرِ ایمان لئے بیٹھے ہین

یہ تم ہی ہو کہ خواہش بوسہ پہ ہان نہ کی  
تم جان تک بھی مانگو تو ہم سے نہین نہ ہو

ہلتے ہین لب نہ ضعف سے اُٹھ سکتے ہاتھ ہین  
کیا کیا شکایتین ہین اثر کو دعا کے ساتھ

عارف :- زین العابدین خان المتخلص بہ عارف بڑے ذہین اور طباع تھے۔ غالب کے بھانجے تھے۔ اور انھین کے شاگرد تھے۔ کچھ عرصہ تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی تھی شرفائے دلی مین بہت با رسوخ تھے۔ جوانی مین انتقال کیا۔ مرزا غالب نے انکا مرثیہ لکھا ہے ان کے کلام مین سوز و گداز بہت ہے۔ زبان صاف اور سلیس ہے

اُٹھتا قدم ہو آگے کو اے نامہ بر نہین  
پیچھے تو چھوڑ آئے کہین اس کا گھر نہین

اُس کو ہو تو ہو ہمین مرنے سے ڈر نہین  
خط لیکے ہم ہی جاتے ہین گر نامہ بر نہین

بے التفاتیون کا ترے شکوہ کیا کرین  
اپنے ہی جبکہ نالۂ دل مین اثر نہین

تشنہ :- منشی محمد علی تشنہ تخلص کرتے تھے۔ ذوق کے شاگرد تھے انکے انتقال کے بعد حکیم آغا جان عیش سے اصلاح سخن لی۔ ان کا حافظہ غیر معمولی طور سے قوی تھا سیکڑون شعر نوک زبان پر تھے۔ ادھر شعر سُنا اور اُدھر ان کو یاد ہوا۔ ان مین ایک عیب تھا کہ اُستادونکا کلام

اپنا مقطع ڈالکر مشاعرے مین پڑھ دیا کرتے تھے۔ لیکن شعر خوب کہتے تھے۔ بان پر خوب عبور تھا۔ ان کی غزلین ان کی حیات مین بھی بہت مشہور ہو گئی تھین۔ ان کے کلام مین بلند پایہ اور عدیم النظیر اشعارے پائے جاتے ہین جس سے ان کا اُستادی مسلم ہوتا ہے۔

**تصویر:-** شیخ غلام احمد عرف میان مین۔ تصویر تخلص تھا۔ لکھے پڑھے کچھ بھی نہین تھے۔ یہ سمجھئے کہ پنجہ بندی پر گزر تھی۔ لیکن طبیعت غضب کی پائی تھی۔ میان تنویر کے شاگرد تھے۔ لیکن ان کی تیزی طبع کی وجہ سے اُستاد شاگرد مین چل گئی شاید تصویر پھر کسی کے شاگرد نہین ہوئے۔ کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ سر مشاعرہ مین پل جایا کرتے تھے۔

**خصوصیت کلام:-** کلام کا شہرت نہ پانا اور بات ہے مگر جیسا ملکہ راسخہ اور مذاق سلیم ان کے اشعار سے ظاہر ہے۔ یہ بات بڑے بڑے جید عالمون کے کلام مین بھی نہین پائی جاتی، ہر شعر مین کوئی نہ کوئی بات ایسی نکلتی ہے کہ بے ساختہ دل مین چٹکی لیتی ہے۔ پرواز تخیل معاملہ بندی مضامین کی ندرت۔ بندش کی چستی ان کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ہین۔ سُنا ہے کہ جب مشاعرون مین غزل پڑھتے تھے تو اکثر اچھے اچھے مشاق شاعرون کے ہوش اُڑ جاتے تھے:-

برچھی تری نگاہ کی پہلو مین آ لگی
پہلو سے دل مین دل سے کلیجے مین آ لگی

دامن پہ وہ رکے نہ رکے دل پر آ لگی
لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آ لگی

**شہرت:-** مرزا حاجی تخلص شہرت۔ یہ بہت بنے سنورے رہتے تھے۔ پہلے خود انکے مکان پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مگر چند وجوہ سے بند ہو گئے یہ آزردہ کے شاگرد تھے شعر کہتے بھی خوب تھے۔ اور پڑھتے اس طرح سے تھے کہ دل مین اتر جاتا تھا مشاعرے مین ان کی غزل بہت کامیاب رہتی تھی۔ نمونۂ کلام یہ ہے

ایکدن دو دن کہان تک تو بھی کچھ انصاف کر
یہ تو جلنا روز کا اے سوز ہجران ہو گیا

پہلے دعوئے خدائی اس بت کافر کو تھا
کچھ درستی پہ جو آج آیا تو انسان ہو گیا

**رسا:-** مرزا کریم الدین گورگانی تخلص رسا۔ حافظ غلام رسول شوق کے شاگرد، پرانے سخن سنج تھے۔ اسی سال کی عمر پاکر غدر سے پیشتر انتقال کیا۔ ان کے بڑے صاحبزادے مرزا رحیم بیگ حیا بڑے نامی شاعر گذرے ہین۔ رسا صاحب دیوان تھے مگر کلام غدر کی لوٹ کی نذر ہوا۔ یہ چند شعر ملے جو درج کئے جاتے ہین

بے وفاؤن سے اے رسا تمنے
سچ کہو دل لگاکے کیا پایا

پریشان حالون کی جب قدر جانو
جو اس طرح ہو دل پریشان تمھارا

دل و دین و قرار و ہوش تک تو دیدیا تمکو
سوا اس کے وہ کیا تھا اور جو ہمنے چھپا رکھا

تم کہو دل دے کے دکھلاؤن نہ اپنی شکل مین
ہم کہین دیکھا کرین صورت تمھاری رات دن

باز آ ستاتو ہمکو بہت عشوہ گر نہین
کرتا کسی پہ ظلم کوئی اس قدر نہین

**صابر:-** مرزا قادر بخش تخلص صابر۔ ان کی شاعری کی قلعہ مین بڑی دھوم تھی۔ خود ان کو بھی اپنے کلام پر بہت ناز تھا۔ شعراء دلی کا ایک تذکرہ لکھا ہے۔ مگر کہتے ہین کہ یہ مولانا صہبائی نے لکھ کر دیدیا ہے۔ ایک قطعہ مین اُنھون نے اپنا حال اس طرح بیان کیا ہے۔

**قطعہ**

پہلے اُستاد تھے احسان و نصیر و ممنون　　ہوئی احسان سے پر اصلاح پہ طبیعت میری
پھر ہوا حضرتِ صہبائی کی اصلاح کا فیض　　طبع باریک ہوئی ان کی بدولت میری
اور ہم بزم رہے مومن و ذوق و غالب　　اوستادون ہی سے ہر دم رہی صحبت میری
فضل و ہنر ذات پہ ہے جنکی تمام　　مانتے ہین وہی اشخاص فضیلت میری
منعقد ہوتی ہے جب شہر مین بزمِ انشا　　کرتے ہین اہل سخن وقعت و عزت میری

**فراق**:- ثناء اللہ خان فراق تخلص۔ حکیم ہدایت اللہ خان ہدایت کے بھتیجے تھے۔ خواجہ میر درد کے شاگرد رشید۔ علم طب مین بھی دستگاہ تام رکھتے تھے۔ اور مشہور اطباء مین شمار تھا فراق بھی دربار ظفر کے شعراء مین سے تھے۔ اسی سے زیادہ حال نہین ملا اور نہ سال وفات کا پتہ چلا نہ انکے تلامذہ معلوم ہو سکے۔ مصحفی اپنے تذکرہ مین لکھتے ہین "جوان حلیم و سلیم۔ خوش فکر و شیرین گفتار۔ شعر از خواجہ میر درد بلکہ ذات شریف ہمیشہ می کرد۔ آخر آخر پیش حشیم حقیر تحصیل علم طب کردہ نام بطبابت آورد" چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہین۔

جون ریگ روان خانہ نشین ہون مین ازلسے　　نے قصد وطن کا نہ ارادہ ہے سفر کا
دل تھا منا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ　　ساغر کو دیکھتا کہ مین شیشہ سنبھالتا
صاف دلکو کیا اور داغ جگر کو دھویا　　کام کیا کیا نہ میرے دیدۂ تر سے نکلا
ہر غنچہ مین بو ہے تری ہر گل مین ترا رنگ　　جس پر بھی تری شکل و شمائل نہین معلوم
مجنون کے سوا دیکھیئے اب دشت جنون مین　　ہو کون فراق اپنے مقابل نہین معلوم

**عیش**:- حکیم آغا جان عیش تخلص کرتے تھے۔ کہن سال۔ مشاق۔ اور زندہ دل شاعر تھے۔ محمد حسین صاحب آزاد لکھتے ہین۔ "بادشاہی اور خاندانی طبیب تھے زیور علم اور لباس کمال سے آراستہ۔ صاحب خلاق۔ شیرین کلام۔ شگفتہ صورت شعر کا عشق تھا۔ طبیعت ایسی ظریف اور بذلہ سنج پائی تھی کہ جسے شاعری کی جان کہتے ہین۔ غزل صفائی کلام۔ شوخیِ مضامین اور حسن زبان۔ سے پھولونکی جھڑی ہوتی تھی"

عیش۔ غالب کی وقت پسندی کے نہایت شاکی تھے۔ ایک دفعہ اجمیری دروازہ مین مشاعرہ ہوا۔ انھون نے غزل طرحی میں قطعہ پڑھا اور مرزا پر چوٹ کر بیٹھے

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزا کہنے کا جب ہے اِک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے　　مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھین یا خدا سمجھے

اس بیجا حملہ نے اساتذہ کے دلون مین رنجش پیدا کر دی مگر رفتہ رفتہ صفائی ہو گئی۔ ایک بار قلعہ مین مشاعرہ منعقد ہوا۔ زمین غزل تھی۔ یار دے بہار دے روزگار دے۔ عیش اور ذوق دونون اُستادون کی غزلین ہو ئین جسمین شمع کو دونون اُستادون نے اپنی اپنی غزل میں باندھا۔ اور خوب باندھا۔

طاہرہ خاتون

# کامیاب دوائیں

ذیل میں جو دوائیں آپ ملاحظہ فرمائینگے انمیں سے ہر دوا مجرب اور زود اثر ہے جنکی صداقت آپکو ایکمرتبہ آزمانے پر معلوم ہوگی

**سفوف اعجاز مسیحا** | یہ کوئی کشتہ نہیں ہے مگر صرف ایک ہی کے استعمال سے مردہ جسموں میں روح پہونچ جاتی ہے تمام مسلوب شدہ طاقت واپس آجاتی ہے خواہ وہ کسی بے عنوانی کیوجہ سے کیوں نہو معدے کے تمام افعال درست ہوکر خون صالح پیدا ہوتا ہے اور چند روز کے استعمال میں چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے۔
قیمت فی شیشی جو مکمل علاج کے لئے کافی ہے۔ ــ ــ ــ ــ (للعہ)

**روغن کامیاب** | تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اعصاب وغیرہ کے درست کرنے میں کوئی دوا اس سے زیادہ زود اثر نہیں پہلے ہی دن سے اپنا اثر شروع کرتا ہے اور گیارہ روز میں بالکل تندرست بنا دیتا ہے قیمت فی شیشی ــ ــ ــ ــ (للعہ)

**حبوب اسرار** | تمام عیش و نشاط صرف ایک گولی میں پوشیدہ ہے حقیقتاً اگر اسکو لطف زندگی کہا جائے تو بالکل درست ہے قیمت فی درجن (سے)

**حبوب معدہ** | معدہ کی تمام خرابیاں، بھوک نہ لگنا، قبض دائمی رہنا، ریاح باسوری کی شکایت جلن متلی کھٹی ڈکار وں جگر کے فعل درست کرنے کیلئے اکسیر ہے صرف ایک گولی ہر غذا کے بعد کھائی جاتی ہے قیمت ۸۰ گولیوں کی ــ ــ ــ (ے) (ترکیب دوا کا پرچہ ہمراہ ہوگا)۔

مینیجر دار الحکمت نیا گاؤں لکھنؤ

## سب اشیاء کی یکجائی قیمت صرف دس روپے عنہ

مندرجہ ذیل پانچوں اشیاء قیمتی اکیس روپیہ یکبارگی طلب کرنے پر معہ محصول ڈاک صرف دس روپیہ میں روانہ کی جائیں گی، ہمارا مقصد اپنی شہرت کے لئے قلیل منافع پر بہترین اشیاء خریداروں کو بہم پہنچانا ہے۔ مینیجر حبیب واچ ہاؤس اجمیری گیٹ دہلی۔

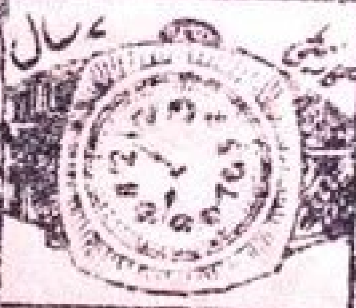

### فینسی رسٹ واچ

۲۲ کریٹ گولڈ پلیٹڈ رسٹ واچ اپنی خوبی میں اسی نئے روپیہ کی گھڑی سے مقابلہ کرتی ہے۔ ہر موسم میں صحیح وقت بتاتی ہے۔ پرزوں کی مضبوط ہے
قیمت چھ روپیہ (سے)

ایک مستند کاریگر کی ساخت ہونے کے باعث مشین کی نہایت مضبوط وقت کی سچی صورت و سیرت دونوں میں خوبصورت ہے
قیمت پانچ روپیہ (صہ)

یہ پرزوں کا مضبوط وقت کا سچا دیکھنے میں خوبصورت اور بڑے سائز کا ہے ٹھیک وقت پر اپنی دونوں گھنٹیوں کی بلند آواز سے ہمسایوں تک کو بیدار کر دیتا ہے۔ رمضان شریف کیلئے بہت کارآمد چیز ہے قیمت چار روپیہ للعہ

### ڈائمنڈ کٹ چندن ہار

### کیمیکل گولڈن

جسکا رنگ و روپ و چمک دمک اصلی سونے کے مانند ہے دیکھنے میں پانچسو روپیہ کا صحیح اندازہ رکھتا ہے تنہا یا طلائی زیور کے ہمراہ نقلی ثابت نہیں ہوتا وہ بھی چند روز نہیں بلکہ سینکڑوں روپیہ کا کام دیتا ہے اسی لئے مالدار مستورات بکثرت استعمال کرتی ہیں۔
قیمت تین روپیہ (سے)

سلف فلنگ یعنی از خود سیاہی کھینچنے والا گولڈن نب کا فونٹن پن ولایت کی مشہور کمپنی کا تیار کردہ ہے خوشخط و رواں لکھتا ہے کارآمد چیز ہے
قیمت تین روپیہ (سے)

### مزید رعایت

نوٹ (۱) حسب پسند چار قسم کی چار اشیاء طلب کرنے پر مجموعی قیمت نو روپیہ عہ
نوٹ (۲) حسب پسند تین قسم کی تین اشیاء طلب کرنے پر مجموعی قیمت آٹھ روپیہ ہے
نوٹ (۳) ایک یا دو اشیاء کے خریدار کے لئے کوئی رعایت نہیں ہے پوری لیجائے گی

**حبیب واچ ہاؤس ۱۰۲ اجمیری گیٹ دہلی**